انجمن طلبہ قدیم جامعۃ الفلاح کا ترجمان

اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۲ء

حیاتِ نو

خصوصی شمارہ

اساتذہ نمبر

قیمت: -/50 روپئے

مدیر: انیس احمد مدنی

مجلس ادارت:

مشرف حسین صدیقی فلاحی	دہلی
مقبول احمد فلاحی	لکھنؤ
ڈاکٹر عبدالباری فلاحی	دہلی
مولانا محمد اسماعیل فلاحی	جامعۃ الفلاح

فی شمارہ	: اندرون ملک	۳۰؍روپئے
	بیرون ملک	۵؍امریکی ڈالر
سالانہ زرتعاون	: اندرون ملک	۱۲۰؍روپئے
	بیرون ملک	۲۰؍امریکی ڈالر
لائف ممبرشپ	: اندرون ملک	۳۰۰۰؍روپئے
	بیرون ملک	۲۰۰؍امریکی ڈالر

❁ رجسٹرڈ ڈاک سے رسالہ منگانے کی صورت میں رجسٹری خرچ بذمہ خریدار ہوگا۔

❁ مقالہ نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

نمائندے

لندن	:	رضوان احمد فلاحی
دہلی	:	نعیم احمد غازی فلاحی
علی گڑھ	:	ڈاکٹر ضیاء الدین ملک فلاحی
ممبئی	:	حافظ ادہم علی فلاحی
نیپال	:	نذرالحسن فلاحی
یو.اے.ای.	:	خالد حسن رشید فلاحی
قطر	:	محمد اکرم فلاحی
کویت	:	محمد سموئیل فلاحی
سعودی عرب	:	انعام اللہ فلاحی

خط وکتابت کے پتے

❁ برائے ادارتی امور

انیس احمد مدنی، جامعۃ الفلاح، بلریا گنج
اعظم گڑھ (یوپی)

❁ برائے انتظامی امور وترسیل زر

عرفان احمد فلاحی جامعۃ الفلاح، بلریا گنج
اعظم گڑھ (یوپی)-276121
موبائل:+91-9453757380
ای میل:hayatenau123@gmail.com

Composed by: ***Mohd. Abuzar Azmi***
Azamgarh, Mob.: 9580147500

Layout Designing & Title Designing: **sajidkhalil**@gmail.com

Cell:+919999828273

نقوشِ حیاتِ نو

اداریہ

جامعہ کے محسن اساتذہ کرام-اخلاص ووفا کے پیکر	انیس احمد مدنی	۵

باب اول:

جامعہ کے اساسی اساتذہ کرام

ذکرِ جلیلؒ:

مولانا جلیل احسن ندوی	عبدالرب اثری فلاحی	۷
بیاباں کی شب تاریک میں قندیل رہبانی	حفیظ الرحمٰن فلاحی	۴۲
مولانا جلیل احسن ندوی	ادارہ	۵۳
مولانا جلیل احسن ندویؒ ایک مایۂ ناز مفسر	مولانا نعیم الدین اصلاحی	۶۲

ذکرِ شبیرؒ:

مولانا شبیر احمد انور اصلاحی	ڈاکٹر مجاہدالاسلام بختاوری	۷۰
میرے بھیا، میرے محسن، میرے مربی	اقبال احمد اصلاحی	۷۴
ترانہ فلاح	مولانا شبیر احمد انور اصلاحی	۸۲

ذکرِ صغیرؒ:

مولانا صغیر احسن اصلاحی-حیات وخدمات	انیس احمد مدنی	۸۴
مولانا صغیر احسن اصلاحی	انعام اللہ فلاحی	۸۹
مولانا صغیر احسن اصلاحی	غطریف شہباز ندوی	۹۳

ذکرِ شہبازؒ:

مولانا شہباز احمد اصلاحی-حیات وخدمات کے آئینے میں	مولانا اخلاق احمد کریمی	۹۸
مولانا شہباز احمد اصلاحی کی شخصیت-خطوط کے آئینے میں	ادارہ	۱۱۹
پیغام-انجمن طلبہ قدیم کے نام	مولانا شہباز احمد اصلاحی	۱۲۷

ذکرِ ابوبکرؒ:

مولانا ابوبکر اصلاحی	اقرار احمد اصلاحی	۱۲۹
مولانا ابوبکر اصلاحی	مولانا نظام الدین اصلاحی	۱۳۳

باب دوم:

اساتذہ کرام شعبۂ اعلیٰ

مولانا داؤد اکبر اصلاحیؒ	محمد عارف عمری	۱۳۶
مولانا داؤد اکبر اصلاحیؒ	مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی	۱۵۵
مولانا نور محمد فلاحیؒ	آفتاب عالم فلاحی	۱۵۸
لب ہر غنچہ پر نوحہ ہے اس کا	انیس احمد مدنی	۱۶۲
ایک پھول تھا جو سارے گلستاں میں انتخاب	مولانا عبدالبراثری فلاحی	۱۶۴
مولانا عبدالرؤف صاحب قاسمی	مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی	۱۶۷
ماسٹر عبدالحکیم صاحب	ماسٹر سید عبداللہ صاحب	۱۷۱
تذکرہ مناظر الحسن	مجاہد الاحسن	۱۷۵
ماسٹر افضال احمد مشہدی صاحب	مولانا مطیع اللہ فلاحی	۱۷۹
ماسٹر ظفر عالم خاں اعظمی - حیات و خدمات	اعجاز احمد قاسمی	۱۸۲
کسے دل ڈھونڈ رہا ہے	مولانا افتخار الحسن ندوی	۱۸۶
اکرم باروی - ایک عظیم شخصیت	محمد اسماعیل فلاحی	۱۹۱
ماسٹر قاضی زین العابدین صاحب	ادارہ	۱۹۵
ماسٹر محمد ارشد عالم صاحب	عبدالبراثری فلاحی	۱۹۶
ماسٹر مسیحا قادری صاحب	محمد اسماعیل فلاحی	۱۹۹
مولانا محمد ایوب جیراجپوری	مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی	۲۰۱

باب سوم:

اساتذہ کرام شعبۂ ثانوی و ابتدائی

آہ ماسٹر جنید احمد - بچے اداس نازش طفلاں چلا گیا	عبدالبراثری فلاحی	۲۰۳
ماسٹر جنید احمد میرے بڑے بھائی	محمد عارف خاں	۲۰۷
مولانا محبوب عالم - کچھ یادیں، کچھ باتیں	اسرار احمد فلاحی	۲۱۳
ماسٹر عبدالمجید خاں صاحب	جاوید عالم اعظمی	۲۲۱

ماسٹر عبدالقدوس صاحب	حافظ ریاض احمد فلاحی	۲۲۷
ماسٹر ادریس صاحب - جامعہ کے معمار اولیں	انیس احمد مدنی	۲۲۸
میرے استاذ میرے مربی - منشی محبوب خاں صاحب	محمد عمران فلاحی	۲۳۰
ماسٹر محمد ایوب صاحب	امیر فیصل فلاحی	۲۴۱
ماسٹر حبیب احمد صاحب اور ماسٹر نظام الدین - میرے اولین اساتذہ	سعید اختر اعظمی	۲۴۳
ماسٹر ابراہیم احمد صاحب	عبدالرحمٰن اعظمی	۲۴۵
مولوی عبدالباری فلاحی	اسماعیل فلاحی	۲۴۸
مولانا نورالدین صاحب	حافظ ریاض احمد	۲۴۹
مولانا ضیاء اللہ صاحب	ادارہ	۲۴۹
مولوی عبداللطیف صاحب	معین الدین فلاحی	۲۵۰

باب چہارم:

معلمات کلیۃ البنات

محترمہ مشفقہ وقار صاحبہ - کچھ یادیں، کچھ باتیں	ساجدہ فلاحی	۲۵۲
آرزوئیں آج بھی یوں ڈھونڈتی ہیں آپ کو	نصرت رضی فلاحی	۲۵۷
آہ! مشفقہ وقار صاحبہ	نصرت رضی فلاحی	۲۵۹
اپنی مشفق معلّمہ مشفقہ وقار صاحبہ کے انتقال پر ملال پر	آسیہ فلاحی	۲۶۲
محترمہ شبنم خانم صاحبہ	آسیہ فلاحی	۲۶۳
فوزیہ خانم صاحبہ	شائستہ خانم فلاحی	۲۶۶

جامعہ کے محسن اساتذہ کرام

اخلاص ووفا کے پیکر

تعلیم وتدریس انبیائی مشن ہے، نبی اکرم ﷺ کی بعثت کا بنیادی مقصد ہی کتاب وحکمت کی تعلیم دینا تھا۔

هو الذی بعث فی الامیین رسولا منهم یتلو علیهم آیاته و یزکیهم ویعلمهم الکتاب والحکمة وان کانوا من قبل لفی ضلال مبین [وہ اللہ ہی ہے جس نے کتاب وشریعت سے ناواقف لوگوں کے درمیان انہیں میں سے ایک رسول بھیجا جوان کے سامنے آیات الٰہی کی تلاوت کرتا ہے اور ان کے نفوس کی تطہیر کررہا ہے اور کتاب وحکمت کی تعلیم دے رہا ہے۔ درانحالیکہ وہ لوگ اس کی بعثت سے پہلے واضح گمراہی میں مبتلا تھے۔]

ایک حدیث میں آپ ﷺ نے اپنی بعثت کے اس بنیادی ہدف کو واضح کرتے ہوئے فرمایا: بعثت معلما [میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں]

مدارس اسلامیہ اوران سے منسلک اساتذہ کرام بعثت نبوی کے اسی مقصد کے حصول میں لگے ہوئے ہیں، ان کی سعادت وخوش بختی کا اندازہ آپ درج ذیل احادیث سے لگائیں کہ

ان اللہ و ملائکته وأهل السماوات والأرض حتی النملة فی جحرها والحیتان فی البحر یصلّون علی معلّم الناس الخیر (رواہ الترمذی) یقیناً اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے اور آسمانوں اور زمین کے ساکنان، یہاں تک کہ اپنی بلوں میں موجود چیونٹیاں اور سمندر میں موجود مچھلیاں بھی لوگوں کو بھلائی کی بات سکھانے والے کے حق میں دعا گو رہتی ہیں۔

جامعۃ الفلاح کو بام عروج تک پہنچانے اور اسے ایک بین الاقوامی ادارہ بنانے میں جن اساتذہ کرام کا غیر معمولی ایثار، قربانی، یکسوئی اور والہانہ پن شامل رہا ہے۔ ان کا تذکرہ اوران کی

قربانی کا بیان، فارغین جامعہ پر ایک قرض رہا ہے جس کی ادائیگی کی ایک شکل ان کے احوال وکوائف اور اوصاف حسنہ کے بیان پر مشتمل 'حیات نو' کا یہ **"اساتذہ نمبر"** ہے۔

یہ نمبر پیش کرتے ہوئے ہمیں قلبی مسرت ہورہی ہے جس کا بیان لفظوں میں ممکن نہیں کیونکہ یہ محض چند لوگوں کے سوانحی خاکوں پر مشتمل رسالہ نہیں ہے بلکہ وفا واخلاص کی خوشبو، آسائشوں کو قربان کرنے کی تابندہ و درخشاں روایات، طلبہ کی تعلیم وتربیت کے لیے کامل کسوٹی اور والہانہ پن کی کہانیاں آپ کو اس نمبر کے ہر ہر صفحہ پر ملے گی جو تدریسی زندگی میں ہمارے لیے مشعل راہ ثابت ہوں گی اور تعلیم وتدریس کی راہ میں حائل بے شمار رکاوٹوں کے ازالہ اور پریشانیوں کے خاتمہ میں معاون ومددگار رہوں گی۔ تعلیم سے طلبہ کی بے رغبتی اور اس کے حصول میں ان کی سستی وکاہلی کا ازالہ کیسے کیا جائے، اس کا بھرپور نسخہ شفاء آپ کو ان صفحات میں ملے گا۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمارے اساتذہ کرام کی ان عظیم قربانیوں کو شرف قبولیت بخشے ان کے ذکر کو دوام عطا فرمائے اور ان کی تعریف وثنا کو عام کردے اور ہمیں ان کی تدریسی زندگی سے سبق لینے اور امت کے نونہالوں کی تعلیم وتربیت جیسے اہم، مقدس اور دینی وملی فریضہ کو انجام دینے کے لیے بہت سی آسائشوں کو قربان کردینے کا جذبہ عطا فرمائے۔

☆☆☆

حکیم و عارف و صوفی تمام مستِ ظہور
کسے خبر کہ تجلّی ہے عین مستوری
وہ ملتفت ہوں تو کنجِ قفس بھی آزادی
نہ ہوں تو صحنِ چمن بھی مقامِ مجبوری
برا نہ مان، ذرا آزما کے دیکھ اسے
فرنگ دل کی خرابی، خرد کی معموری
علامہ اقبال

مولانا جلیل احسن اصلاحیؒ

عبدالرب اثری فلاحی☆

نام

جلیل احسن بن علیم اللہ بن امیر علی

کنیت

ابوسعید اور ایام شباب میں روح عصری کے نام سے بھی علمی، ادبی اور تنقیدی مضامین لکھتے تھے۔

ولادت

مولانا کی ولادت باسعادت مردم خیز ضلع اعظم گڑھ یوپی سے پچیس کلومیٹر شمال اور بلریا گنج سے قریب ایک گاؤں کرمینی میں ہوئی۔ مختلف دستاویز، اسکول کے رجسٹر داخلہ اور پاسپورٹ پر آپ کی تاریخ پیدائش ۲۵؍جنوری ۱۹۱۴ء درج ہے، لیکن آپؒ نے خود اپنی ڈائری میں ۲۵؍جنوری ۱۹۱۳ء تحریر کیا ہے اور اسی کو صحیح قرار دیا ہے۔

آپ کا تعلق اس علاقہ کی ایک مشہور اور معزز برادری روتارا کے ایک انتہائی غریب گھرانے سے تھا۔ یہ خاندان راجستھان سے آکر فیض آباد پھر وہاں سے محمد پور صدر کے علاقے میں اور بعد کو آبادی کے اضافے کے ساتھ ساتھ تقریباً پورے شمالی اعظم گڑھ میں پھیل گیا۔ بعد میں شیخ برادری سے مشہور ہوگئے۔ روتارا سے شیخ کیسے ہوئے نہیں معلوم۔ غالب گمان یہ ہے کہ روتارا راجپوت یا چھتری برادری کی کوئی شاخ رہی ہوگی۔ قبول اسلام کے بعد کچھ دنوں تک روتارا پھر بعد کو اپنے ہم پلہ مسلم برادری کا ٹائیٹل اختیار کرلیا ہوگا کیونکہ ذات برادری کے سسٹم میں راجپوتوں یا چھتریوں کا وہی مقام ہے جو بگڑے ہوئے مسلم معاشرے میں شیخوں یا صدیقیوں کا ہے۔ اگر یہ قیاس صحیح ہے تو اس سے ہندوستانی معاشرے اور اس میں پائی جارہی ذات برادری کی ایک دلچسپ نوعیت اور صورتِ حال کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، بہرحال برسبیل تذکرہ یہ بات آگئی ورنہ مولانا اس

☆ہریانہ

سے بہت بلند تھے۔

والدین

آپ کے والد علیم اللہ ابن امیر علی مرحوم بالکل ناخواندہ تھے۔ شروع میں زمین داروں کے گھر چند ٹکوں کی نوکری کرکے پیٹ پالتے رہے۔ ان کی پیشانی دیکھ کر ان کے ایک کرم فرما ان کو لے کر کلکتہ گئے اور وہاں ایک جوٹ مل میں ملازمت کرنے لگے۔ وہ صوم وصلاۃ کے پابند تھے۔ داڑھی اتنی گھنی تھی کہ پانی کے قطرے پھنس کر رہ جاتے اور بغیر بالوں کو ہلائے نہیں گرتے۔ ان کے متعلق ہم عمر رفقاء اور بزرگ لوگ اس پر متفق ہیں کہ وہ لڑتے جھگڑتے نہیں دیکھے گئے۔ وہ بہت کم گو تھے، مولانا جب اول یا دوم میں تھے کہ گاؤں طاعون کی زد میں آگیا اور اسی طاعون میں والد صاحب نے وفات پائی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

آپ کی والدہ کا نام مسلمہ خاتون تھا، ان کی تعلیم صرف قاعدہ بغدادی سے لے کر الم ترکیف تک تھی۔ جس کا انہیں ہمیشہ قلق رہا۔ البتہ وہ اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کو ہمیشہ پڑھنے کی تلقین کرتی رہتیں اور اپنے کو بطور عبرت پیش کرتیں لیکن سوائے مولانا کے کسی نے پڑھ کر نہ دیا۔

صبح کے وقت جب مولانا مرحوم تلاوت فرمارہے ہوتے تو وہ بھی قریب آکر بیٹھ جاتیں، ان کی نظریں قرآن کی سطروں پر ہوتیں اور مولانا کو اکثر حکم دیتیں کہ سطروں پر انگلی رکھ کر پڑھو اور مولانا کی انگلی کی گردش کے ساتھ ساتھ ان کی بھی انگلی گردش کرتی، ایک دن مولانا نے دیکھا کہ ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں بہت اصرار کے بعد رونے کا سبب بتایا کہ اپنی محرومی پر رونا آتا ہے کہ میں نہیں پڑھ سکی، اس کا اس ننھی سی جان پر بے حد اثر پڑا اور اس نے ان کو قرآنی تعلیم کے حصول پر اکسایا بھی۔

جب مولانا کے والد محترم کا انتقال ہوگیا تو رشتہ داروں نے ان کی والدہ سے درخواست کی کہ دوسری شادی کرلیں لیکن اپنی تینوں اولاد کے پیش نظر اس سے مسلسل انکار کرتی رہیں بالآخر لوگوں کے اصرار پر ہتھیار ڈالنا پڑا اور دوسری شادی سرائے میر سے متصل گاؤں ''طویٰ'' کے جناب اسماعیل مرحوم سے ہوئی لیکن ان کی زندگی نے وفا نہ کی اور ان کو دوبارہ بیوگی کے جاں گسل داغ سے واسطہ پڑا اسی گاؤں کے ایک بزرگ نے پیش کش کی تو اپنے بچوں کے مستقبل کو دیکھتے ہوئے ان کے سامنے یہ شرط رکھی کہ اگر آپ اپنی پوری جائداد میرے بچوں کے نام کردیں تو میں آپ سے شادی کرسکتی ہوں۔ انہوں نے بلا مضائقہ اس شرط کو تسلیم کرلیا، چنانچہ تیسری شادی محترم عباس مرحوم صاحب سے

ہوئی، تقریباً ۱۹۴۰ء میں دارفانی سے کوچ فرما گئیں۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

آپؒ تین بھائی بہن تھے، سب سے بڑی عجب النساء صاحبہ مرحومہ تھیں، جن کی شادی کرمینی کے فوجدار علی سے ہوئی تھی، پھر آپ تھے اور سب سے چھوٹے بھائی جلال الدین ہیں جو کہ ناخواندہ ہیں۔ یہ آپ کے لیے مستقل پریشانی کا باعث رہے حتیٰ کہ تعلیم حاصل کرنے پر سخت وست رویہ اپناتے اور تعلیمی اخراجات دینے پر پابندی عائد کردی تھی۔ مولانا کو اذیت دینے والوں میں سب سے آگے یہی رہے۔

بچپن

عام طور سے بچپن کو دلفریبیوں کا نام دیا جاتا ہے لیکن مولانا کا بچپن اس کے برعکس تھا، چار سال کی ننھی سی عمر میں فالج کا حملہ ہوا اور بالکل مفلوج ہو کر رہ گئے، مشیت ایزدی کچھ اور تھی جس کی وجہ سے آنکھ اور ذہنی قوت محفوظ رہی۔ اس فالج کے نتیجے میں ہر طرح سے لاچار و مجبور اور بے بس ہو کر رہ گئے۔ بچپن کی عقلی سطح پر کیا کچھ بیت رہا تھا، اس کو اکثر اس طرح بیان فرماتے کہ ''اللہ میاں نے مجھے اس درجہ عاجز و درماندہ کیوں بنادیا؟ میں نے ان کا کیا بگاڑا تھا؟ اگر یہی کرنا تھا تو شروع سے ایسا کیوں نہ کیا، دے کر کاہے کو چھینا؟ اب میں دنیا میں جی کر کیا کروں گا، مجھے تو کسی لائق نہیں چھوڑا۔'' (ذکریٰ ۱۹۷۳ء)

در حیرتم کہ دہقاں بہ چہ کارکشت مارا
نہ شجر سایہ دارم نہ گیاہ سبزہ زارم

اس شعر میں جن جذبات کی ترجمانی کی گئی ہے ایسے ہی جذبات مولانا پر تقریباً ہر وقت طاری رہتے تھے، پر دھیرے دھیرے یہ اثر زائل ہو گیا اور زندگی معمول کے مطابق گزرنے لگی لیکن بعد کے حالات نے ثابت کردیا کہ یہ زحمت جاں گسل رحمت و نعمت ثابت ہوئی۔ رب علیم و خبیر اور رحمٰن خدا نے بڑا احسان فرمایا کہ اگر ایسا نہ ہوتا تو لازماً گھریلو ماحول کے زیر اثر رہ کر کسان یا مزدور بننے کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا، لیکن اسی بیماری نے مولانا کو ذرے سے آفتاب بنادیا اور اسی کی بدولت آپ کو لکھنا پڑھنا آیا۔ اردو فارسی سیکھی، قرآن مجید حفظ کرنے کی سعادت نصیب ہوئی، کتاب وسنت کو براہِ راست عربی زبان میں پڑھنے اور پڑھانے کا شرفِ عظیم حاصل ہوا۔ اس طرح خدا نے ایسی لطیف تدبیر اپنائی کہ کوئی ان کو یہ کہنے کے سلسلے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ مزدوری یا کاشتکاری کرو۔ سوائے اس کے کوئی چارۂ کار نہیں رہ گیا تھا کہ کچھ پڑھیں لکھیں اور زمانے کے مطابق کہیں پر منشی وغیرہ بن کر پیٹ پالیں۔ ان ربی لطیف لما یشاء (سورہ یوسف: ۱۰۰)

تعلیم

قرآن پڑھنے کے بعد گاؤں کے مکتب میں داخل کیے گئے، جہاں آپ مشفق استاد جناب ریاست علیؒ سے درس لینے لگے۔ انہوں نے ہی آپ کو از اول تا آخر قلم پکڑنا سکھایا۔ دریں اثناء والد محترم کا طاعون کی زد میں آکر انتقال ہو گیا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون، اور اس طرح غربت کے ساتھ یتیمی کی مصیبت آئی لیکن اس جاں گسل مصیبت و یتیمی کے باوجود تعلیمی سلسلہ جاری رہا۔ رفقاء کی ہمدردیاں ساتھ تھیں، ان کی مجبوری کا سب کو احساس تھا، خود اساتذہ ان کی ممتاز و منفرد حیثیت کی وجہ سے تعاون اور خصوصی توجہ دیتے رہے۔ اس طرح گاؤں کے مکتب میں درجہ دوم تک تعلیم حاصل کی اور قریب کے دوسرے گاؤں سے پرائمری درجہ تین و چار پاس کیا پھر مڈل اسکول بلریا گنج میں تعلیم حاصل کرنے لگے، جہاں اس وقت تحریک اسلامی کے صف اول کے قائد مولانا صدرالدین اصلاحی اور جامعۃ الفلاح کے سابق استاد مولوی محمد ادریس صاحب مرحوم بھی زیر تعلیم تھے، لگن کا یہ عالم تھا کہ معذوری کے باوجود دس کلومیٹر روزانہ پیدل چل کر آتے اور دس کلومیٹر پیدل چل کر واپس جاتے تھے۔ اسی دوران والدہ کے طویٰ منتقل ہو جانے کی وجہ سے کچھ دنوں تک تو کرمینی کی ایک محترمہ خیرالنساء صاحبہ پرورش و پرداخت کرتی رہیں لیکن جب طویٰ میں کچھ ماحول سازگار ہوا تو مولانا بھی طویٰ منتقل ہو گئے اور وہاں سے قریب اس وقت کے مایہ ناز علمی و تربیتی مرکز مدرسۃ الاصلاح میں تعلیم حاصل کرنے لگے لیکن معاشی مقاصد کے پیش نظر لوٹ کر پھر بلریا گنج مڈل اسکول میں داخلہ لیا اور تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا۔ جس وقت مولانا مڈل اسکول میں تعلیم حاصل کر رہے تھے، ان کے گھر والوں کے سامنے اس کے سوا کچھ اور مقصد نہیں تھا کہ کسی طرح مڈل پاس کرلیں اور کچہری کے کسی گوشہ میں بیٹھ کر اپنی دال روٹی بھر کما لیا کریں اور اس وقت خود مولانا بھی اسی کو اپنی معراج سمجھتے تھے۔ دوسرے لوگ بھی مولانا کے حالات کے پیش نظر اتنا ہی کچھ سوچ سکتے تھے لیکن قدرت کچھ اور ہی چاہتی تھی، اسے منظور نہیں تھا کہ اس کا بندۂ مجبور و یتیم کچہری میں اپنا آشیانہ بنائے، وہ کیا کرنا چاہتا تھا اسے کوئی کیسے جان سکتا ہے......اس کا مخفی ہاتھ پردے کے پیچھے کوئی دوسرا نقشہ بنا رہا تھا، وہ اس پٹری سے ہٹا کر دوسری بہتر پٹری پر چلانا چاہتا تھا۔ کہاں مڈل کی تعلیم پارہے تھے اور کہاں مدرسوں کی خاک نے اس گھر کی لاج رکھ لی اور ذرے سے آفتاب بنادیا۔ ہوا یہ تھا کہ مئی جون کا مہینہ تھا سنیچر کے دن بارہ بجے اسکول کی چھٹی ہوئی اور حسب معمول مولانا اپنے گھر کی طرف روانہ ہوئے۔ اس زمانہ میں چوک کے بعد ایک بہت بڑا باغ تھا جب کچھ دور چلے اور باغ کے محاذ میں پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ

سڑک سے کچھ ہٹ کر پختہ کوئیں پر ایک نہایت گوراچٹا سفید ریش دیہاتی آدمی نیا لباس (دھوتی، نیم آستین اور نیا چھالٹین کا کُچھہ) پہنے اکڑوں بیٹھا ہے۔ اس نے اشارہ سے مولانا کو بلایا، مولانا پہلے جھجھکے اور سہمے کہ کہیں وہ لباس اتروا کر کنویں میں نہ پھینک دے لیکن مولانا پھر بھی رک رک کے اس کے پاس گئے۔ اس نے اپنا رومال جلتی ہوئی جگت پر بچھا دیا اور نہایت محبت بھرے لہجے میں بیٹھنے کو کہا تب مولانا کی جان میں جان آئی اور وہ اس کے اصرار پر رومال پر بیٹھ گئے۔ اس نے پوچھا کہ کہاں سے آرہے ہو تو مولانا نے بتایا کہ ''اسی مڈل اسکول سے آرہا ہوں۔'' اسکول سامنے نظر آرہا تھا، پھر اس نے پوچھا کہ اس بستہ میں کیا ہے؟ مولانا نے کتابوں کا نام بتایا۔ اسکول اور کتاب کا نام سنتے ہی اس کے چہرے پر شدید نفرت کے آثار ظاہر ہوئے اور اپنی دیہاتی زبان میں بولا کہ ''اے پڑھنپاری پڑھے سے تہرا کوئی پھائدانا ہوئی او پڑھنپاری پڑھ جے سے کران سریپ کا مانا متلب سمجھ میں آوت ہے۔'' (اس تعلیم سے تمہیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا، پڑھنا ہو تو وہ پڑھائی پڑھو جس سے قرآن شریف کا معنی مطلب سمجھ میں آتا ہو) پھر دیر تک اسی موضوع پر بولتا رہا، جب اس کی بات مولانا کے دل میں اتر تی چلی گئی تو اس سے استفسار کیا کہ ''اس کے لیے کیا پڑھوں اور کہاں جاؤں؟'' اس نے بتایا کہ ٹانڈہ چلے جاؤ، پہلے قرآن حفظ کرو، پھر فارسی پڑھو اور اس کے بعد عربی شروع کرو۔ تب قرآن کے معنی سمجھ میں آئیں گے۔ یہ کہہ کر وہ سڑک پکڑ کر جنوب کی سمت میں چلا گیا اور مولانا گھر روانہ ہوگئے۔

اس شخص نے اپنی آتشیں تقریر کے ذریعہ مولانا کے تمام پچھلے معاشی تصورات کو پھونک دیا تھا۔ اب ایک ہی دھن سوار تھی کہ کسی طرح ٹانڈہ پہنچیں اور قرآن کے معنی جاننے کی راہ اختیار کریں۔ وہ شدید ذہنی کشمکش میں رہنے لگے، پرانی راہ چھوڑ کر بالکل ایک نئی راہ اپنانا بہت مشکل تھا۔ بالآخر ایک طویل ذہنی ہلچل کا خاتمہ ہوا اور مڈل اسکول کی تعلیم ترک کردی۔ اسے ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ دیا۔ یہ کرنا تھا کہ بستی کے ہر شخص کی ملامتوں کا نشانہ بن گئے، ''اب یہ مکھی مارے گا، اب یہ بھیک مانگے گا۔''

لیکن مولانا پر اس کا مطلق اثر نہ ہوا۔ اس لیے کہ مرشد نے اپنی تقریر کے دوران یہ بات کہہ دی تھی کہ ''روٹی کی فکر نہ کرنا، روٹی ملے گی جس نے منہ چیرا ہے وہ آہار بھی دے گا، وہ اپنی راہ پر چلنے والوں کو بھوکا نہیں مارتا، چنانچہ آئندہ کی زندگی بتاتی ہے کہ مولانا کو اس طرح کی پریشانیوں کا احساس تک نہ ہوا۔ ('حیات نو' اگست ۱۹۷۹ء ص ۱۳، ذکریٰ دسمبر ۱۹۷۳ء ص ۱۹-۲۰) گھر میں اپنی

والدہ کو بمشکل تمام راضی کر کے ٹانڈہ کے سفر پر روانہ ہوگئے۔ والد صاحب کے انتقال کی وجہ سے گھر کی معاشی حالت نہایت ابتر تھی، لیکن پھر بھی ہمت کر کے توکل علی اللہ کے سہارے دینی تعلیم کے حصول میں منہمک ہوگئے۔ ٹانڈہ پہنچ کر ''کنز العلوم'' میں داخلہ لیا اور حسب پروگرام پہلے قرآن شریف حفظ کرنا شروع کیا۔ رات دن محنت کرتے اور یہ مولانا کی رات و دن کی محنت شاقہ کا نتیجہ تھا کہ ایک سال میں بیس پارے اور پندرہ ماہ میں پورا قرآن یاد کرلیا۔ اس کے بعد فارسی سیکھنے کی طرف راغب ہوئے اور اپنی مجنونانہ محنت سے تین سال کی فارسی ایک سال میں پڑھ لی۔ اس کے بعد عربی کا نمبر آیا۔ اس زمانے کی روداد بیان کرتے ہوئے مولانا مرحوم و مغفور فرماتے ہیں ''میں نے جس دن عربی شروع کی وہ دن میری زندگی کا سب سے پرمسرت و پرکیف دن تھا۔ میں خوشی سے پھولا نہ سماتا تھا، اس طرح میں عربی پڑھنے لگا لیکن درجے کے ساتھی خوش حال گھرانے سے تعلق رکھتے تھے، اس لیے وہ پڑھائی کی طرف سے بے توجہی برتتے، ہر وقت کھیل میں مصروف رہتے، جو کام دیا جاتا اس کو نہ کرتے، کوئی چیز یاد کرنے کے لیے دی جاتی تو یاد نہ کرتے۔ پڑھائی کی رفتار نہایت سست اور مایوس کن تھی۔ میں اس حالت سے پریشان رہتا۔ ایک دن میں نے اپنے استاد سے رو رو کر یہ کہا ''سبق بہت کم ہو پاتا ہے، یہ کھلاڑی لوگ ہیں۔ میں پڑھنے کی خاطر تمام مشقتیں جھیل کر اپنا وطن چھوڑ کر آیا ہوں۔ میں ان کے ساتھ کس طرح چل سکوں گا۔'' استاد محترم نے میرے اس وفور شوق کو دیکھ کر مجھے خالی اوقات میں پڑھانا شروع کر دیا۔ اب میں اور زیادہ محنت کرنے لگا لیکن اس کے بعد تعلیم کی رفتار بتدریج کم ہوتی چلی گئی۔'' (حیاتِ نو' ماہ اگست ۱۹۷۹ء)

تعلیم کی رفتار میں کمی کی وجہ دراصل معاشی تنگی اور حد سے زیادہ محنت تھی، والدہ بمشکل کچھ بچا کر آپ کو بھیجتی تھیں۔ اس رقم کے سلسلے میں بھی عام طور سے یہ ہوتا تھا کہ والدہ کسی کو آپ کے پاس بھیجنے کے لیے دیتی تھیں لیکن اکثر و بیشتر وہ رقم خود رکھ لیتے اور کہتے کہ میں نے یہ رقم جلیل کو بذریعہ ڈاک بھیج دی ہے، حالانکہ مولانا کو خبر تک نہ ہوتی۔ بے سروسامانی کا عالم تھا دوسرے اہل خانہ تو ان کی اس تعلیم کے حصول کو ناپسند کرنے کی وجہ سے کسی طرح کی اعانت نہیں کرتے تھے۔ مدرسہ سے بھی دن بھر میں صرف ایک وقت کا کھانا اس وقت کے عام رواج کے مطابق ملتا تھا جو کہ بہرحال ناکافی ہوتا تھا اور مجبوراً اسی پر مولانا کو قناعت کرنا پڑتی لیکن اس کے باوجود بڑی وضع داری سے اس کو نبھایا۔ معذوری کے باوجود حد سے بڑھی محنت نے ان کی صحت پر برا اثر ڈالا اور نحیف و ناتواں ہو کر رہ گئے حتی کہ حصول علم کی خاطر اپنے کو گھلا کر رکھ دیا۔

آپ نے اتنا کچھ سیراب ہونے کے بعد بھی قناعت کی راہ اختیار نہیں کی بلکہ داخلی اضطراب اور ذوق و تجسس نے مجبور کیا کہ علم کی وسعتوں اور اس کی پنہائیوں کا سراغ لگائیں۔ سیماب وش فطرت کو ٹانڈہ کی آب و ہوا اور ''کنز العلوم'' کے محدود وسائل آسودہ کر بھی نہیں سکتے تھے، مزید تشنگیٔ علم کو بجھانے کے لیے مشہور جامعہ ''جامعہ اسلامیہ'' (سورت) ڈابھیل کا رخ کیا جہاں کہ اس وقت کے بہتیرے ارباب علم و کمال دار العلوم دیو بند کے اہتمام سے جزوی اختلاف کی وجہ سے ٹوٹ ٹوٹ کر مہ وانجم کی کہکشائیں آباد کیے ہوئے تھے۔ جب یہ اساتذہ پھر دار العلوم دیو بند واپس آئے تو مولانا بھی ۱۹۲۳ء میں دار العلوم دیو بند منتقل ہو گئے لیکن مولانا کو افسوس ہوا کہ صحیح بخاری کا درس محدث کبیر حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ سے نہیں لے سکے، کیونکہ جس دن مولانا دیو بند پہنچے شاہ صاحب کا جنازہ اٹھ رہا تھا، وہ صرف شکل دیکھ سکے۔ لیکن پھر اس وقت کے موجود علمائے کبار سے پورے انہماک سے درس لینا شروع کر دیا۔ مولانا اعزاز علیؒ اور مولانا شبیر احمد عثمانیؒ سے خاص ارادت رہی اور ان سے بالترتیب ادب و حدیث کا خصوصی درس بھی لیا۔ مولانا کی لگن دیکھتے ہوئے وہ لوگ خصوصی توجہ والتفات بھی فرماتے رہے۔ یہاں کے اساتذہ کے علم واخلاص، وسعتِ نظر، جوش عمل اور علوم وافکار سے خوب خوب استفادہ کے بعد وہ ادبی بیج جو دل میں گھر کر چکا تھا اور عربی ادب وانشاء سے جو خاص لگاؤ اور تعلق پیدا ہو گیا تھا اس ذوق و تجسس کی مزید آبیاری کے لیے نیز درس نظامی میں عربی ادب کے سلسلے میں جو خامی اور کمزوری پائی جاتی ہے اس کو محسوس کرتے ہوئے اس کمی کو دور کرنے کی غرض سے عالم اسلام کی ممتاز درسگاہ دار العلوم ندوۃ العلماء کا رخ کیا اور مولانا ناظمؒ اور مولانا عبد الرحمٰن کاشغریؒ جیسے اساتذہ ادب وانشاء سے کسبِ فیض کیا اور علمی پیاس بجھائی۔ ان علوم و افکار کی کہکشاؤں سے مستفیض ہوئے جن سے کہ ایک عالم استفادہ کر رہا تھا۔ آپ نے علم وادب اور ندوۃ کی ثقافتی سرگرمیوں میں بھر پور حصہ لیا اور ایک ممتاز فارغ التحصیل ندوی کی حیثیت سے اپنی شناخت پیدا کی۔

تعجب ہوتا ہے کہ اپنوں کے پریشان کرنے اور معاشی پریشانی کے باوجود نہایت یکسوئی کے ساتھ تعلیم کے حصول کے لیے کوشاں رہے اور اخیر تک معاشی مستقبل کے لیے پریشان نہ ہوئے جبکہ دینی تعلیم حاصل کرنے والے نوجوانوں کو یہی سوال ہمیشہ پریشان کیے رکھتا ہے۔

معاش اور تدریس

۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانوں پر جو کچھ بیتی ہے وہ بڑی المناک کہانی ہے۔ تحریک حریت کی

ناکامی کے بعد مسلمانوں کے اجتماعی اداروں خصوصاً مدارس اور علماء پر جیسی کچھ افتاد پڑی ہے اس کے اظہار کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ ہر شخص اس سے بخوبی واقف ہے۔ اسلامی نظام میں علماء قائد ورہنما کی حیثیت رکھتے ہیں، غیر اسلامی اور بے رحم تمدن میں ان کی حیثیت بہتر نہیں ہو سکتی۔ مولانا بھی اسی عہد زوال کی پیداوار تھے۔ مولانا کے ساتھ ایک اجنبی تہذیب نے ہی ستم نہیں کیا بلکہ اپنوں نے بھی بڑے مظالم ڈھائے لیکن تعجب ہے کہ مولانا زمانہ طالب علمی میں معاشی مستقبل کے سوال پر کبھی پریشان نہیں ہوئے جبکہ عام طور پر دینی تعلیم حاصل کرنے والے نوجوانوں کو سب سے زیادہ یہی سوال پریشان رکھتا ہے اور یکسو نہیں ہونے دیتا، صرف ایک مرتبہ درس بخاری کے درمیان یہ وسوسہ دل میں اتر گیا کہ اب اس کے بعد کیا کرنا ہے۔ پیٹ کا کیا بندوبست ہوگا۔ برابر یہ سوال ابھرتا رہا اور شدت وقوت کے ساتھ ابھرتا رہا، جذبہ دروں نے اکسایا بھی کہ کیوں نہ طب کر لیں؟ یہ لائن باوقار بھی ہوتی ہے اور بالانشیں بھی، لیکن مولانا کا ضمیر پکار اٹھا کہ ''نہیں'' آپ براہ راست دینی خدمت کی راہوں میں سے کسی راہ پر لگیں، کشمکش جب حد سے بڑھی تو مولانا نے اپنے شیخ، شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے سامنے اپنا مسئلہ رکھا۔ انھوں نے استخارہ کا مشورہ دیا۔ اس کی ترکیب بھی بتائی۔ سلف صالحین کے اور اپنے تجربے بھی سنائے۔ چنانچہ اس پر آپ نے عمل کیا۔ تیسرے دن مولانا نے خواب دیکھا کہ ایک سفید ریش بزرگ ایک کتاب ہاتھ میں لیے ہوئے ہیں۔ مولانا نے ان سے کتاب مانگی۔ انھوں نے بڑھا دی جب مولانا نے کتاب کھولی تو بہت موٹے حرفوں میں لکھی ہوئی یہ عبارت صفحہ کی پہلی سطر میں نظر کے سامنے آئی:

''لاینبغی لعالم الدین أن یشتغل بالتجارة أو الزراعة أو الحیاکة فان هذا ضیاع العلم'' عالم دین کے لیے مناسب نہیں ہے کہ وہ اپنا وقت تجارت، زراعت یا بنائی کے کاموں میں لگائے کیونکہ یہ علم کا ضیاع ہے۔

عبارت پر نظر پڑتے ہی مولانا کی نیند کھل گئی اور حال یہ تھا کہ ذہن بالکل یکسو ہو چکا تھا، طب کا خیال زائل ہو چکا تھا، مولانا کی خوشی کی انتہا نہ رہی اور پھر تعلیم و تعلم کے پیشے سے اپنے کو منسلک کرنے کی ٹھان لی، تاحیات اسی راہ پر گامزن رہے۔

ندوۃ العلماء سے فراغت کے بعد آپ کے بعض اساتذہ کی خواہش تھی کہ آپ مدنیہ بجنور یا ندوہ کے کسی عربی ترجمان میں کام کریں لیکن یہ پیشہ آپ کی طبیعت سے میل نہیں کھا رہا تھا اور رجحان تعلیم و تدریس کی طرف تھا۔ نتیجتاً مولانا ناظم ندویؒ کی کوششوں سے مدرسہ اشاعت العلوم

بریلی آکر مدرس ہوگئے۔ یہاں پر آپ عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھاتے تھے اور ادب وانشاء کے کچھ گھنٹے لیتے تھے۔

(۱) مدیر مجلّہ ''الایمان'' دیوبند، نومبر ۱۹۸۱ء ص ۳۸ پر رقم طراز ہیں کہ ''مولانا شاید ندوی ایک ہفتہ کے لیے بھی نہیں تھے کیونکہ مولانا جب دیوبند سے ندوہ صرف ادب کی تعلیم کے لیے آئے تو معلوم ہوا کہ یہاں ادب کے طالب علم کی حیثیت سے داخلہ کا اس وقت کوئی قانون نہیں تھا۔ مستقل کوشش کے باوجود ناکام رہے تو یہ شکل نکلی کہ مدرس ہوکر استفادہ کریں لیکن مولانا آمادہ نہ ہوئے تو پھر ایک استاذ کی سفارش پر مدرسہ ''اشاعت العلوم'' بریلی چلے گئے۔ ۱۹۷۵ء میں جب ندوہ کا پچاسی سالہ جشن منایا جارہا تھا تو مولانا علی میاں نے مولانا کو بھی دعوت دی اور اس میں یہ لکھا کہ ''ہماری اور آپ کی ندویت یکساں ہے یعنی تعلیم تو حاصل نہیں کی لیکن ندوی کہلا رہے ہیں۔''

مولانا اپنے نام کے ساتھ جیسا کہ ان کا بیان ہے ندوی نہیں لکھتے تھے مگر وہاں کے کچھ اہل علم جن کا تعلق سہارنپور دیوبند سے تھا ندوہ کا نام کسی قدر تحقیر سے لیتے تھے اور جب مولانا کے متعلق دریافت کیا جاتا کہ کہاں کے پڑھے ہوئے ہیں تو بھی کسی قدر تخفیف کے انداز میں کہا جاتا کہ ندوہ میں پڑھا ہے۔ اس کے بعد مولانا مستقل طور پر ندوی لکھنے لگے اور اس نسبت کے ساتھ مقبولیت بڑھتی گئی۔ اسی زمانہ میں چونکہ جماعت کے رکن ہوچکے تھے اور جماعت نے اپنے لٹریچر کو اردو سے عربی میں منتقل کرنے کے لیے ''دارالعروبہ'' کے نام سے ایک شعبہ قائم کرلیا تھا۔ چنانچہ مولانا بھی اس ادارے کے ایک رکن متعین کیے گئے لیکن مولانا سب کام یہیں رہ کر کرنا چاہتے تھے۔ پر مولانا مودودیؒ نے مولانا کو خط لکھا کہ ایک نہری انجینئر جو کہ جماعت کے ہمدرد ہیں وہ عربی سیکھنا چاہتے ہیں کیا آپ آسکتے ہیں؟ مولانا نے حامی بھرلی اور دارالسلام (مرکز جماعت اسلامی) پہنچ گئے۔ وہاں پر رہ کر چند کتابوں کا ترجمہ بھی کیا خاص کر ''قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں'' جو کہ ایک انقلابی کتاب ہے، کا ترجمہ آپ ہی نے کیا تھا پھر جماعت کی درسگاہ سے منسلک طلبہ، انجینئر صاحب، پروفیسر غفور احمد صاحب، ڈاکٹر خورشید احمد صاحب وغیرہ نے آپ سے خوب خوب کسب فیض کیا اور آپ نے خود مولانا امین احسن اصلاحی صاحب سے جو کہ اسی دوران غالباً ۱۹۴۴ء میں پاکستان گئے تھے استفادہ کیا۔ لیکن وہاں کی آب و ہوا راس نہیں آئی اور صرف ڈیڑھ دو سال کے قلیل وقفے کے بعد وہاں سے لوٹ کر بریلی ہی کی ایک دوسری مایہ ناز درسگاہ ''مصباح العلوم'' میں آگئے۔ یہ وہ اہم مدرسہ ہے جس میں مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری بھی رہے، مولانا اشرف علی صاحب بھی رہے

اور دیگر بڑے بڑے اکابرین بھی رہے۔ مولانا اس ادارے میں اس وقت کے صدر مدرس اور مشہور محدث مولانا عبدالقیومؒ اور دوسرے مولانا عبدالحفیظ بلیاویؒ کی تحریض وتشویق پر آئے تھے۔ مولانا یہاں عربی ادب کی ابتدائی کتابیں پڑھاتے تھے۔ انشاء کراتے اور قرآن کا ترجمہ وتفسیر بھی پڑھاتے تھے۔ عصر کی نماز کے بعد مولانا بریلی کے ٹاؤن ہال، موتی پارک میں ٹہلنے جاتے، یہاں پر بھی طلبہ آپ کو گھیرے ہوتے تھے۔ مولانا دیوبندی طرز فکر کے مدرسے میں استاذ تھے مگر موتی پارک میں بریلوی طرز فکر کے طلبہ جمع ہوتے اور ادب وانشاء سیکھتے کھل کر ہر موضوع پر تبادلہ خیال کرتے اور عام درس نظامیہ سے مختلف پاکر مزید گرویدہ ہوتے جاتے، نام آتا تو سراپا ادب واحترام بن جاتے۔

مدرسہ ''مصباح العلوم'' کی خستہ حالی کے بعد مولانا سرائمیر آگئے اور یہاں کے ممتاز علمی و تربیتی مرکز ''مدرسۃ الاصلاح'' میں مدرس ہوگئے۔ یہاں آئے تو استاد بن کر لیکن خالی گھنٹیوں میں وہ طالب علموں کے ساتھ مولانا اختر احسن اصلاحیؒ کے درجے میں بیٹھتے اور نہایت انکساری کے ساتھ مولانا سے قرآن پڑھتے، آپ کو یہاں صرف کی کتاب پڑھانے کو ملی جو کہ درس نظامیہ کے طریق سے یکسر مختلف تھی لیکن اس کو نہایت محنت اور خوش اسلوبی سے نبھایا۔ اسی طرح قرآن کا سبق پڑھانے کے لیے عربی سوم کا کورس طلب کیا لیکن مولانا اختر احسن اصلاحیؒ کے یقین دلانے کے بعد کہ وہ مدد کریں گے، اونچے درجات میں قرآن پڑھانے لگے۔ شروع میں بہت پریشان ہوئے اور مولانا مرحوم بھی معاملے کو طول دیتے رہے لیکن جب دیکھا کہ واقعی لگن اور شوق ہے تو پھر رہنمائی بھی کی اور مستفید بھی کیا۔ استفادے کے اس موقع نے مولانا کو واقعی قرآن کا طالب بنادیا۔ ان کو قابل رشک حد تک قرآن سے عشق ہوگیا اور قرآن پر غور وفکر ان کا محبوب مشغلہ بن گیا۔

پھر جب جماعت اسلامی ہند نے عصری تعلیم یافتہ افراد کے لیے خصوصی کلاسز کا اہتمام کیا اور درسگاہ اسلامی میں ثانوی درسگاہ کے نام سے ایک الگ شعبہ ونصاب تیار کیا۔ پورے ملک سے منفرد افراد جو کہ اس میں دلچسپی رکھتے تھے، وہاں اس خصوصی نصاب کی تکمیل کے لیے آنے لگے۔ جس میں ڈاکٹر فضل الرحمان فریدی صاحب، عبدالرشید عثمانی صاحب وغیرہما اہم مشاہیر شامل ہیں۔ اس میں تعلیم دینے کے لیے جماعت نے اپنے باصلاحیت ارکان جماعت کی خدمات حاصل کیں تو مولانا مرحوم کو بھی مدرسۃ الاصلاح سے ثانوی درسگاہ مرکز جماعت اسلامی ہند رامپور بلالیا اور آپ وہاں قرآن، دیوان الحماسہ وسبع معلقات کا درس دینے لگے لیکن مختلف اسباب کی وجہ سے یہ سلسلہ زیادہ دنوں تک جاری نہ رہ سکا۔ جب ثانوی درسگاہ ختم ہوئی تو مولانا کو شعبہ تصنیف میں لے لیا گیا

لیکن مولانا نے محسوس کیا کہ کچھ لکھنے کا روز موڈ نہیں بنتا ہے اور تنخواہ روز کی ملتی ہے ۔ ان کے اس احساس جوابدہی اور احتیاط نے ان کو جلد ہی شعبہ تصنیف سے استعفاء دینے پر مجبور کر دیا۔ آپ استعفاء دے کر پھر دوبارہ مدرسۃ الاصلاح آ گئے لیکن جلد ہی ۱۹۶۲ء میں وہاں ایسے حالات پیدا ہو گئے کہ تمام وابستگان تحریک کو وہاں سے سبک دوش کر دیا گیا۔ مولانا بھی سبکدوش ہو کر گھر آ گئے ، اسی اثنا میں سابق امیر حلقہ مغربی بہار جناب انیس الدین احمد مرحوم نے درسگاہ اسلامی کے انداز پر ایک مدرسہ ''جامعہ کاشف العلوم'' کے نام سے چتر پور ہزاری باغ ، بہار میں قائم کیا جس کا نصاب مولانا نے ہی ترتیب دیا تھا۔ اس لیے اس میں رنگ بھرنے کے لیے بھی مولانا کو وہاں بلایا۔ مولانا وہاں گئے اور تحریکی مقاصد کو بروئے کار لانے کے لیے جو نصاب ترتیب دیا تھا اس میں رنگ بھرنا شروع کیا۔ ابھی اپنی منزل کے پہلے مرحلے ہی میں تھا کہ بہتیرے معاونین نے تعاون سے ہاتھ کھینچ لیا۔ اس کے باوجود اس کو آگے لے کر چلتے رہے۔ ادھر جامعۃ الفلاح بھی انہی مناہج و مقاصد کو لے کر منزلیں طے کر رہا تھا۔ مولانا کی صلاحیت کا بہترین استعمال یہاں ممکن تھا لہٰذا یہاں کے ذمہ داران نے بصد اصرار دعوت دی تو اپنے شاگردوں سمیت ۱۹۶۴ء کے اواخر میں جامعۃ الفلاح تشریف لے آئے اور صرف چند استثنائی مہینوں کے علاوہ تاحیات جامعہ میں ہی رہے۔

اوائل ۱۹۷۲ء میں بعض نامعلوم وجوہ سے یہاں سے جامعۃ الرشاد گئے لیکن وہاں کا ماحول راس نہ آسکا اور سابق امیر حلقہ آندھرا پردیش مولانا عبدالرزاق لطیفی مرحوم کی دعوت پر جامعہ '' دارالہدیٰ'' محمد نگر، آندھرا پردیش چلے گئے لیکن جب ذمہ داران جامعہ کا پیہم اصرار بڑھا تو چند شرائط کے ساتھ دسمبر ۱۹۷۳ء میں جامعہ تشریف لے آئے اور پوری زندگی یہیں گزار دی۔

اخلاق و فضائل

مولانا علم و فضل اور جلالت قدر کے اعلیٰ مناصب پر فائز تھے اور وقت کی عظیم شخصیتیں ان کی مداح و ثناخواں تھیں اور بے تکلف ان کے باغ علم و حکمت سے خوشہ چینی کرتی تھیں۔ مولانا کی شخصیت با کمال، بہار آفریں اور دل آویز تھی، وہ تنہا ایک فرد نہ تھے بلکہ اپنی ذات میں ایک عظیم ادارہ اور ایک عظیم ادارے کی جان تھے۔ مولانا کے اخلاق و کردار سے تو سبھی متاثر تھے۔ ان کی نیک نفسی، سادگی، خدا ترسی اور قناعت کے تو سبھی قائل تھے۔ مولانا علمی حیثیت سے بھی صلاحیت و قابلیت کے لحاظ سے بھی، وسعت و جامعیت کے اعتبار سے بھی بلند پایہ انسان تھے۔

احتیاط و تقویٰ کا یہ عالم تھا کہ ثانوی درسگاہ سے جب شعبہ تصنیف میں لے لیا گیا اور مولانا

نے یہ محسوس کیا کہ روزانہ لکھنے کی طرف طبیعت مائل نہیں ہوتی، تنخواہ روز کی ملتی ہے تو ان کے احساس تقویٰ اور احتیاط نے جلد ہی شعبہ تصنیف سے استعفاء دینے پر مجبور کر دیا۔

مولانا بچوں کے لیے بہت ہی شفیق و مہربان تھے۔ طلبہ ان سے بہت مانوس تھے۔ وہ بھی طلبہ اور ان کے مسائل میں دلچسپی لیتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ کسی بچے کو کوئی تکلیف یا پریشانی ہوتی تو بے تکلف مولانا کے پاس پہنچ جاتا۔ مولانا اس سے بڑی محبت و شفقت سے پیش آتے، طلبہ کے مسائل اور شکایات پوری توجہ اور سنجیدگی سے سنتے، یہاں تک کہ ان کے گھریلو اور ذاتی معاملات میں بھی مفید مشوروں سے نوازتے رہتے۔ طلبہ سے لگاؤ کا ایک بہترین نمونہ یہ واقعہ ہے کہ ''جامعۃ الفلاح کے ایک طالب علم کو بستی کے ایک آدمی نے مارا پیٹا، مولانا کو جب معلوم ہوا تو انھوں نے اس وقت کے ناظم کے نام ایک رقعہ بھیجا کہ ''مجھے فلاں شخص نے مارا ہے'' یہ رقعہ پا کر ناظم صاحب جس حال میں تھے اسی حال میں بھاگے ہوئے جامعہ چلے آئے اور مولانا سے ملے۔ مولانا نے پوری بات ان کے سامنے رکھی، چنانچہ اسی دن شام کو بستی والوں کی ایک میٹنگ ہوئی اور متعلق فرد کی سرزنش کی گئی۔
(ہفتہ روزہ دعوت دہلی ۲۳ تا ۲۹ /اگست ۱۹۸۱ء)

ایک طالب علم کی پٹائی کو اپنی پٹائی تصور کرنا، اپنے طلبہ سے استاد کی شفقت کا کیسا بے مثل و اعلیٰ نمونہ ہے۔ سبحان اللہ پھر بھلا طلبہ مولانا کو دل و جان سے کیوں نہ چاہتے۔ یہی وجہ ہے کہ انتظامیہ کے ممبران سے لے کر اساتذہ و طلبہ تمام ہی مولانا کا بے حد احترام کرتے تھے۔ ان سے مرعوب رہتے اور ''بڑے مولانا'' کے نام سے یاد کرتے لیکن مولانا اپنی گفتگو سے کبھی ظاہر نہ ہونے دیتے کہ وہ بڑے ہیں۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا ''اپنے بچوں کی دلجوئی کرو'' مولانا طلبہ کے سلسلہ میں ہمیشہ اس حدیث کو پیش نظر رکھتے۔ کسی طالب علم کے ہاتھوں اگر کوئی نقصان ہو جاتا تو عتاب و ملامت کے بجائے وقتی خفگی کا اظہار اگر فرماتے بھی تو پھر اس کے ازالے کے لیے اعلیٰ تدبیر اپناتے کہ طالب علم مولانا کا اسیر ہو کر رہ جاتا۔ مولانا حلیم و بردبار تھے اور بہت ہی بے لوث و بے نفس انسان تھے۔ سارا کام خود انجام دیتے تھے لیکن منصب و عہدہ لینے سے ہمیشہ گریز کرتے رہے۔ اہل اللہ کے حالات میں یہ چیز نمایاں طور پر نظر آتی ہے کہ وہ بہت مہمان نواز ہوتے ہیں کیونکہ یہ چیز صفات باطنی اور قلبی تونگری کا نتیجہ ہوتی ہے۔ مہمان نوازی ان کی نمایاں خصوصیات میں سے تھی۔ وہ مہمانوں سے تپاک سے ملتے ان کی خوب خاطر مدارات کرتے۔

مولانا نہایت بااصول اور محتاط زندگی گذارتے تھے۔اگر کسی کو کسی کام سے باہر بھیجتے تو وہ درس جو کہ اس بچے کا چھوٹ جاتا تھا تو اس کو بعد میں اسی محنت ولگن سے پڑھا دیتے تھے۔ان کے کھانے پینے اور مطالعہ کرنے کا ایک وقت متعین تھا، مطالعہ تو ایک طرح سے ان کی روحانی غذا تھی۔ ان کی اپنی ایک بڑی لائبریری تھی جس کو وہ ''المکتبۃ الحسنۃ'' کہا کرتے تھے۔

مولانا بڑے نفاست پسند اور صاحب ذوق تھے۔لباس میں ہمیشہ تہبند اور لمبا کرتا زیب تن فرماتے۔ان کے سفید اور بے داغ کرتے پر کبھی کوئی شکن کہیں نظر نہیں آتی۔

مولانا عالم خشک بھی نہ تھے کہ ہر وقت کتابوں کی دنیا میں ہی کھوئے رہتے۔انہیں موجودہ حالات کے متعلق بھی کافی اہم معلومات رہتیں، پابندی سے ریڈیو سے خبریں سنتے، اخبارات و رسائل کا بالاستیعاب مطالعہ فرماتے، ان کی ڈاک میں خطوط کے علاوہ بے شمار مختلف ملکی وغیر ملکی اخبارات ورسائل آتے، اہم اہم خبروں کا وہ اپنے پاس ایک ریکارڈ رکھتے۔درجوں میں بھی عام طور سے ان خبروں پر بے لاگ تبصرہ فرماتے۔مولانا انقلاب ایران اور مجاہدین افغانستان کی کوششوں کو سراہتے تھے۔

اکثر جمعہ کا خطبہ بھی دیا کرتے تھے۔جس جمعہ کو خطبہ دیتے نمازیوں کی تعداد میں غیر محسوس طریقے سے اضافہ ہوتا تھا۔مولانا کا معمول تھا کہ عصر بعد اپنے کمرے کے سامنے چارپائی پر بیٹھ جاتے، جب بیٹھتے تو قرب وجوار سے کافی لوگ چھوٹے چھوٹے بچوں کو لے کر آتے کہ مولانا آپ دم کردیں۔اس طرح عصری مجلس کا اچھا خاصہ وقت عقیدت مندوں کی دلجوئی میں گذر جاتا تھا۔ دعا کرنے کے ساتھ ساتھ نماز پڑھنے کی تلقین بھی کرتے جاتے تھے۔اس کے بعد موجود اساتذہ کرام اور طلبہ سے مختلف موضوعات پر گفتگو رہتی تھی۔مولانا عام رجحانات سے پرے عربی تاریخ کو لکھنے اور درج کرنے میں ترغیب دلاتے اور لکھتے تھے۔

مولانا معاملے کے کھرے تھے۔کسی کا ایک پیسہ نہ رکھتے تھے۔مولانا ڈھکے چھپے بھی مختلف لوگوں، اپنے پڑوسیوں، یتیموں اور بیواؤں کی مدد کیا کرتے تھے۔طلبہ میں سے بھی کئی ایک کے اخراجات مولانا ہی اپنی قلیل آمدنی میں سے پورا فرماتے۔مولانا حد درجہ خود دار تھے، اگر وقت سے طلبہ ان کا کام کرنے کے لیے نہیں پہنچتے تو خود سے ہی کام گھسٹ گھسٹ کر انجام دیتے ہوئے نظر آتے۔اپنی معذوری کے باوجود کبھی کسی کے سامنے اپنی خودداری کو رسوا نہیں ہونے دیا۔بڑی پروقار زندگی بسر کرتے رہے۔بعض اوقات پریشانیاں تک ہوئیں لیکن نہ طلبہ سے اور نہ ذمہ داران

سے اف تک کہا۔طلبہ جو کہ ان کے سب کچھ تھے اور سارا کام انجام دیتے تھے، ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ ذمہ داران نے اعلان کردیا کہ کوئی بھی طالب علم چھٹی میں یہاں نہیں رک سکتا اور یہ فیصلہ بہر حال مولانا کے لیے تکلیف دہ تھا لیکن مولانا نے ذمہ داران سے کچھ نہ کہا اور صرف ایک طالب علم کو بمشکل اپنی خدمت کے لیے روک سکے پھر بھی رمضان بھر پریشانی رہی لیکن آپ نے گوارہ کیا۔

یہ تھی مولانا کی زندگی، مومنانہ اور عارفانہ زندگی، نہایت پاکیزہ، دلکش اور قابل رشک زندگی۔مولانا سچ مچ علم ومعرفت کے شہسوار، نیکی اور تقویٰ کے تاجدار اور گنج قناعت کے بادشاہ تھے اپنی سادہ زندگی کے لیے جو کچھ ضابطہ بنایا تھا اس پر سورج وچاند کی سی باضابطگی کے ساتھ چلتے تھے۔

مولانا اور قرآن

مولانا قرآن کے زبردست اور بے نظیر عالم تھے اور علوم قرآنی کے مطالعہ سے بڑی رغبت تھی، عمر بھر قرآن ان کا خاص موضوع فکر رہا۔ ہر آن قرآن میں ڈوبے رہتے تھے۔قرآن سے خصوصی شغف تھا۔ ہمہ وقت قرآن کے اسرار وحکم کو جاننے میں لگے رہتے تھے۔قرآن کی تعلیم وتفسیر میں ان کا بڑا مقام تھا۔ وہ اس وقت برصغیر میں ہی نہیں بلکہ پورے عالم اسلام میں قرآن کے عظیم ترین عالم تھے۔محض وہ عالم نہیں جو قرآن کی تفسیروں کی مدد سے رازی وکشاف کی رائیں معلوم کرلیتا ہے بلکہ انہوں نے قرآن میں ڈوب کر سراغ زندگی پانے کی سعی کی تھی۔انہوں نے ایک ایک آیت اور ایک ایک لفظ پر غور کیا تھا اور غور وفکر کا یہ سلسلہ مسلسل جاری تھا۔اس کی طرف رغبت کے متعدد اسباب خود مولانا نے گنوائے ہیں۔ایک سبب خود قرآن کی تعلیم کی ابتدا ہے جو کہ عجیب وغریب اور انقلاب انگیز ہے۔مولانا اپنے گھر کرمینی (اعظم گڑھ) سے کئی میل پیدل چل کر بلریا گنج جونیر ہائی اسکول میں پڑھنے آتے تھے۔ایک روز پڑھ کر واپس جارہے تھے کہ راہ میں ایک شخص ملا۔اس نے مولانا کو آواز دے کر بلایا تو مولانا سہمے ہوئے اس کے قریب گئے۔اس نے دریافت کیا: ''کیا پڑھتے ہو؟'' آپ نے بتایا کہ فلاں فلاں مضمون پڑھتا ہوں، تو اس نے اپنی دیہاتی زبان میں کہا کہ ''علم حاصل کرنا ہے تو قرآن پڑھو۔ یہ علم نہیں ہے جو تم پڑھتے ہو۔'' اس کے بعد مولانا گھر سے نکل کھڑے ہوئے، مقصد قرآن کی تعلیم حاصل کرنا تھا۔ دوسرے مولانا کو قرآن پڑھنے کی طرف ان کی والدہ نے راغب کیا۔ وہ بالکل معمولی پڑھی لکھی ہوئی تھیں۔مولانا سے قرآن پڑھنے کو کہتیں اور جب مولانا پڑھنے لگتے تو وہ اس پر رونے لگتیں کہ وہ اس نعمت سے محروم ہیں۔مولانا سوچتے کہ آخر اس کتاب میں کیا ہے کہ اس سے محروم شخص اپنے کو بدقسمت سمجھتا ہے اور روتا ہے۔انہوں نے طے کیا کہ عربی زبان سیکھ

کراس کتاب کوضرور سمجھیں گے۔اس کے لیے مختلف اداروں میں عربی پڑھتے رہے۔ جب عربی آ گئی تو قرآن پرغور کرنا اور تفسیروں سے مدد لینا شروع کر دیا۔تیسرے قرآن سے لگاؤ کی ایک وجہ یہ تھی کہ دارالعلوم دیوبند کے قیام کے دوران مدرسۃ الاصلاح سرائے میر سے ایک رسالہ ''الاصلاح'' نکلتا تھا جس میں قرآن سے متعلق مضامین شائع ہوتے تھے۔مولانا اس کے مضامین کو انتہائی دلچسپی اور پابندی سے پڑھتے تھے۔اس طرح قرآن سے لگاؤ اور تعلق بڑھتا گیا۔چوتھے قرآن سے لگاؤ کی ایک خاص وجہ یہ بھی تھی کہ علامہ فراہیؒ کے شاگرد رشید مولانا اختر احسن اصلاحیؒ کی خواہش پر مولانا سرائے میر مدرس ہوکر آ گئے۔مولانا اختر احسنؒ علامہ فراہیؒ سے فیض یاب ہونے کی وجہ سے قرآن پر گہری نظر رکھتے تھے۔ان کی تحقیق نہایت ہی اعلیٰ ہوتی تھی۔ان کے سوچنے کا انداز نرالا تھا، وہ قرآن کو سوچ سمجھ کر پڑھتے تھے، مولانا ان سے متاثر ہوئے اور خوب خوب استفادہ شروع کر دیا۔ان کے ساتھ صبح وشام کی نشستوں اور مذاکرات نے ان کو واقعی قرآن کا طالب بنادیا اور قرآن پر غور وفکر ان کا محبوب مشغلہ بن گیا حتی کہ خط وکتابت ہو یا ملاقات، اپنے ساتھیوں اور شاگردوں سے وہ ضرور قرآن کے متعلق گفتگو کرتے۔کبھی کسی آیت پر سوچنے کی دعوت دیتے، ایک طالب علم کی طرح پوچھتے اور کبھی اپنے علم ومطالعہ کا رعب نہ جماتے۔اس طرح کے خطوط مکتبہ جامعہ میں بھی موجود ہیں۔ رجم کے موضوع پر مختلف علماء کے پاس جو سوالنامہ ارسال کیا تھا اس کا بین ثبوت ہے۔یہ سوالنامہ ماہنامہ مجلّہ ''حیات نو'' مئی ۱۹۸۱ء کے شمارے میں موجود ہے۔اس طرح سے مولانا کی باہوش زندگی کا قرآن پڑھنے سے آغاز ہوا اور زندگی کا خاتمہ بھی قرآن ہی پڑھتے ہوئے ہوا۔کتنا قابل رشک ہے وہ شخص جس نے عمر بھر قرآن پر غور وفکر کیا اور اس کے اتھاہ سمندر سے بڑے قیمتی اور تابدار موتی نکالے۔

درس وتدریس، خطبہ جمعہ وغیرہ کا سلسلہ تو جاری ہی رہتا تھا، اس کے علاوہ کافی تعداد میں درس قرآن ہیں جو کہ زندگی نو (رامپور)، ذکریٰ (رامپور)، حجاب (رامپور)، حیات نو (اعظم گڑھ)، دعوت (دہلی)، موومنٹ (علی گڑھ، دہلی)، الایمان (دیوبند) وغیرہ میں چھپے ہیں۔الحمدللہ وہ سب یکجا کردئے گئے ہیں اور توقع ہے کہ جلد ہی ادارہ علمیہ جامعۃ الفلاح کی جانب سے شائع کردیا جائے گا۔

اس کے علاوہ ''آسان تفسیر'' تیسواں پارہ ہے جو دعوتی انداز میں لکھی گئی ہے، اس کے مصنف مولانا ابوسلیم محمد عبدالحئی مقدمہ میں رقم طراز ہیں کہ ''اس سلسلے میں سب سے زیادہ تعاون جناب مولانا جلیل احسن ندویؒ سے حاصل ہوا ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ ابتدائی نصف

حصہ میں بہت کچھ گویا انہیں کا بتایا اور لکھوایا ہوا ہے۔'' (ص ۳-۴)

مولانا مودودیؒ کے معرکۃ الآراء تصنیف ''تفہیم القرآن'' پر نقد کرتے ہوئے مولانا عزیز الرحمٰن بجنوری نے ''تقصیرات تفہیم'' کے نام سے ایک کتاب تحریر کی تھی۔اس کے مسکت جواب کا ارادہ تھا کیونکہ مولانا کے مسودہ میں اس پر ایک خاکہ بنا ہوا موجود ہے۔خود اسی کتاب پر جابجا نشانات لگے ہوئے ہیں لیکن افسوس یہ کام پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکا۔

علامہ فراہی کے شاگرد رشید مولانا امین احسن اصلاحیؒ نے تقریباً اپنے استاد کے مناہج کو اپنا کر ان کے نقطۂ نظر کو سامنے رکھ کر ایک معروف تفسیر ''تدبر قرآن'' کے نام سے تحریر کی ہے۔مولانا مرحوم نے اس کا پوری دقت نظر اور باریک بینی کے ساتھ مطالعہ کیا تھا۔اس پر جابجا نشانات وحواشی بھی تحریر ہیں۔'' تدبر قرآن پر ایک نظر'' کے نام سے کام بھی شروع کردیا تھا۔ تیار شدہ مواد زندگی (رامپور) کے ۱۹۸۳ء اور ۱۹۸۴ء کے شماروں میں چھپ چکا ہے۔ابھی یہ کام صرف سورہ اعراف کے ''ولما سقط فی أیدیھم'' (آیت :۱۴۹) تک ہی ہوا تھا کہ داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔تدبر قرآن کے تمام اجزاء پر جابجا نشانات اور مسودات بتاتے ہیں کہ صرف لکھنے کا کام باقی تھا۔واضح رہے کہ اس کام کے لیے صاحبِ تدبر نے خود ہی خطوط کے ذریعہ پیشکش کی تھی۔

احادیث میں ''راہِ عمل'' اور ''زادِراہ'' وغیرہ کے نام سے جو تربیتی واصلاحی مجموعہ تیار کیا تھا، اسی طرح تربیتی اور اصلاحی انداز کا ایک مجموعہ قرآنی آیات پر مشتمل تیار کررہے تھے۔جس کا کچھ حصہ تیار ہوچکا تھا اور برابر کام جاری تھا۔اس کے علاوہ پہلی ترجیح مولانا کے سامنے یہ تھی کہ وہ ان تقاریر کا مجموعہ تیار کرینگے جو غیر مسلموں کے سامنے قرآن میں کی گئی ہیں۔اس طرح سے قرآن پر متعدد کام پیش نظر تھے جو کہ تشنہ رہ گئے۔اے کاش! کسی شاگرد رشید کو ان کاموں کی تکمیل کی توفیق ملتی۔

مولانا حالات حاضرہ پر کڑی نگاہ رکھتے تھے اور حالات کا مطالعہ تاریخ کی روشنی میں اور تاریخ کا مطالعہ قانونِ قرآن کے مطابق کرتے تھے۔انتشار کا واحد سبب خدا کی کتاب کے ساتھ اس کا سلوک بتاتے تھے اور کہتے تھے کہ اس قوم کی ترقی اور اس کا عروج صرف اس میثاق الٰہی کو اپنانے میں ہے۔قوم محتاج ہے کہ اس کو اس کا بھولا ہوا میثاق یاد دلایا جائے۔

مولانا قرآن میں لفظ کو پکڑ کر چلنے کی تاکید کیا کرتے تھے اور ایسے نکتے اپنے درس کے دوران بیان فرماتے کہ عقل حیران رہ جاتی تھی۔ بہت سارے مواقع پر مولانا کی اپنی منفرد رائے ہوا کرتی تھی جیسا کہ ''تدبر قرآن پر ایک نظر'' میں دیکھنے کو ملتا ہے۔اسی طرح قصہ یوسف (نقوش و

تاثرات 'حیاتِ نو' فروری-مارچ ۱۹۸۱ء ص ۱۵-۱۶)، ''اصحاب اعراف کون''، ''سورہ توبہ پر ایک نظر''، ''تطہر اور ارسال پر ایک نظر'' وغیرہ مضامین بالترتیب 'حیاتِ نو' ستمبر-نومبر ۱۹۸۷ء کے مطالعہ سے اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ مولانا کا کہنا تھا کہ اگر الفاظ سے صرف نظر کر کے مفہوم کا تعین کیا جائے تو پھر عقل کو بے جا تاویل کرنی پڑتی ہے اور لوگ بلا وجہ پریشان ہوتے ہیں۔

مولانا اور حدیث

مولانا قرآن کے ساتھ حدیث کے بھی زبردست عالم تھے انہوں نے مشہور زمانہ اساتذہ حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اور مولانا بدر عالمؒ صاحبِ ''فیض الباری'' جنہوں نے کہ مولانا انور شاہ کشمیریؒ سے کسبِ فیض کیا تھا، سے بھرپور استفادہ کیا تھا۔ فنی حیثیت سے مولانا کو کتنا عبور تھا اس کا صحیح اندازہ لگانا مشکل ہے۔ لیکن جن ابواب کا وہ درس دیتے تھے بھرپور درس ہوا کرتا تھا ہر لحاظ سے اس پر نقد و تبصرہ فرماتے تھے حتیٰ کہ بخاری کا مشکل ترین جزء ''کتاب الحیل'' جس کو مسکت طریقے سے حل کرنے میں بڑے بڑے کبار عاجز تھے انہوں نے اس کو آسانی سے حل کرلیا تھا اور اس پر پوری طرح تیار ہو کر درس دیتے تھے۔ دعوت و تربیت کے پیش نظر متعدد مجموعے ترتیب دئے اور ان کے مطالعہ سے محسوس ہوتا ہے کہ آپ کا مطالعہ خاصا تھا۔ ''راہِ عمل'' میں بنیادی عقائد کا حدیث کی روشنی میں مطالعہ کیا گیا ہے۔ یہ کتاب فلسفۂ انسانی کی راست ''راہِ عمل'' کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ ''زادِ راہ'' دراصل ایک مومن کے لیے زادِ راہ کیا ہو؟ اس کی تشریح ہے اور ''سفینۂ نجات'' میں عام زندگی کے تمام گوشوں کا احاطہ کرلیا گیا ہے۔

مولانا کو حدیث کے تراجم اور تشریح لکھنے کا خیال کیونکر پیدا ہوا، اس کا جواب دیتے ہوئے مولانا خود فرماتے ہیں کہ ''موجودہ زمانے میں جب کہ دین سے بے رغبتی عام ہے اور عام لوگوں کو اپنی بے پناہ مصروفیات کی وجہ سے ضخیم کتابوں کا مطالعہ کرنے یا ان سے استفادہ کرنے کا موقع نہیں ملتا۔ ایسے تمام حضرات کے لیے احادیث رسولؐ کا ایسا مجموعہ تیار کیا جائے جو کہ ہلکا ہو جس کو ایک قلیل عرصہ میں پڑھا جاسکے اور عملی زندگی میں مکمل رہنمائی مل سکے۔''

ایک دوسرے محرک کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ مولانا ابو سلیم عبدالحئی (سابق مدیر الحسنات) مولانا سے کہنے لگے کہ ہم لوگوں کے پاس حدیث کی کوئی ایسی کتاب نہیں ہے جو دعوتی طرز پر لکھی گئی ہو۔ جس سے رفقاء تحریکی مزاج کی غذا حاصل کرسکیں۔ چنانچہ انہیں کی تحریک اور اصرار پر یہ کام شروع کیا اور درسی مشغولیات کے ساتھ ساتھ چار مہینے کی لگاتار محنت سے پہلی

کتاب ''راہِ عمل'' لکھی۔ اس کے بعد ''زادِ راہ'' لکھی۔ ('حیاتِ نو' اگست ۱۹۷۹ء ص ۱۰)

پھر ۱۹۸۲ء میں مولانا کی تیسری کتاب جسے غیر مسلم اور مسلمان دونوں کو سامنے رکھ کر مدون کیا تھا ''سفینۂ نجات'' کے نام سے منظر عام پر آئی۔ ان کتابوں کو بہت زیادہ قبول عام حاصل ہوا حتیٰ کہ ''راہِ عمل'' کے اب تک اٹھارہ ایڈیشن اور ''زادِ راہ'' کے نو ایڈیشن اور ''سفینۂ نجات'' کے تین ایڈیشن ہندو پاک سے شائع ہو چکے ہیں۔

ان کتابوں میں مرتب نے ایسی حدیثوں سے احتراز کیا ہے جو محدثین کے نزدیک پایۂ اعتبار سے ساقط ہیں۔ اس کی دوسری خوبی یہ ہے کہ تشریح میں لمبی بحثوں سے احراز کیا گیا ہے اور زبان عام فہم اور سلیس رکھنے کا اہتمام کیا گیا ہے۔ اس کی سب سے بڑی خاصیت یہ ہے کہ ترجمہ معنی خیز، رواں، شگفتہ، نہایت فصیح و بلیغ ہے اور انسانی تربیت و اصلاح اور عام زندگی کا احاطہ کرتے ہوئے دعوتی و تربیتی ضرورتوں کی تکمیل میں پوری طرح معاون ہے۔

اس کے علاوہ مولانا ''حدیث خواتین'' کے نام سے ایک الگ مجموعہ تیار کر رہے تھے جس کا بیشتر حصہ ابھی بھی مسودوں میں پڑا ہوا طاق نسیاں کے حوالے کر دیا گیا ہے نیز اسوۂ نبویؐ اور اسوۂ صحابہؓ کے نام سے الگ الگ دو مفصل مجموعہ کی تیاری بھی پیش نظر تھی جس کا کچھ حصہ ''راہِ عمل'' کے بعد کے ایڈیشنوں میں آچکا ہے۔ اس کے علاوہ بہتیرے دروس حدیث جو کہ مختلف اجتماعات کے مواقع سے دئے گئے تھے ''دعوت'' وغیرہ میں آچکے ہیں۔ نیز 'حیاتِ نو'، زندگی ہفت روزہ دعوت، ایشیا، الحسنات، حجاب و ذکریٰ وغیرہ میں آپ کے فکر پارے مستقل آتے رہتے تھے جس کو ادارۂ علمیہ ''زادِ سفر'' کے نام سے جلد ہی منظر عام پر لانے والا ہے۔

مولانا اور ادب

مولانا مرحوم قرآن و حدیث کے ساتھ ساتھ عربی ادب کے بھی زبردست اسکالر تھے۔ مولانا ہندوستان کے ان چند گنے چنے لوگوں میں سے ایک تھے جو عربی ادب و انشاء پر پورا عبور رکھتے تھے اور ان کی عربیت پر عجمیت کا شبہ تک نہ ہوتا تھا۔ مولانا اعزاز علی اور مولانا ناظم ندویؒ جیسے ادیب الادباء کی صحبت نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا تھا اور اس میں کامل و خاص دست گاہ ہوگئی۔ جاہلی کلام کے سلسلے میں جو کمی رہ گئی تھی اس کو ماہر جاہلی ادب مولانا اختر احسن اصلاحیؒ سے استفادے نے پایہ تکمیل تک پہنچا دیا۔ چنانچہ جاہلی ادب پر بھی ان کو دسترس حاصل ہوگئی۔ ادب کے بڑے نبض شناس تھے اور بڑی دقت نظر کے ساتھ پڑھتے پڑھاتے تھے۔ عربی ادب و لغت سے انہیں خاص انس تھا،

لکھتے بھی بہت عمدہ تھے ''راہِ عمل''، ''زادِ راہ' اور ''سفینۂ نجات'' کے سلیس ترجمے، مختصر اور عمدہ تشریحات اس کا زندہ و پائندہ نمونہ ہیں۔

مفکر اسلام مولانا مودودیؒ نے ''دارالعروبہ'' کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا تھا جس کے مدیر مولانا مسعود عالم ندویؒ تھے۔ یہ ادارہ اردو کتابوں کو عربی میں منتقل کرنے کے لیے قائم کیا گیا تھا۔ مولانا بھی اس کے رکن تھے۔ مولانا مودودیؒ کی ایک انقلابی کتاب ''قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں'' کا ترجمہ بھی اسی ادارے سے تعلق کے زمانے میں کیا تھا۔ اس کے علاوہ ''اسلام کا نظام حیات''، ''اسلام کا اقتصادی نظام' اور مختلف چھوٹے چھوٹے پمفلٹ اور تقاریر کا عربی میں ترجمہ کیا تھا۔

عربی لغت میں مولانا کی دستگاہ کا یہ عالم تھا کہ بڑے بڑے ائمہ وقت نے ان کی طرف اس سلسلے میں رجوع کیا ہے اور انہوں نے وقت کی اکثر عربی ادب کی کتابوں پر نظر ثانی کی اور اس کی تکمیل کے سلسلے میں تعاون دیا۔

مولانا مرحوم خود ایک عربی لغت قرآنی مفاہیم اور جاہلی شعراء کے اشعار کا لحاظ کر کے ترتیب دے رہے تھے جو یقیناً قرآن کے طالب علموں کے لیے نایاب تحفے کی حیثیت رکھتا۔ اس کا کچھ حصہ مرتب شکل میں موجود بھی ہے۔ اسی طرح 'جمہر ۃ اشعار العرب' کے پورے دیوان کا مطالعہ کر کے اس کے مشکل الفاظ و تراکیب کے صحیح تحقیق شدہ معنی کا تعین کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے مختصر حواشی بھی تحریر کیے تھے جس میں جابجا اسالیب قرآنی اور نظائر قرآنی کا تذکرہ بھی ہے۔ یہ سب کچھ آج بھی مسودوں کی شکل میں موجود ہے۔

عربی اردو کی مشہور لغات میں ''مصباح اللغات'' ایک اہم مقام رکھتی ہے۔ مولانا مرحوم کا اس میں بھرپور تعاون رہا ہے۔ مولانا نے فی نفسہٖ اس کی تکمیل میں اپنا حصہ ادا کیا تھا۔ اس کی تصحیح و نظر ثانی کا تقریباً مکمل کام آپ نے کیا تھا۔ خود مؤلف نے آپ کے تعاون کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''......ناشکری ہوگی اگر صدیق مکرم...... فاضل جلیل جناب مولانا مولوی جلیل احسن اصلاحی ندویؒ کے احسانات سے اپنے آپ کو سبکدوش سمجھوں کہ...... انھوں نے اپنے علمی فیوض سے فائدہ پہنچایا۔'' (مصباح اللغات ص۳)

مولانا بہتیرے ادیبوں کے مرکز و مرجع تھے جن کو اپنے علمی فیض سے فائدہ پہنچاتے رہتے تھے اور ایک عظیم استاد فن کی حیثیت سے مفید مشوروں سے نوازنے کے ساتھ نظر ثانی بھی

کرتے تھے۔ آپ نے ''محاسن الشعر'' از اجمل ایوب اصلاحی کی تکمیل و تسوید میں نمایاں رول ادا کیا تھا۔ اسی طرح ''القراءۃ العربیۃ'' از عبدالمجید اصلاحیؒ کی تسوید کے ساتھ ساتھ اس پر مقدمہ بھی تحریر فرمایا تھا۔

مولانا کو صرف و نحو پر بھی عبور تھا۔ وقت کے اہم علماء سے صرف و نحو کا درس لیا تھا اور پڑھاتے وقت اس کے ایسے نکتے بیان فرماتے کہ لوگ حیران رہ جاتے۔ درس نظامیہ سے پڑھے ہونے کے باوجود فراہیؒ کے نہج صرف و نحو پر بھی کامل دستگاہ تھی جو مولانا اختر احسن اصلاحیؒ کی صحبت کا نتیجہ تھا۔ ان پر تالیف کردہ بہتیری کتابوں پر بھی نظر ثانی کی اور مقدمہ لکھے، اس کے باریک لغت و معارف کے حل میں بھی مدد فرمایا کرتے تھے جس کی واضح مثال جناب مولانا محمد ایوب اصلاحی صاحب کی کتاب ''تعلیم النحو'' حصہ اول، دوم پر مولانا کا نظر ثانی فرمانا اور اس کا مقدمہ لکھنا ہے۔ مکتبہ جامعہ میں تو فن نحو پر خود مولانا کا بے ترتیب مسودہ موجود ہے۔

مولانا کے کتنے ہی شاگرد ہندوستان اور بیرون ہند کی نامی گرامی یونیورسٹیوں میں پروفیسر اور بہتیرے عربی کے بہترین انشاء پرداز ہیں۔ جن میں مولانا اجمل ایوب اصلاحی، مولانا سید حامد علیؒ، مولانا عبدالباری شبنم سبحانی، مولانا ملک حبیب اللہ، مولانا سید ابوسعید عابدی و مولانا خالد حامدی وغیرہ عربی ادب و انشاء کے عظیم اسکالر ہیں اور مولانا کے اس صنف میں نمائندہ کارکن بھی، چنانچہ اپنے استاد کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے مولانا سید حامد علیؒ صاحب رقم طراز ہیں کہ ''اگر میں 'فی ظلال القرآن' کی کوئی خدمت کر پا رہا ہوں اور اس کے ادب کی کوئی چاشنی آپ کو محسوس ہو رہی ہے تو میں آپ کو بتا دوں کہ ''عربی زبان و ادب میں مجھے سب سے زیادہ استاد محترم مولانا جلیل احسن ندویؒ سے مدد ملی۔'' (فی ظلال القرآن، آخری پارہ ص۲۴)

مولانا عام طور سے خطوط بھی عربی زبان میں لکھتے تھے۔ اس میں بھی رواں، شگفتہ، فصیح و بلیغ اور سلیس زبان استعمال کرنے کی کوشش کرتے۔ مولانا کے خطوط دلچسپ اور ادب پارے ہوتے تھے۔ انگریزی اور اردو الفاظ کو اس خوبصورتی سے عربی کا جامہ پہناتے کہ لطف پیدا کر دیتے تھے۔ خط میں ادبی چاشنی تو ہوتی ہی استعاروں اور کنایوں کی بھی بھرمار ہوتی تھی۔

مولانا اور تعلیم

مولانا ایک ماہر تعلم بھی تھے اور ان کا طریقۂ تدریس جاذب، فطری اور مؤثر تھا۔ طالب علم کی خفیہ صلاحیتوں کو بیدار کرنے اور انہیں فطری طور پر نشو و نما دینے کے فن سے وہ بخوبی واقف

تھے۔مولانا پہلے خود کسی آیت، حدیث یا اشعار سے متعلق مختلف سوالات ذہن میں پیدا کر دیتے جس سے طلبہ کا انہماک اور جستجو اور بڑھ جاتا پھر خود ہی سوالات کے ایسے تشفی بخش جوابات دیتے کہ بے اختیار دل و دماغ ان کو قبول کر لیتا، جب تک انہیں اطمینان نہ ہو جاتا کہ طلبہ مطمئن ہو چکے ہیں بات ان کی سمجھ میں آ گئی ہے، تب تک وہ درس آگے نہ بڑھاتے۔کبھی کبھی تو قرآن کی ایک آیت سمجھانے میں ہفتوں لگ جاتے لیکن سمجھانے کے بعد ہی آگے بڑھتے۔اگر طلبہ کے حرکات وسکنات سے اندازہ ہو جاتا کہ ان کی طبیعت ادھر مائل نہیں ہے تو درس روک دیتے۔مولانا کی ایک خوبی یہ تھی کہ ایک ہی چیز کو وہ مسلسل کئی سالوں سے پڑھاتے آ رہے ہوتے تھے لیکن اس دن جتنا مطالعہ فرماتے تھے، صرف اتنے ہی پر بس کر دیتے تھے اور اظہار بھی فرماتے کہ بس کرو میرا مطالعہ یہیں تک ہے۔ اگر کسی طالب علم کا درس چھوٹ جاتا تو الگ سے پڑھا دیتے۔اگر دیکھتے کہ کوئی طالب علم شوقین ہے تو بھرپور مدد کرتے اور تعاون دیتے غیر متعلق طلبہ کی بھی رہنمائی کرتے رہتے، ان کی کاپیاں طلب کر کے جانچتے رہتے۔مولانا نسیم غازی فلاحی صاحب رقم طراز ہیں کہ ''درجہ میں مولانا اپنے طلبہ کو ہر طرح سے مطمئن کرتے، ان کی اچھی باتوں کو سراہتے اور ہمت افزائی کرتے، ان کی چھپی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کی کوشش کرتے اور بڑے ہی دلچسپ انداز میں پڑھاتے۔میں اگر یہ کہوں تو مبالغہ نہ ہوگا کہ مولانا صاحب ایک کامیاب استاذ تھے جن کا اسوہ ہمارے اساتذہ کو اپنے سامنے رکھنا چاہئے۔درس وتدریس کے درمیان اٹھنے والے سوالات سے مولانا کبھی نہ جھنجھلاتے بلکہ محققانہ اور دلچسپ انداز میں جواب دیتے، اگر غیر متعلق سوال بھی مولانا سے کیا جاتا تو وہ اس کا مناسب حال جواب عنایت فرماتے۔(ہفت روزہ 'دعوت' نئی دلی ۲۳/۲۹ر اگست ۱۹۸۱ء)

مولانا درس نظامیہ کے طریق تدریس کے سخت مخالف تھے جس میں یہ ہوتا ہے کہ استاد گھنٹے میں آئے اور گھنٹہ بھر متعلقہ حصہ درس پر بول کر اٹھ جائے اس کو طلبہ کے حق میں مضر بلکہ مہلک سمجھتے تھے۔مولانا اپنے استاد خاص مولانا اختر احسن اصلاحیؒ کی پیروی میں کہتے تھے کہ ''طالب علم کی قوت تفکیر واستخراج مفاہیم اس طرز تدریس سے ختم ہو جاتی ہے۔'' یہ طریقہ طلبہ کی قوت مطالعہ کے لیے تباہ کن ہوتا ہے۔قوت مطالعہ ہر طالب علم کو اللہ نے ودیعت فرمائی ہے وہ ٹھٹھر کر رہ جاتی ہے۔ان کا کہنا تھا کہ متعلقہ عبارت کی صرفی ونحوی مشکلات حل کرنا، معاجم کی مدد سے الفاظ کے معانی نکالنا، اعراب صحیح کرنا، پھر عبارت کا مفہوم متعین کرنا یہ سب طالب علم کے کام ہیں، استاذ کا کام صرف ارشاد وتوجیہ ہے، اگر طالب علم کا متعین کیا ہوا مفہوم غلط ہے تو غلطی کس جہت سے آئی، سوچنے کا

صحیح راستہ کیا ہے، یہ سب بتانا معلم کا کام ہے۔معلم اگر صابر وحلیم نہ ہو، جھنجھلا جانے والا ہو تو وہ اس طریق تدریس کے لائق نہیں، اس کے لیے لکچر والا طریقہ ہی مناسب ہے۔تفکیری طریق تدریس کے لیے استاد کو گہرا مطالعہ اس بات کا بھی کرنا چاہیے کہ طلبہ کیا کیا مفہوم متعین کر کے لا سکتے ہیں اور انہیں صحیح مفہوم کی راہ پر ڈالنے کے لیے کیسے موڑا جا سکتا ہے۔ یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ زیر درس عبارت طلبہ کی فکری سطح سے اونچی تو نہیں ہے، ایسی صورت میں طلبہ کو دیر تک پریشان کرنا مضر ہوتا ہے۔مولانا کا کہنا تھا کہ ''مجھے یہی طریق تدریس پسند ہے اور طلبہ کے حق میں یہی بہتر ہے، لیکن دارالعلوم کا محاضراتی طریق تدریس تمام مدارس پر چھایا ہوا ہے۔فراہیؒ کے نافع تر مگر مشکل تر طریق کو اختیار کرنے والے بہت کم ہیں۔یہیں سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اکثریت کا کسی چیز کو اختیار کرنا مقبولیت اور نافعیت کی دلیل نہیں ہے۔(خضر راہ ص ۳۳، ذکری دسمبر ۱۹۷۳ء)

مولانا اکثر کہتے کہ ''ہمیشہ لفظوں کو پکڑ کر چلو، ہوا میں نہ اڑو'' (اس کی دلیل کے لیے سورہ یوسف آیات ۶۹ تا ۷۷ پر مولانا کا لکھا ہوا نوٹ ملاحظہ فرمائیں جو 'حیاتِ نو' ج ۴ش ۲-۳ ص ۱۴-۱۵ پر موجود ہے۔) مولانا کا کہنا تھا کہ عبارت کے ذریعے مفہوم کی تعیین کیجانی چاہیے نہ کہ مفہوم کے ذریعے عبارت حل کی جائے۔ یہ چیزیں اور یہ اسلوب وہی ہے جسے علامہ فراہیؒ نے اپنے شاگردوں کو سکھایا تھا۔مولانا نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ عربی مدارس میں گذارا تھا۔عربی مدارس کے ایک طالب علم رہ چکے تھے پھر اس سے بڑھ کر آپ کی حیثیت ایک مدرس کی تھی۔ مدارس میں پھیلے ہوئے رجحانات اور ذہنی کیفیات سے کافی حد تک نالاں ودکھی تھے، ان کی خوبی وخامی پر تبصرہ کرتے ہوئے اس کے لیے سودمند پہلو کو اجاگر کرتے رہتے تھے۔ایک مرتبہ ذکر آنے پر فرمایا کہ ''عربی مدارس کے طلبہ قرآن وحدیث پڑھتے ہیں لیکن وہ لگن اور انہماک اور وہ تگ ودو جوان کے لیے ضروری ہے، اس سے یکسر خالی نظر آتے ہیں۔'' وہ ایک خاص قسم کے احساس کمتری میں مبتلا رہتے ہیں، ان کے اندر دین کے غالب کرنے کا نصب العین نہیں جاگتا، دوسری طرف اساتذہ میں جمود کی کیفیت ہے، وہ اپنے موجودہ حالات پر قانع ہیں، ان پر بھی نصب العین واضح نہیں، یہی وجہ ہے کہ جزوی مقاصد کے لیے کام کرتے ہیں۔'' اس کے اصلاح کی سبیل بتاتے ہوئے آپ نے مزید فرمایا کہ ''مدارس میں عربی اس طرح پڑھائی جائے جو قرآن کو سمجھنے میں مددگار بنے۔قرآن کی طرف زیادہ سے زیادہ توجہ دی جائے، اس طرح طالب علم اللہ کی کتاب کو اچھی طرح سمجھے گا اور اپنی زندگی کا ایک مفید نصب العین متعین کر سکے گا۔مدارس میں ایک ایسی تنظیم کی ضرورت ہے جو دعوت کی راہیں متعین کرے، اسکا

سربراہ ایسا شخص ہو جو عربی مدارس کے علماء وطلبہ میں قابل اعتماد ہو۔'' ('حیاتِ نو' اگست ۱۹۷۹ء)

مولانا اور جامعۃ الفلاح

جامعۃ الفلاح یوں تو ایک ابتدائی مکتب کی شکل میں مدت سے قائم تھا لیکن اس صدی کے چھٹے عشرے میں کچھ بہی خواہوں نے اسے عربی درسگاہ بنانے کی تحریک شروع کی، اب یہاں کے ذمہ داروں کو ایک ایسے فرد کی ضرورت محسوس ہوئی جو اس کو سنبھال بھی لے اور اعلیٰ قسم کی عربی درسگاہ بھی بنادے۔ اس کے لیے متعدد باصلاحیت افراد کو دعوت دی گئی۔ ۲۰ رجون ۱۹۶۲ء کو انتظامیہ کا اجلاس ہوا اور جامعہ کو قدیم وجدید کا سنگم بنانے کا فیصلہ کیا گیا اور تحریک اسلامی کے کاز کو تقویت پہنچانے والے ادارہ کی شکل میں ابھار کر پیش کیا گیا۔ انہیں خطوط پر مدرسہ آگے بڑھنے لگا پھر ۱۹۶۴ء میں یہ مایہ ناز ستارہ چتر پور ہزاری باغ سے فلاح کی سرزمین میں آ گیا اور اس کے مقدر کھل اٹھے۔ مولانا کو آتے ہی صدر مدرس بنا دیا گیا اور پورا تعلیمی نظام ان کے سپرد کر دیا گیا وہ لوگ جواب بھی مصر تھے کہ اس کو سرکاری اسکول کے نہج پر لے چلیں مولانا کی آمد سے مکمل طور پر عربی کی طرف ہو گئے اور کسی میں یہ جرأت نہ تھی کہ اختلاف کرتا۔ اس کے عربی نصاب کی تعیین وتکمیل میں تقریباً مکمل طور سے مولانا حاوی رہے۔ مولانا کی قرآن سے دلچسپی کی وجہ سے قرآن کو یہاں بھی اصل اور اول مقام عطا ہوا۔ مولانا چونکہ شروع ہی سے معذور تھے، نقل وحرکت پریشانی کا باعث تھی، اس لیے کسی طرح کی ذمہ داری لینے سے بچتے تھے، چنانچہ جلد ہی صدارت سے استعفاء دے دیا، البتہ ناظم تعلیمات کی حیثیت سے برقرار رہے۔ پھر جب ۱۹۶۷ء میں مجلس انتظامیہ کی میٹنگ ہوئی تو اس میں باضابطہ تعلیمی کمیٹی تشکیل دی گئی۔ اس کا بھی چیئرمین آپ ہی کو منتخب کیا گیا۔ جب اکتوبر ۱۹۶۸ء میں جامعہ کے مقاصد کو بروئے کار لانے کے لیے تصنیف وتالیف اور علمی تحقیق کا شعبہ ''ادارہ علمیہ'' قائم ہوا تو اس کے خاص الخاص ممبران میں سے آپ بھی تھے ۱۴ رمارچ ۱۹۶۹ء کو مجلس انتظامیہ نے ڈاکٹر خلیل احمد صاحب کی مصروفیات کے پیش نظر نظامت سے ان کا استعفاء منظور کیا اور بالاتفاق مولانا کا انتخاب بحیثیت ناظم عمل میں آیا۔ اپنی نظامت میں بہتیرے نئے شعبہ کی طرف انتظامیہ کی توجہ دلائی اور پوری کوشش کر کے ۱۸ رمئی ۱۹۶۹ء کی نشست میں نسواں (کلیۃ البنات کے قیام پر) کے سلسلے میں غور وفکر پر مجبور کیا۔ آپ نے باصلاحیت معلمات کے حصول کی کوشش بھی کی۔ اسی طرح طبیہ کالج، شعبۂ حفظ وتجوید کے قیام اور ٹیکنیکل کلاسز کی سفارشات پیش کیں لیکن مولانا چونکہ اس طرح کی ذمہ داریوں سے دور رہنا چاہتے تھے، لہٰذا آپ نے جلد ہی استعفاء دے دیا اور ۱۴ رستمبر ۱۹۶۹ء کی نشست میں

آپ کا استعفاء منظور ہو گیا۔ البتہ تعلیمات کے شعبہ میں حسب معمول آپ کی ضرورت محسوس ہوئی اور آپ کو صدر مدرس بنا دیا گیا لیکن مولانا نے جلد ہی استعفاء دے دیا اور ۹ رفروری ۱۹۷۱ء کو یہ استعفاء بھی منظور ہو گیا۔ مولانا کی طبیعت ادھر مستقل خراب رہنے لگی تھی اور صحت برابر گرتی چلی جا رہی تھی، اس لیے مولانا نے معتمد تعلیمات سے بھی استعفاء دے دیا جو ۱۳ رنومبر ۱۹۷۱ء کو منظور ہو گیا لیکن بصد اصرار ۱۸ رنومبر ۱۹۷۲ء کو پھر آپ کو تعلیمات کا معتمد منتخب کیا گیا، لیکن یہ سلسلہ صرف چند ماہ ہی رہ سکا اور مولانا جامعہ سے منتقل ہو گئے۔ پہلے جامعۃ الرشاد اعظم گڑھ میں رہے پھر چند ماہ بعد امیر حلقہ آندھرا پردیش محترم عبدالرزاق لطیفی صاحب کی دعوت پر 'جامعہ دارالہدیٰ' محمد نگر آندھرا پردیش چلے گئے۔ مولانا کے جامعۃ الفلاح سے جانے پر سارا چمن اداس اداس رہنے لگا کیونکہ مالی ہی چلا گیا تھا۔ اس کمی کو ذمہ داران نے محسوس کیا اور ان کے جامعہ واپس لانے کی مستقل کوشش شروع ہوئی، جب طلبہ وذمہ داران کا پیہم اصرار بڑھا تو مولانا بھی اپنے لگائے ہوئے پودے سے بے پناہ محبت کی وجہ سے چند شرائط کے ساتھ جامعہ دوبارہ دسمبر ۱۹۷۳ء میں تشریف لائے۔ وہ شرائط یہ تھیں: (۱) چار سو روپئے ماہوار مشاہرہ لوں گا۔ (۲) وہی کمرہ رہنے کے لیے لوں گا جس میں پہلے رہتا تھا۔ (۳) ایسے حالات پیدا نہ ہوں کہ مجھے جامعہ چھوڑنا پڑے۔ (۴) میں اب کہیں نہیں جانا چاہتا اور میری کتابیں جامعۃ الفلاح کی ہوں گی۔ (سہ روزہ 'دعوت' ۷ راگست 1981ء)۔ اس کے بعد مولانا نے اپنی پوری زندگی جامعۃ الفلاح ہی میں گذار دی، یہاں پر حدیث وادب بھی پڑھاتے رہے لیکن تمام دلچسپی قرآن پاک سے تھی، قرآن نہایت دلچسپی اور ذوق وشوق سے پڑھاتے تھے۔ مولانا معذور تھے لیکن کبھی بھی یہاں کے نظام کو توڑا نہیں اور ساری مشقت جھیل کر کلاسز میں پہنچتے اور طلبہ کو درس دیتے، مولانا کو بہتیرے مواقع پر پریشانیاں جھیلنی پڑیں لیکن کبھی بھی حرف شکایت زبان پر نہیں لائے۔ یہاں کے تعلیمی نظام کو ٹھیک کرنے میں سب سے زیادہ انہیں کا ہاتھ تھا، قرآن کو دو گھنٹہ دلوائے، عمدہ استعداد رکھنے والے باصلاحیت افراد کی ٹیم کے حصول کے لیے ہمیشہ کوشاں رہے۔ ذمہ دار تھے تب بھی اور جب نہیں تھے تب بھی عام معلم ومعلمات کی فراہمی ہو یا حدیث کے لیے بہترین فرد کی تلاش، مولانا امین اثری صاحب علی گڑھ اکثر ذکر فرماتے رہتے ہیں ''مولانا نے مجھے جامعہ میں آ کر حدیث کا درس دینے کی دعوت دی اور اپنی خواہش کا پیہم اظہار بھی کیا۔'' یہاں سے اگر کوئی استاد جانا چاہتا تو نہایت سوز دروں سے سمجھاتے تھے، غرض مولانا نے اپنی ذات اور علم وعمل سے ہر سطح پر جامعہ کو اعتبار بخشا اور جامعہ کو جامعہ بنانے میں ان کی کوششیں کسی

سے کم نہیں ہیں۔مولانا کا تعلق بہتیرے مدارس سے تھا لیکن ان سب میں جامعہ کو ایک الگ اور منفرد مقام دیتے تھے۔اپنے ہاتھ سے لگائے ہوئے پودے کے سلسلے میں مولانا کی کیا کیا تمنائیں تھیں۔ اس کے لئے یہ عبارت کافی ہے ''جامعۃ الفلاح دیگر مدارس کے بالمقابل ایک امتیازی مقام رکھتا ہے ، دیگر خصوصیات سے قطع نظر یہاں کے طلبہ و اساتذہ کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان کے پاس ایک واضح اور متعین نصب العین ہے۔صحیح راستہ ان کے سامنے روشن ہے، خواہ وہ جماعت اسلامی سے وابستگی کی صورت میں ہو یا طلبہ کی تحریک سے تعلق کے نتیجہ میں ہو۔یہ سب دین ہے یہاں کے اساتذہ کی اس کے بالمقابل جیسا کہ میں واضح کر چکا ہوں کہ دیگر مدارس کے اساتذہ و طلبہ کسی مخصوص راہ کا تعین نہیں کر پاتے اب یہ یہاں کے طلبہ کا کام ہے کہ فراغت کے بعد اس متعین نصب العین پر کہاں تک گامزن ہوتے ہیں۔یا یہ کہ ہوئے بھی ہیں یا نہیں، میں بہت پر امید ہوں۔'' (حیاتِ نو، اگست ۱۹۷۹ء ص ۱۶)

مولانا اور تحریک اسلامی

تقریباً ایک صدی کے بعد جب مولانا مودودیؒ نے دعوت الی اللہ کی معتبر اور انقلابی آواز لگائی تو اس پر لبیک کہنے والے السابقون الاولون میں سے مولانا محترم بھی تھے، یہ انقلابی دعوت جب آپ کے کانوں تک پہنچی تو مولانا نے سنجیدگی سے اس کا جائزہ لیا۔قرآن و حدیث پر اسے پرکھا اور جب اس کا حق ہونا ان پر منکشف ہوا تو پھر کسی لومۃ لائم کی پرواہ کیے بغیر عملاً ''میدان جہاد'' میں کود پڑے۔انہوں نے اپنی جسمانی معذوریوں کو بہانا نہیں بنایا بلکہ ان کا تو یہ عزم تھا کہ جیسے بھی اور جس طرح بھی تحریک اسلامی کی خدمت کر سکتے ہیں کرتے رہیں اور خدا کے یہاں سرخروئی حاصل کریں۔

چنانچہ آپ نے اپنی تقریروں اور وعظ کے ذریعے، محققانہ علمی مضامین اور تصانیف کے ذریعہ، درس و تدریس کے ذریعے اپنی مخلصانہ دعاؤں کے ذریعے تحریک اسلامی میں اپنا رول ادا کیا اور اپنے شاگردوں (مولانا سید حامد علی، مولانا جلال الدین انصر عمری صاحب، مولانا فضل الرحمٰن فریدی صاحب، مولانا عبدالرشید عثمانی صاحب، مولانا یوسف اصلاحی صاحب، پروفیسر خورشید احمد و غفور احمد وغیرہم) کی ایک ٹیم تحریک اسلامی کے حوالے کی۔

مولانا کس طرح تحریک سے قریب آئے؟ ایک معتبر اور برسوں سے اشاعت دین کا فریضہ انجام دے رہے عالم دین (مولانا منظور نعمانی صاحبؒ) جن سے کہ خود مولانا کافی حد تک متاثر تھے، کے جماعت سے خروج کے باوجود کیونکر الجھن میں مبتلا ہوئے بغیر شامل ہوئے؟

اور جانے مانے شیوخ کے سیاسی فکر و عمل کے علی الرغم ایک ایسے آدمی کی دعوت قبول کیوں کی جس کو نہ دیکھا تھا اور نہ کسی قدر شناسائی تھی۔اس کی تفصیل خود مولانا نے وقتاً فوقتاً بتائی ہے۔وہ عجیب و غریب ہے جب کہ اس وقت دیگر قومی و وطنی تحریکیں جنم لے چکیں تھیں اور سواد اعظم کی حمایت انھیں حاصل تھی۔

مولانا مدارس نظامیہ کے متعلم تھے۔یہاں آپ کے ذوق ادب کی آبیاری تشنہ رہی۔اس کمزوری کی تلافی کے لیے دارالعلوم ندوۃ العلماء کا رخ کیا جہاں کی انجمن میں 'ترجمان القرآن' آتا تھا۔اس کو دلچسپی سے پڑھتے پھر سیاسی کشمکش اور رسالہ 'متحدہ قومیت' دیکھنے کے بعد مولانا کو اندازہ ہوا کہ ہندوستانی مسلمان کس خطرے سے دوچار ہیں اور ان کے شیخ کے سوچنے اور کرنے کا رخ صحیح نہیں ہے۔لیکن حد درجہ عقیدت و محبت قائم رہی۔پھر بریلی کے مدرسہ اشاعت العلوم کی معلّمی کے زمانے میں مولانا اپنا 'ترجمان القرآن' منگاتے رہے اور پڑھ پڑھ کر متاثر ہوتے رہے، جماعت اسلامی قائم ہو چکی تھی اور مولانا منظور نعمانی صاحب پورے زور و شور سے اس کی تبلیغ میں لگے تھے کہ بعض جزوی اختلاف کی وجہ سے یہ لوگ جماعت سے نکل گئے اور مولانا مودودی کے متعلق یہ شور ہوا کہ وہ امارت کے اہل نہیں، بے پرواہ اور سست ہیں۔یہ سن کر مولانا کو پریشانی ہوئی کہ ''دعوت تمام خواہد شد'' وہ مولانا منظور نعمانی صاحب سے ملے تو استفسار پر استغفر اللہ کہتے ہوئے فرمایا کہ یہ محض افترا پردازی ہے۔ساتھ میں مولانا سید حامد علی تھے جنھوں نے مزید سوالات پوچھے، واپسی پر ''شہادت حق'' نے کافی متاثر کیا اور بلا تاخیر جماعت میں شمولیت کی درخواست بھیج دی۔یہ اواخر ۱۹۴۲ء کا زمانہ تھا۔

شمولیت کے وقت ہی سے دونوں استاد و شاگرد نے اس مخالف ماحول میں کام شروع کر دیا۔مولانا نے مختلف مواقع پر جماعت کی ذمہ داریاں بھی نبھائی ہے۔دو مرتبہ ناظم علاقہ رہے، ایک مرتبہ تقسیم ہند کے بعد بالکل شروع میں بریلی کے اور بعد میں ۱۹۶۰ء کے لگ بھگ اعظم گڑھ کے ناظم علاقہ رہے ہیں اور معاونین کے ذریعہ کام کو وسیع کرنے کی کوشش کی، مجلس نمائندگان کے ممبر بھی رہے اور جماعت میں شمولیت کے بعد مولانا کا ہر عمل دعوتی تڑپ لیے ہوئے ہوتا تھا۔اسی فکر کی تعلیم دینا، دعوتی نوعیت کی کتابیں تصنیف کرنا، کام کی توسیع کے لیے مشوروں سے نوازنا آپ کی ہر ہر تحریر خدمت تحریک کے لیے رہی۔انھوں نے اپنے قلم کو استعمال کرتے ہوئے اس وقت فضا میں اچھالے گئے سوالات اور بوچھار کا دندان شکن جواب دیا جواب بھی 'الانصاف'، 'چٹان'، 'ایشیا'،

'تسنیم'، 'الحسنات' وغیرہ میں موجود ہے۔تحریک کے قائدین نے جب بھی کوئی خدمت لی، مولانا نے اپنی معذوری کے باوجود اس پر لبیک کہا مولانا مودودیؒ کا دارالاسلام بلانا جماعت کے ہر پروگرام میں شرکت کرکے پروگرام لینا، ثانوی درسگاہ اور مختلف امراءِ حلقہ کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے وہاں جا کر اپنی خدمات پیش کرنا تحریک اسلامی کے نصب العین کو پیش نظر رکھ کر نصاب کی تکمیل میں حصہ لینا، ہر لمحہ تحریک اسلامی کے کاز کے لیے کوشاں رہنا، اس کا منھ بولتا ثبوت ہیں۔آپ عالمی تحریکات اسلامی اور ان کی سرگرمیوں کا جائزہ لیتے رہتے تھے۔جس کی دلیل عالمی تحریکات اسلامی کے قائدین سے ان کے روابط ان کے پرچے منگانا اور ان کی معلومات کو فائل کرنے کا اہتمام ہے۔

تحریک اسلامی کی رفتار سے پوری طرح مطمئن تھے، اپنے احساسات بیان کرتے رہتے تھے کہ ''تحریک اسلامی کی رفتار ترقی ماشاء اللہ بہت زیادہ اطمینان بخش ہے۔آج جماعت ایک عظیم طاقت بن کر ابھر رہی ہے۔اس کی آواز دنیا کے کونے کونے تک پہنچ رہی ہے۔اس میں اللہ کے بندے مسلسل شامل ہو رہے ہیں۔آج سے تیس سال پہلے یہ آواز بہت نحیف و نزار تھی۔یہ نتیجہ ہے اللہ کے فضل و کرم اور کارکنان کے خلوص اور لگاتار محنت کا۔اس سلسلے میں یہ بات پیش نظر رہے کہ جماعت کی ترقی کا دارومدار امراء اور سربراہانِ جماعت پر ہے، امراء اقامت دین کے اس کام میں جس قدر دلچسپی کا مظاہرہ کریں گے، ارکان اس کی اسی قدر پیروی کریں گے، امراء کی حیثیت صحیح معنوں میں پاور ہاؤس کی ہے۔('حیات نو' اگست ۱۹۷۹ء ص ۱۱-۱۲)

یہی لگاؤ اور تڑپ تھی کہ حیدرآباد اجتماع عام کے موقع سے پیغام طلب کیے جانے پر آپ نے فرمایا تھا ''اپنے ساتھیوں کے لیے میرا پیغام یہ ہے کہ خدا کو اپنے ساتھ لیں، خدا کی معیت کا اپنے کو مستحق بنائیں۔اسی استحقاق کے بقدر خدا کی مدد ملے گی، کار دعوت میں برکت ہوگی، دعوت کو فروغ حاصل ہوگا، خدا غلطیوں سے محفوظ رکھے گا، اس کی مدد کے بغیر کچھ نہیں ہوسکتا۔سراپا دعا و فریاد اور سراپا دعوت بنیں۔(یادگار مجلہ، حیدرآباد ص ۴۷)

مولانا کی علمی خدمات

(۱) 'راہِ عمل' ۱۴۳۲، احادیث، ۱۹-ایڈیشن

(۲) 'زادِ راہ' ۱۴۵۰-احادیث، ۱۳-ایڈیشن

(۳) 'سفینۂ نجات' ۱۴۳۸-احادیث، ۳-ایڈیشن

یہ تینوں کتابیں مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی-۶ اور مکتبہ ذکریٰ رامپور سے شائع ہوئی ہیں۔

اس کے علاوہ جماعت اسلامی پاکستان کے اشاعتی ادارے نے بھی شائع کیا ہے۔

یہ تمام کتب برائے اصلاح و تربیت لکھی گئیں ہیں۔مضامین عام طور سے وہی ہیں، البتہ احادیث مختلف ہیں۔'زادِ راہ' میں آخری دو باب کا اضافہ ہے اور 'سفینۂ نجات' غیر مسلموں کو بھی سامنے رکھ کر ترتیب دی گئی ہے۔

(۴) 'تدبر قرآن پر ایک نظر' پورے تدبر قرآن پر جا بجا نشانات لگے ہوئے ہیں۔ تیاریاں تقریباً مکمل تھیں اور ترتیب کا کام جاری تھا۔سورہ اعراف آیت نمبر ۱۴۳ تک ہی کام مکمل ہوا تھا کہ داعی اجل کو لبیک کہا۔اس کا بیشتر حصہ (زندگی نو، ۱۹۸۱ء، ۱۹۸۳ء اور ۱۹۸۴ء) کے شماروں میں چھپ چکا ہے۔مکمل شکل میں زیر طبع ہے۔

(۵) 'نقوشِ راہ' اس میں مولانا کے متعدد دروس قرآن و حدیث کو جمع کیا گیا ہے۔جمع و ترتیب کی خدمت مولانا محمد رضی الاسلام ندوی نے انجام دی ہے، حال ہی میں مجموعہ اسلامک بک فاؤنڈیشن ۱۷۸۱ حوض سوئی والان نئی دہلی-۲ سے شائع ہوگیا ہے۔

(۶) 'نقوش و تاثرات' اس میں مولانا کے اہم مضامین کو اکٹھا کر دیا گیا ہے، یہ طبع ہوکر آگئی ہے، ادارہ علمیہ جامعۃ الفلاح بلریا گنج اعظم گڑھ نے اسے شائع کرایا ہے۔اس میں مولانا اختر احسن اصلاحیؒ پر 'نقوش و تاثرات'، 'مودودیؒ اور تحریک اسلامی'، 'جماعت اسلامی ہند اور سید سلیمان ندوی' شامل ہیں۔مؤخر الذکر (سید سلیمان ندویؒ) کی تحریروں سے ثابت کیا گیا ہے کہ تحریک اسلامی کوئی نئی چیز نہیں ہے۔

(۷) 'لغات عربی' اس میں تحقیقی انداز میں الف سے ت تک کام مکمل ہے۔

اسی طرح سید سلیمان ندویؒ کی کتاب 'لغات جدیدہ' پر ص ا سے ۲۲ تک حاشیہ لکھا ہوا ہے۔

'جمہرۃ اشعار العرب' کو مکمل طور سے تحقیقی انداز میں حل کر لیا تھا، نحوی اعتبار سے بھی اور نظائر و امثال کی شکل میں بھی یہ حاشیہ مختصر اور قیمتی اثاثہ ہے۔

اس کے علاوہ مسودات میں 'تقصیرات تفہیم' پر نشانات اور نوٹس موجود ہیں۔عربی کے ابتدائی طلبہ کے لیے 'عربی ادب' پر مفعول مطلق تک کی بحث بھی لکھ رکھی ہے۔'حدیث خواتین کا بیشتر حصہ مسودہ کی شکل میں لکھا رکھا ہوا ہے۔

تربیتی انداز کا قرآنی آیات پر مشتمل ایک مجموعہ جس کا بیشتر حصہ تیار ہو چکا تھا، تکمیل کی راہ تک رہا ہے۔

اسوۂ نبوی اور اسوۂ صحابہ پر مکمل کتاب لکھنے کا ارادہ تھا۔ کچھ حصہ تیار تھا جو 'راہِ عمل' وغیرہ میں آچکا ہے۔

اس کے علاوہ الانصاف، دعوت، الحسنات، زندگی نو، حیات نو، ذکریٰ، حجاب، الایمان، تسنیم، چٹان، کوثر وغیرہ میں دعوتی نوعیت کے دروس قرآن وحدیث اور ابتدائی دور کے علمی، ادبی اور تنقیدی مضامین ہیں۔

بخاری کے کتاب الحیل کو مکمل طور سے حل کر کے اس کا الگ سے مسودہ تیار تھا۔

مسودات میں مختلف علماء کبار کی اہم باتیں اور اخبار ورسائل کی اہم خبروں پر نوٹ یا کٹنگ موجود ہیں۔

انھوں نے مختلف کتابوں پر نظر ثانی کیا تھا مثلاً 'مصباح اللغات، محاسن الشعراء، القرأۃ العربیہ وغیرہ اور تعلیم النحو از مولانا ایوب اصلاحی پر مقدمہ لکھا تھا، اس کے علاوہ 'آسان تفسیر پارہ عم' عبدالحیؒ کا پہلا نصف حصہ ان کی مکمل رہنمائی میں لکھا گیا تھا، بلکہ اکثر باتیں آپ کی ہیں۔

اور سب سے اہم یہ کہ وہ 'قرآن مجید' اب بھی موجود ہے جس میں مولانا اختر احسن اصلاحیؒ سے استفادہ کر کے نوٹ لکھ لیا تھا۔ یہ بھی مفید اثاثہ ہے۔

مولانا کے اساتذہ کرام

مولانا کے اساتذہ کی تعداد تو بہت ہے اور ان میں سبھوں سے کسی نہ کسی حیثیت میں آپ متاثر تھے۔ یہاں مولانا کے نامور اساتذہ کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

(۱) جناب ریاست علی صاحب مرحوم، متوفی ۱۹۷۴ء یہ مولانا کے آبائی گاؤں کرمینی کے تھے۔ ان کی تعلیم مڈل تک تھی۔ آپ مولانا کے استاد اول تھے، جنھوں نے مولانا کو قلم پکڑنا سکھایا اور ناظرہ سے لے کر درجہ دو تک کی تعلیم دی۔

(۲) مولانا علیم اللہ صاحب، مولانا نے ان سے ہدایۃ النحو اور کافیہ کے ساتھ ساتھ صرف و نحو کی تقریباً پوری تعلیم حاصل کی تھی۔

(۳) مولانا شبیر احمد عثمانی (۱۳ر دسمبر ۱۸۷۷ء-۱۹۴۶ء) علم وفضل، فہم وفراست، تدبر اور اصابت رائے کے لحاظ سے ہندوستان کے چند مخصوص علماء میں سے تھے۔ یہ شیخ الہند کے ترجمۂ قرآن کے محشی بھی ہیں۔ انہوں نے مولانا کو حدیث وقرآن کا درس دیا۔ بخاری اور جلالین کے استاد تھے۔ مولانا کے شیخ بھی تھے اور مولانا پر نظر عنایت تھی، خصوصی درس بھی دیتے تھے۔

(۴) مولانا عبدالرحمان صاحب امروہوی محشی تفسیر بیضاوی (۱۲۷۷ھ-۱۳۶۷ھ) تفسیر میں ان کو خاص کمال تھا۔ جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں مولانا کو بیضاوی کا درس دیا تھا۔ حدیث و فقہ کے ممتاز علماء میں سے تھے۔ بیضاوی کے علاوہ مطول اور مختصر المعانی پر بھی حواشی ص ۵، ۶۵، ۶۸، ۷۳، لکھے ہیں۔

(۵) مولانا بدر عالم صاحب فیض الباری (۱۸۹۸ء-۱۹۶۹ء) یہ عابد وزاہد، ذکی وفقیہ فی الدین اور صاحب معرفت فاضل تھے، جامعہ اسلامیہ ڈابھیل اور دیوبند میں مولانا کو حدیث کا درس دیا تھا۔ یہ علامہ انور شاہ کشمیری کے شاگرد رشید تھے اور ان کے علوم ومعارف کو 'فیض الباری' کے نام سے تحریر کیا تھا۔ اس کے علاوہ 'ترجمان السنۃ' بھی تحریر کیا تھا۔

(۶) مولانا اعزاز علیؒ صاحب المتوفی (۱۳۷۴ھ) فقہ وادب خاص موضوع تھا۔ ان کو عربی نظم ونثر پر کامل دستگاہ حاصل تھی، مولانا کے ادب کے استاد تھے اور ادب کی تشویق فرماتے رہے تھے۔ آپ کو انہیں کی بدولت ادب کا ذوق پیدا ہوا۔ اس میں مہارت ہوئی اور عبور حاصل ہوا۔ ہمیشہ ان کا نام احترام سے لیتے اور نام آنے پر سراپا عجز واحترام بن جاتے۔

(۷) مولانا اختر احسن صاحب اصلاحیؒ (۱۹۰۱ء-۱۹۵۸ء) علامہ فراہیؒ کے شاکر وصابر شاگردوں میں سے تھے۔ مولانا نہ تو بہترین خطیب تھے نہ مصنف، لیکن بہترین معلم تھے۔ یہ اپنے تمام ہم عصروں میں قرآن میں گہرائی اور گیرائی کے لحاظ سے بہت آگے تھے، ان کو سب سے زیادہ قرآن سے عشق تھا، بے نمازی کا اعتبار نہ کرتے تھے۔ مولانا فراہیؒ کے فیض صحبت اور اپنی محنت کی بدولت قرآن اور جاہلی کلام پر گہری نظر رکھتے تھے۔

سب سے زیادہ مولانا اختر احسن صاحب اصلاحیؒ سے متاثر تھے۔ وہ معروف معنوں میں مولانا کے استاد تو نہ تھے اور نہ ہی یہ شاگرد تھے، لیکن مولانا کو ان کی معیت وصحبت سے بڑا فائدہ پہنچا۔ انہیں کے فیض کا نتیجہ تھا کہ قرآن کے بے نظیر عالم ہوئے اور قرآن سے خصوصی شغف پیدا ہوا۔

اس کے علاوہ مولانا عبدالرحمٰن کاشغری ندوی اور مشہور زمانہ ادب وانشاء کے ماہر مولانا محمد ناظم ندویؒ سے فیض صحبت رہا اور ادب وانشاء میں انہی کی بدولت وہ رنگ چڑھا کہ خاص عربیت کا گمان ہوتا تھا۔

مولانا کے اہم شاگرد

مولانا اپنے پاس ہر چیز کا جوڑ رکھتے تھے مگر وہ خود تنہا تھے۔ تمام عمر مجرد رہے۔ انہوں نے

شادی نہیں کی تھی۔ شاید اس لیے کہ وہ جسمانی طور پر معذور تھے۔ ان کے رفقاء نے ان کی شادی کرانے کی کوشش ضرور کی مگر وہ تیار نہ ہوئے یا تیار ہوئے بھی تو اعزہ واقرباء آڑے آئے، چنانچہ ان کی صلبی اولاد تو نہ تھی مگر مولانا علمی اعتبار سے کثیرالاولاد شخصیت تھے۔ ان کے شاگرد جن کو وہ اولاد کی طرح چاہتے تھے، سیکڑوں کی تعداد میں ملک و بیرون ملک دین کی بہترین خدمات انجام دے رہے ہیں اور نہ صرف یہ کہ مولانا کا نام روشن کررہے ہیں بلکہ وہ مولانا کے لیے صدقہ جاریہ کا کام کررہے ہیں۔ مولانا کے مشہور تلامذہ حسبِ ذیل ہیں:

۱- مولانا سید حامد علی: آپ جماعتِ اسلامی ہند کے سکریٹری رہے، آپ نے باطل تحریکات ونظریات اور عقائد کا گہرا تقابلی مطالعہ کیا تھا اور بہتیری مفید کتب اس سلسلے کی چھوڑی ہیں۔ آپ ماہر تعلیمات، ادیب اور قرآن کے سچے عاشق ورمز شناس اور بے نظیر تفسیر فی ظلال القرآن کے مترجم بھی ہیں۔ بے پناہ دعوتی تڑپ رکھتے تھے اور اسی میں ساری عمر کھپادی۔

۲- جناب مولانا جلال الدین انصر عمری صاحب: انہوں نے مولانا سے سبقاً سبقاً گیارہ بارہ پارہ تک پڑھا تھا۔ (اس وقت امیر جماعت اسلامی ہند) اہم موضوعات پر کئی کتب قبولِ عام حاصل کرچکی ہیں اور برصغیر بلکہ عالم اسلام کے مستند عالم دین شمار کیے جاتے ہیں۔ آپ جماعت کے شعبۂ تحقیق وتصنیف کے ڈائرکٹر ہیں اور جامعۃ الفلاح بلریا گنج، اعظم گڑھ کے شیخ الجامعہ بھی۔

۳- ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی صاحب: یہ تحریک کے قدیم اور اہم کارکن ہیں۔ اس وقت جدید معاشیات کو اسلامائز کرکے اس کے عملی پروگرام پر عمل درآمد کی کوششوں میں مصروف ہیں اور قدیم وجدید پر عبور حاصل ہے۔ عالم اسلام ہی نہیں دنیا کے ممتاز معاشی دانشور سمجھے جاتے ہیں بلکہ اس پر اتھارٹی ہیں۔

۴- ڈاکٹر فضل الرحمٰن فریدی صاحب: آپ جماعت اسلامی ہند کی مرکزی مجلس شوریٰ کے اہم کارکن اور حالاتِ حاضرہ پر پوری طرح تیار تھے۔ انہوں نے معاشیات میں ڈاکٹریٹ کررکھا تھا اور جدید معاشی رجحانات کو اسلامائز کرنے کا اہم کام کیا ہے۔ 'زندگی نو' کے ایڈیٹر بھی تھے۔

۵- سید ابوسعید عابدی: انہوں نے علامہ فراہیؒ پر پی ایچ ڈی کیا ہے اور اس وقت جدہ ریڈیو پر اپنے کمالات اور فن کا مظاہرہ کررہے ہیں۔ انہوں نے ادبی دنیا میں اپنا مقام بنایا ہے۔ ان کے مقالہ میں مولانا نے بھرپور تعاون کیا تھا جس کا تذکرہ مقدمہ میں ہے۔

۶- ڈاکٹر عبدالباری شبنم سبحانی صاحب: یہ اس وقت عربی واردو کے ممتاز ناقدین میں

سے ہیں اور اتھارٹی سمجھے جاتے ہیں۔ جماعت کے شعبۂ ادارۂ ادب اسلامی کے سربراہ بھی ہیں۔

ان کے علاوہ ڈاکٹر محمد عنایت اللہ اسد سبحانی صاحب، ڈاکٹر خالد سیف اللہ فلاحی صاحب ڈاکٹر حبیب اللہ صاحب (استاد شکاگو یونیورسٹی)، مولانا ظفر احمد اثری فلاحی صاحب (لندن)، مولانا نسیم احمد غازی فلاحی صاحب، ڈاکٹر عبیداللہ فہد فلاحی صاحب وغیرہم غرض کہ سیکڑوں کی تعداد میں پوری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں اور ان کا شمار علماء کبار میں ہوتا ہے۔ یہ سب مولانا کے مشن کو پھیلانے میں سرگرداں ہیں۔

آخری سفر

آپ ذیابیطس کے مستقل طور پر مریض تھے۔ عام طور سے سر میں درد بھی رہا کرتا تھا۔ یہ جان لیوا مرض ۱۹۶۰ء سے ہی زور پکڑ چکا تھا حتی کہ ۱۹۶۵ء کے بعد تو اس نے سنگین رخ اختیار کرلیا تھا اور پیشاب بالکل شیرہ کی مانند ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ اس پر چیونٹے لگ جاتے تھے۔ رات میں باربار معذور شخص کے لیے جاگنا اور چلنا ایک اہم مسئلہ تھا۔ اس حالت میں رہائش سے ملحق استنجا خانہ کا نظم معمولی سی بات تھی لیکن کبھی بھی اپنی لاچاری کا حوالہ دے کر اس کا مطالبہ نہیں کیا بلکہ اپنے پاس ایک ٹین کا ڈبہ رکھتے تھے اور یورین پاٹ کے ذریعہ پیشاب اس میں جمع کرتے رہتے تھے۔ رات کے تیسرے پہر پیشاب کو باہر پھینک کر، ڈبہ دھوکر کمرے میں رکھ دیا جاتا تھا اور وہ کپڑے سے مستور رہا کرتا تھا۔ یہ سلسلہ زندگی بھر جاری رہا اور ادھر کئی سالوں سے بدن کا گوشت بہت کم رہ گیا تھا مزید ستم یہ ہوا کہ اس رہے سہے مفلوج پیر میں بھی زخم ہوگیا تھا، جس سے ضروریات سے فراغت بھی ایک اہم مسئلہ بن گیا تھا مگر یہ سارے امراض ان کے بے پناہ شوق مطالعہ اور جواں عزم کو کبھی شکست نہ دے سکے۔ وہ عام دنوں میں بھی بکثرت قرآن کا مطالعہ فرماتے اور خصوصاً رمضان المبارک میں تو ان کا تمام وقت مطالعہ قرآن ہی میں گزرتا اور کمرے میں ان کی چارپائی کے اردگرد مختلف مفسرین کی قدیم وجدید تفسیریں رکھی رہتیں، جنہیں وہ تحقیق وتنقید کی نظر سے دیکھتے اور نوٹس لکھتے رہتے تھے۔

۵/رمضان المبارک کا دن تھا، وہ بالکل ٹھیک تھے۔ سارے کام روزانہ کے معمول کے مطابق طے پارہے تھے۔ سحری معمول کے مطابق کھائی۔ نماز کمرے میں ادا کی۔ کچھ مہمان آئے ہوئے تھے، انہیں رخصت کیا اور اپنے شاگرد رشید برادر شہاب الدین جو اس وقت ان کی خدمت کررہے تھے، کو بازار ٹارچ اور فلاح کی ڈاک لانے کے لیے بھیجا، خود مطالعہ میں مشغول ہوگئے۔ قریب ہی فرش پر بیٹھے محترم شارق انصار اللہ صاحب فلاحی 'تدبر قرآن' پڑھ رہے تھے۔ مولانا اس

وقت تدبرقرآن پر کچھ نوٹس لکھ رہے تھے اور جب مطالعہ کرتے کرتے تھک گئے تو اپنے خاص انداز میں کسی نکتہ کو سوچنے کے لیے لیٹ گئے۔ برادر شارق صاحب بتاتے ہیں کہ مولانا لیٹے اور سو گئے۔ سانس تیز تیز آرہی تھی، انہوں نے سمجھا کہ مولانا گہری نیند سو رہے ہیں (ممکن ہے کہ یہ موت سے پہلے کی چند اکھڑی اکھڑی سانسیں رہی ہوں، برادر موصوف ایسا سوچ بھی نہیں سکتے تھے کیونکہ یہاں کوئی ایسا قرینہ تھا ہی نہیں)۔ اسی دوران برادر شہاب الدین ڈاک اور ٹارچ لے کر آگئے۔ انہوں نے مولانا کو پکارا مگر انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بلکہ ہچکی لی اور ان کی حالت متغیر ہوگئی۔ انہوں نے دو اور ہچکیاں لیں اور اس طرح قرآن کا یہ شیدائی عین روزے کی حالت اور قرآن کے سائے میں ۵/رمضان المبارک ۱۴۰۱ھ بمطابق ۸/جولائی ۱۹۸۱ء بروز بدھ صبح دس بج کر پینتالیس منٹ پر اپنے رب حقیقی سے جاملا اور جسد خاکی 'کل نفس ذائقۃ الموت' کی تفسیر پیش کر رہا تھا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ یہ طلبہ گھبرائے اور دوسروں کو پکارا۔ موقع پر موجود تمام لوگ پہنچے اور اپنی سی تدبیر کرنی چاہی لیکن جو کچھ ہونا تھا وہ تو ہو چکا تھا اور خدا مست کی یہ دعا مقبول ہو چکی تھی کہ 'خدا اچانک اٹھا لے، ورنہ چارپائی پکڑ لی تو بڑی پریشانی ہوگی''۔ خدا نے تمام پریشانیوں سے نجات دے دی تھی۔ جنگل کی آگ کی طرح مولانا کے موت کی خبر آناً فاناً ہر طرف پھیل گئی۔ جس نے جہاں سنا دل تھام کے رہ گیا کہ وہ اس خبر کو سننے کے لیے تیار نہ تھا۔ پھر ایک خلقت جمع ہوگئی مولانا کو ایک نظر دیکھنے کے لیے اور اپنے گرم گرم آنسوؤں کا نذرانہ پیش کرنے کے لیے۔

دوسرے دن صبح دس بجے مولانا کے شاگرد رشید اور عزیز مولانا احمد محمود کوثر اصلاحی صاحب سابق نائب ناظم مدرسۃ الاصلاح نے نماز جنازہ پڑھائی۔ سیکڑوں عقیدت مند شریک جنازہ تھے اور مولانا کی وصیت کے مطابق ان کی آخری آرام گاہ دارالاقامہ کے جنوب میں ٹیوب ویل کے سامنے نیم کے درخت کے سائے میں بنائی گئی۔ اللہ تعالیٰ ان پر اپنی رحمتوں کی بارش کرے۔ آمین!

آبروئے چمن، گل سرسبد اور عاشق قرآن کی موت بڑی قابل رشک تھی۔ مرحوم کا انتقال ۱۰/بج کر ۴۵ منٹ پر ہوا۔ اس سے پہلے چند لمحے قبل وہ 'تدبر قرآن' پر تبصرہ کر رہے تھے۔ ان کی آخری تحریر یہ ہے جو ان کے انتقال سے چند لمحے قبل کی ہے:

''سورہ اعراف آیت ۱۴۹ میں وسقط فی ایدیھم'' کا جملہ آیا ہے جس کا ترجمہ مولانا نے یہ کیا ہے کہ ''اور جب ان کو تنبہ ہوا'' اور تشریحی حصہ میں فرماتے ہیں ''وسقط فی ایدیھم'' عربی زبان کا محاورہ ہے جس کے معنی عام طور سے نادم اور خجل ہونے کے لیے گئے ہیں لیکن ندامت اور خجالت کا

لازم چونکہ غلطی پر تنبہ ہونا بھی ہے اس وجہ سے اس کا ترجمہ تنبہ ہونا کیا جائے تو میرے نزدیک غلط نہ ہوگا۔ اس محاورے کی اصل کیا ہے؟ اس بارے میں اہل لغت کا اختلاف ہے اور یہ اختلاف قدرتی نتیجہ ہے، اس بات کا کہ محاورے کی اصل تحقیق بڑا مشکل کام ہے۔ مجھے کبھی کبھی خیال ہوتا ہے کہ کسی چیز کا ہاتھ میں گرایا جانا گویا اس کا سامنے آجانا ہے۔ ایسی حالت میں ایک غبی بھی اس پر متنبہ ہو جاتا ہے، اس لیے کہ ہاتھ کے کنگن کے لیے آرسی کی ضرورت نہیں ہوتی''۔ (تدبر دوم ص ۷۴۲)

مولانا کا جب انتقال ہوا تو وہ اس وقت تفسیروں میں گھرے ہوئے تھے۔ سر کے دائیں جانب چارپائی ہی پر مذکورہ آخری تحریر اور تدبر قرآن جلد دوم موجود تھی۔ بائیں طرف تدبر کا کچھ حصہ تھا۔ چارپائی کے پاس ایک اسٹول پر تدبر قرآن کا پورا سیٹ، سرہانے الماری میں کچھ دوسری تفسیریں (کشاف، بیان القرآن، فتح القدیر، تفسیر ماجدی) اور بخاری کی دو جلدیں موجود تھیں۔ دائیں جانب ہی تفہیم القرآن کی ساری جلدیں، تفاسیر فراہیؒ، فی ظلال القرآن اور قرآن سے متعلق بعض دوسری کتابیں تھیں۔ اس طرح قرآن کے شائق کی موت قرآن کی تفسیروں کے درمیان واقع ہوئی۔ کتنی قابل رشک ہے اس شخص کی موت جس نے عمر بھر قرآن پر غور وفکر کیا اور اس کے بیکراں اور اتھاہ سمندر سے بڑے قیمتی اور آبدار موتی نکالے۔

خاتمہ

مولانا ہمہ گیر اور گوں ناگوں شخصیت کے مالک تھے۔ میں نے بالاختصار مولانا کی زندگی کے اہم گوشوں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ مولانا کے شاگرد جو پوری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں، علماء کبار میں شمار کیے جاتے ہیں اور ان کے افکار کے وارث ہیں اب یہ ان کی ذمہ داری ہے کہ ان کے افکار و باقیات کی حفاظت اور توسیع واشاعت کے لیے سرگرم عمل ہو جائیں۔

مولانا ایک اچھے معلم، ادیب، مفسر، محدث و داعی تھے۔ وہ ہمارے درمیان ایک شمع کی طرح تھے، جو اپنے جگر کا تیل جلا کر اب خاموش ہو چکی ہے۔ اب یہ ان کے شاگردوں کا کام ہے کہ دنیا کے گھپ اندھیرے میں ان کی آرزوؤں کے مطابق افکار قرآنی کے چراغ روشن کریں۔ انہوں نے قرآن کو سمجھنے کے لیے ایک جوت جگائی تھی۔ اسے زندہ رکھنے اور بڑھانے کی ضرورت ہے تاکہ برصغیر ہند و پاک میں قرآن فہمی کی زندہ و پائندہ بنیاد بن سکے۔

اخیر میں مولانا کا ایک اہم پیغام تحریر کرتا ہوں جو مدارس عربیہ کے طلبہ کے لیے مشعل راہ ہے، ''نفس امارہ کی پرشور آواز کے لیے کان بند کر کے محنت سے دین کا علم حاصل کیا جائے۔

عمدہ استعداد وصلاحیت، تدریسی، تالیفی، تقریری کونصب العین قرار دے کر کڑی محنت کی جائے، اس عزم کے ساتھ کہ ''یا تن رسد بہ جاناں، یا جاں زتن برآید''۔

ہر حلقے میں استعداد و قابلیت ہی کی آج بھی پوچھ ہے، جدید تعلیم کے حلقے میں بھی، دینی تعلیم کے دائرے میں بھی۔ غیر قابل کی کہیں پوچھ نہیں اور قابل آدمی ہر جگہ اپنا مقام پالیتا ہے، ''پس کسب کمال کن کہ عزیز جہاں شوی''۔

ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں کہ ''اپنے کو پہچانو، صلاحیت پیدا کرو۔ قابل بنو تو ہر جگہ پوچھے جاؤ گے۔ معاشی مستقبل کی تاریکی کے چکر میں نہ پڑو۔ اپنے کام میں لگو، اپنا کام ٹھیک سے کرو اور اس چیز کی فکر اپنے سر نہ لو جس کی ذمہ داری اللہ نے لے رکھی ہے۔ (ذکریٰ، رامپور۔ دسمبر ۱۹۷۳ء ص ۲۱-۲۵)

خدائے رحیم سے دعا ہے کہ استاد محترم کی قبر کو نور سے بھر دے اور ان کے افکار کے وارثوں کو اپنی ذمہ داریوں کا احساس عطا فرمائے۔ آمین

☆☆☆

LANGUAGE PRESIDE

Providing Translation, Interpretation, Graphic Design and Website Design in all Indian as well as mostly in all foreign languages.

Contact Person: Abdul Khalique Falahi

Contact No.: +91 2226478026

Cell. +919322012072, 9220524649

Email: info@languagepreside.com

Website: www.languagepreside.com

بیاباں کی شب تاریک میں قندیل رہبانی

(مولانا جلیل احسن ندوی سے انٹرویو)

حفیظ الرحمٰن فلاحی ☆

ہم مشرقیوں کی یہ افسوسناک روایت رہی ہیکہ ہم زندہ اشخاص کی قدر کرنے کے بجائے مرحومین کی قبروں پر فاتحہ خوانی، ان کی شخصیت، سیرت و کردار اور فکر و نظر کو اجاگر اور نمایاں کرتے ہیں، تحریک اسلامی کے یہاں تو زندہ شخصیتوں کی قدر افزائی کے معاملہ میں اور بھی زیادہ بے پروائی اور غفلت کا ثبوت دیا جارہا ہے، حالانکہ اگر ان زندہ شخصیتوں کو اعتدال و توازن کے ساتھ اجاگر کیا جائے تو اس کارواں کے بہت سے درماندہ راہرو اپنے لیے جیتی جاگتی مثالیں اپنے سامنے رکھ سکتے ہیں، یہی وہ احساس تھا جس نے مجھے تحریک کے ایک قدیم کارکن، ایک بہترین عربی ادیب مولانا اختر احسن اصلاحی کے ممتاز خوشہ چیں مفسر مولانا جلیل احسن ندوی مدظلہ العالی سے انٹرویو لینے پر آمادہ کیا۔

میں نے سوچا کہ اس طرح مولانا کی ہمہ گیر شخصیت کے کچھ پوشیدہ گوشے اجاگر ہوں گے اور بہت سی مفید معلومات سامنے آئیں گی، چنانچہ میں نے اس ارادہ کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا ارادہ کرلیا۔ میرے خیالات کی رو ابھری اور میں نے ایک مختصر سوال نامہ مرتب کر ڈالا، کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ مولانا اسے بھی اپنے لیے بارگراں سمجھیں گے، اپنی بیماریوں اور کمزوریوں کو پیش کریں گے۔ پیہم اصرار کا سامنا کرنا ہوگا، سوالنامہ مرتب کرتے وقت مجھے کافی دقت کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ مولانا محترم کی شخصیت مختلف حیثیتوں کے تحت گھومتی ہے۔ ایک عربی طالب علم کی حیثیت سے، دینی درسگاہ کے مدرس کی حیثیت سے، ایک اچھے حدیث داں اور مترجم کی حیثیت سے، پھر سب سے بڑھ کر دنیا کی سب سے عظیم اور انقلابی تحریک کے کارکن کی حیثیت سے، یہ تمام حیثیتیں مولانا کو گھیرے ہوئے

☆ ریاض

ہیں، لہٰذا میں نے سوچا کہ ان تمام حیثیتوں پر مفصل گفتگو تو ناممکن رہے گی، البتہ بالا اختصار مولانا کی زندگی کے اہم گوشوں کو اجاگر کرانے کی کوشش کروں گا۔

حسب وعدہ میں مولانا کے کمرے میں حاضر ہوا، مولانا کے کمرے میں داخل ہوتے ہی ایک طرح کی خاموشی چھا جاتی ہے، علمی ماحول پیدا ہو جاتا ہے، کمرے کے بائیں جانب کتابوں کی الماریاں ہیں جن میں ضخیم، قیمتی اور مفید کتابیں قرینے سے سجی ہوئی ہیں، کمرے کے بیچ میں وہ چارپائی بچھی ہوئی ہے جس پر مولانا آرام فرماتے ہیں، مطالعہ کرتے ہیں، ملاقاتی پہلے ہی لمحہ اس حقیقت کا اندازہ لگا لیتا ہے، اس پر روزانہ کی ڈاک سے آئے ہوئے رسالے، اخبارات اور دیگر مفید کتابیں رکھی ہوئی ہیں۔

مولانا میری آمد کا مقصد سمجھ چکے تھے، میں اطمینان سے بیٹھا۔ انھیں کی اجازت پر میں نے سوال کیا۔

س: ابتدائی زندگی کے دلچسپ اور سبق آموز واقعات، تعلیم و تربیت کے مراحل، بالخصوص قرآن سے آپ کی رغبت اور اس کے اسباب؟

ج: مولانا محترم نے میرے سوال کو غور سے سنا، کچھ دیر خاموشی کے بعد اپنی زندگی کا پہلا اور سب سے اہم ورق الٹا۔

میری ابتدائی زندگی کے دلچسپ اور سبق آموز واقعات میں سب سے پہلا واقعہ یوں ہے۔

میں یہیں بلریا گنج میں مڈل اسکول میں پڑھتا تھا یہاں سنیچر کی دوپہر کو چھٹی ہو جاتی تھی۔ ایک دن کا واقعہ ہے کہ سنیچر کی دوپہر کو چھٹی ہوئی تو میں اکیلا اپنے گاؤں جانے لگا، بلریا گنج چوک سے آگے ایک پختہ بڑا کنواں اور اس کے قریب آموں کا ایک چھوٹا سا باغ تھا، (اب نہ تو وہ باغ ہے اور نہ وہ کنواں) میں جب اس کنوئیں کے محاذ میں پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ گرمی کی اس تیز اور چلچلاتی دھوپ میں ایک آدمی کنویں کی جگت پر اکڑوں بیٹھا ہوا ہے۔ میں اکیلا اور آس پاس کوئی آدمی نہیں، اس آدمی نے اشارہ سے مجھے اپنی طرف بلایا، میں ڈرا کہ یہ یا تو مجھے کنویں میں ڈال دے گا یا قتل کر دے گا، بہر حال ڈرتے ڈرتے اس کی طرف بڑھا، جب کنویں کے قریب پہنچا تو اس نے جلتی ہوئی جگت پر اپنا بڑا سا گمچھا جو سفید چھالٹین کا تھا بچھا دیا اور اشارے سے بیٹھنے کو کہا۔ اب میری جان میں جان آئی، جب میں اس کے قریب بیٹھ چکا تو اس نے دیہاتی زبان میں پوچھا: ’’بیٹے! تمہارے

اس تھیلے میں کیا ہے؟‘‘ میں نے کہا: ’’کتابیں ہیں۔‘‘ پھر پوچھا: ’’کہاں پڑھتے ہو؟‘‘ میں نے اپنے ہاتھ سے مڈل اسکول کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ ’’وہاں پڑھتا ہوں‘‘۔ (اس وقت مڈل اسکول کی عمارت آبادی نہ ہونے کی وجہ سے صاف دکھائی دیتی تھی) اتنا سننا تھا کہ اس کے چہرے پر ناگواری کے اثرات ظاہر ہونے لگے، اس نے کچھ دیر توقف کیا، پھر دیہاتی زبان میں کہنا شروع کیا۔ ’’یہ پڑھائی کس کام کی؟ اس سے کیا فائدہ؟ بیٹے! تم تو وہ پڑھائی کرو جس سے قرآن کے معانی ومطالب سمجھ میں آسکتے ہوں۔‘‘ دیہاتی کی یہ موثر اور درد بھری بات میرے دل میں گھر کر گئی اور مجھے ایسا لگا جیسے کوئی بہت بڑی دولت مل گئی ہو۔ میں نے بے چینی کے ساتھ پوچھا کہ ’’وہ کون سی پڑھائی ہے جس سے قرآن مجید کو سمجھا جا سکتا ہے؟‘‘ اس نے براہِ راست جواب دینے کے بجائے یہ کہا کہ: ’’تم یہاں سے ٹانڈہ چلے جاؤ، وہاں جا کر پہلے قرآن شریف حفظ کرو، اس کے بعد فارسی پڑھنا پھر اس کے بعد عربی سیکھنے کا نمبر آئے گا۔ جب عربی پڑھو گے تو قرآن شریف کا مطلب سمجھ پاؤ گے‘‘ یہ کہہ کر دیہاتی نے مجھے دعا دی اور رخصت کیا۔ دیہاتی سے رخصت ہو کر میں گھر پہنچا، گھر پر دن رات بے چینی کا عجب عالم رہا ہر وقت یہی سوچتا رہتا کہ کس طرح ٹانڈا پہنچوں، کس سے معلومات حاصل کروں اور کس سے مدد لوں، پیر کے دن اسکول واپس آیا تو بھی بے چینی کی یہی کیفیت طاری رہی، میں تمام ساتھیوں سے الگ الگ رہتا، ہر وقت خاموش خاموش رہتا اور طرح طرح کے پروگرام بناتا ،اب نہ وہ خوش گپیاں تھیں اور نہ ہی پڑھنے میں دل لگتا تھا، ساتھی پوچھتے تو انھیں کیا بتاتا۔

آخر کار ایک دن یہ تمنا بر آئی اور ٹانڈے کے سفر پر روانہ ہو گیا، گھر کی معاشی حالت بہت خراب تھی، والد صاحب کا انتقال ہو چکا تھا، میں نے حسب پروگرام پہلے قرآن شریف حفظ کرنا شروع کیا، رات دن محنت کرتا۔ یہ میری مسلسل محنت ہی کا نتیجہ تھا کہ میں نے ایک سال میں ۲۰ پارے یاد کیے اور پندرہ مہینے میں پورا قرآن یاد کر ڈالا۔ اس کے بعد فارسی کا سلسلہ چلا اور اپنی مجنونانہ محنت سے تین سال کی فارسی ایک سال میں پڑھ ڈالی۔ اس کے بعد عربی کا نمبر آیا، میں نے جس دن عربی شروع کی ہے وہ دن میری زندگی کا سب سے زیادہ پر مسرت و پر کیف دن تھا، میں خوشی سے پھولا نہ سماتا تھا، اس طرح میں عربی پڑھنے لگا، لیکن درجے کے ساتھی خوشحال گھرانے سے تعلق رکھتے تھے ،اس لیے وہ پڑھائی کی طرف سے بے توجہی برتتے، ہر وقت کھیل میں مصروف رہتے، جو کام دیا جاتا اس کو نہ کرتے، کوئی چیز یاد کرنے کے لیے دی جاتی تو یاد نہ کرتے، پڑھائی کی رفتار بہت سست اور مایوس کن تھی، میں اس حالت سے بہت پریشان رہتا۔ ایک دن میں نے اپنے استاد

سے رو رو کر یہ کہا ''سبق بہت کم ہو پاتا ہے، یہ کھلاڑی لوگ ہیں، میں پڑھنے کی خاطر تمام مشقتیں جھیل کر اپنا وطن چھوڑ کر آیا ہوں، میں ان کے ساتھ کس طرح چل سکوں گا۔ استاذ محترم نے میرے اس شدت شوق کو دیکھ کر مجھے خالی اوقات میں پڑھانا شروع کر دیا، اب میں اور زیادہ محنت کرنے لگا لیکن اس کے بعد تعلیم کی رفتار بتدریج کم ہوتی چلی گئی۔

مولانا کے اس جملے کو سن کر میں حیرت واستعجاب کے عالم میں مولانا کو دیکھنے لگا، قبل اس کے کہ میں کچھ کہوں، مولانا میری حیرت کو بھانپ چکے تھے، انھوں نے کہا کہ تعلیم کی رفتار میں کمی کی وجہ دراصل معاشی تنگی اور حد سے زیادہ محنت تھی۔ میری صحت پر اس محنت کا بہت برا اثر پڑا۔

مولانا اپنی زندگی کا ایک اہم ورق الٹ چکے تھے، میں کامل توجہ اور انہماک کے ساتھ مولانا کی گفتگو کو سن رہا تھا، مولانا خاموش ہو چکے تھے۔ میری پیاس اور بڑھی اور میں نے اسی واقعہ کے متعلق سوال کیا۔

س: مولانا! آپ کا یہ محسن جس نے آپ کی زندگی میں ایک عظیم انقلاب برپا کیا ہے، کون ہے؟

ج: مولانا نے میرے اس سوال پر انتہائی چونکا دینے والا جواب دیا۔

میری زندگی کا اتنا عرصہ بیت چکا ہے، میں ہمیشہ اس کی تلاش میں رہا لیکن میں اسے پانے میں ناکام رہا، میرا محسن جس سے زیادہ پراثر اور دردانگیز بات میں نے آج تک نہیں سنی، نہ جانے کون ہے؟ کہاں رہتا ہے؟ کیا کرتا ہے؟ اس سلسلے میں مجھے ایک واقعہ یاد آتا ہے، وہ یہ کہ مدرسۃ الاصلاح کے دورانِ قیام جب میں درس وتدریس کی ذمہ داریوں کو انجام دے رہا تھا، مجھے ایک آدمی اسی شکل کا آتا دکھائی دیا، میں اس کو دیکھ کر تیزی سے اس کی طرف لپکا لیکن قریب پہنچنے اور تحقیق کرنے سے معلوم ہوا کہ میرا گمان غلط تھا۔ یہ صاحب مولانا اختر احسن صاحب تھے۔

میں اب بھی جب بلریا گنج کے شمال میں جاتا ہوں تو اس باغ اور کنویں کے مقام پر کچھ دیر کھڑا ہو جاتا ہوں اور چاروں طرف اس طور سے نگاہ ڈالتا ہوں کہ کسی کو تلاش کر رہا ہوں۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں میری زندگی کا سب سے عظیم انقلاب آیا ہے۔

میرا خیال ہے کہ شاید وہ کوئی فرشتۂ خداوندی تھا جو مجھے صحیح راہ دکھانے آیا تھا، میرے نزدیک اور دیگر محققین کے نزدیک ملائکہ کی ایک ایسی جماعت خداوند قدوس نے مقرر کر دی ہے جو دنیا کے بھولے بھٹکے انسانوں کو راہِ مستقیم دکھاتی رہتی ہے۔

مولانا اپنی بات کہہ چکے، کچھ دیر خاموش رہے اور پھر انھوں نے اپنی کتاب زندگی کا ایک اور ورق الٹا۔

قرآن سے لگاؤ کا ایک سبب تو یہ واقعہ ہے جو اوپر بیان ہوا اور دوسرا سبب یہ ہے جو اس سے پہلے کے دور سے متعلق ہے، وہ یہ کہ میری والدۂ مرحومہ کی تعلیم صرف قاعدۂ بغدادی سے لے کر 'الم ترکیف' تک تھی، جس کا انھیں ہمیشہ قلق رہا۔ البتہ وہ اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کو پڑھنے کی ہمیشہ تلقین کرتی رہتیں اور اپنی زندگی کو بطور عبرت پیش کرتیں، ان کا معمول تھا کہ صبح کو میرے پاس بیٹھ جاتیں اور تلاوت کرنے کے لیے کہتیں، میں تلاوت کرتا اور ان کی نظر قرآن پر ہوتی، وہ مجھ کو حکم دیتیں کہ انگلی رکھ کر پڑھو۔ ایک دن میں نے دیکھا کہ ان کی آنکھوں سے آنسو گر رہے ہیں، میرے بار بار کے پوچھنے پر انھوں نے بتایا کہ اپنی محرومی پر رو رہی ہوں۔ یہ سن کر میں بہت متاثر ہوا۔ سوچنے لگا یہ کتاب کتنی عظیم ہے، یہ کتاب...... اگر کوئی اس کو نہ پڑھ سکے تو اپنے آپ کو محروم سمجھتا ہے اور اپنی محرومی پر آنسو بہاتا ہے۔

قرآن سے لگاؤ کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ دارالعلوم دیوبند کے دورانِ قیام مدرسۃ الاصلاح سرائے میر سے ایک رسالہ 'الاصلاح' نکلتا تھا، جس میں قرآن سے متعلق مضامین شائع ہوتے تھے، میں ان مضامین کو انتہائی دلچسپی اور پابندی سے پڑھتا اور اپنے ساتھیوں کو بھی اس کی تلقین کرتا، اس طرح قرآن سے میرا لگاؤ بڑھتا گیا۔

قرآن سے لگاؤ کی ایک خاص اور اہم وجہ یہ بھی ہے کہ مولانا اختر احسن اصلاحی مرحوم کی خواہش پر میں مدرسۃ الاصلاح میں مدرس ہو گیا۔ مولانا مرحوم، علامہ فراہیؒ کے خاص شاگرد ہونے کے ناطے قرآن کے زبردست عالم تھے، ان کی تحقیق نہایت ہی اعلیٰ ہوتی تھی، ان کے سوچنے کا انداز نرالا تھا، وہ قرآن کو بہت سوچ سمجھ کر پڑھتے، مولانا مرحوم سے متاثر ہو کر میں نے بھی ان سے استفادہ شروع کر دیا۔ ان کی صبح وشام کی نشستوں اور مذاکرات سے معلوم ہوا کہ قرآن دانی یہ ہوتی ہے، اس پوری مدت میں مجھے بہت زیادہ تو نہیں حاصل ہوا البتہ پیاسی چڑیا کی چونچ تر ہو گئی۔

مولانا اپنا جواب مکمل کر چکے تھے۔

مولانا محترم نے انتہائی دردانگیز اور مؤثر انداز میں یہ باتیں بتلائی تھیں، یہ ایک اجلے ذہن کی اجلی اجلی باتیں تھیں، انھوں نے ہماری خواہش پر اپنی زندگی کے چند درخشاں پہلوؤں کو اجاگر کیا تھا، کاش کہ ہم سبق لیتے۔

مولانا خاموش ہوئے تو میں نے بادِ نسیم کی طرح شکستہ شکستہ پھر سازِ شستہ چھیڑ دیا۔

س: مولانا! آپ جماعت اسلامی سے کب اور کیوں وابستہ ہوئے جبکہ اس وقت دیگر قومی و وطنی تحریکیں جنم لے چکی تھیں اور انھیں سوادِ اعظم کی حمایت حاصل تھی۔

ج: مولانا نے جواب میں فرمایا:

میں یہ بات واضح کردینا چاہتا ہوں کہ مجھے اپنے شیوخ سے ہمیشہ انتہائی عقیدت اور محبت رہی ہے، میں ان کی خدماتِ جلیلہ کا معترف اور ان کا حد درجہ احترام کرتا ہوں لیکن چونکہ وہ کانگریس کی وطنی اور قومی تحریک سے وابستہ تھے، یہ بات میری عقل میں کسی طرح نہ آتی تھی، میں ان کی اس تحریک کا مخالف تھا، میں مدلل طریقے سے ہندوستان کی اس قومی اور وطنی تحریک کو غلط ثابت نہیں کرسکتا تھا لیکن اس کو قبول کرنے کے لیے کبھی آمادہ نہیں ہوا، اسی زمانے میں مودودی صاحب نے ہندوستان کی اس وطنی اور قومی تحریک پر محققانہ انداز میں تنقیدیں کیں اور۔

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

جس زمانے میں میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں پڑھ رہا تھا میں نے دیکھا کہ طلبہ کی ۹۹ فیصد تعداد 'ہندوستانی نیشنل ازم' کی گرویدہ تھی، چنانچہ میں نے کام شروع کردیا اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی بے باکانہ تنقیدوں کا سہارا لے کر ان کی تمام دلیلوں کو توڑتا رہا، زیادہ عرصہ نہ گذرنے پایا تھا کہ طلبہ میں دو چار کو چھوڑ کر تمام اس ہندوستانی نیشنل ازم سے متنفر ہوگئے، اس کے بعد مولانا مودودی کے دوسرے مضامین پڑھے جس سے معلوم ہوا کہ اسلام کی راہ پر چلنے کی صحیح شکل کیا ہے؟

اس کے بعد جماعت اسلامی قائم ہوئی، میں بریلی اشاعت العلوم میں مدرس تھا، مولانا حامد علی (سکریٹری جماعت اسلامی ہند) وہاں بہ حیثیت طالب علم تھے، میں نے انھیں مولانا مودودی کے نظریات سے متعارف کرایا، وہ کافی متاثر ہوئے، اس طرح ہم دونوں آگے پیچھے جماعت کے رکن بن گئے۔

مولانا، حدیث کا گہرا علم رکھتے ہیں، مولانا مودودی کی کتابوں کے مترجم ہیں، مولانا نے حدیث کی دو کتابیں 'راہِ عمل' اور 'زادِ راہ' کے نام سے لکھیں، ان میں آپ نے احادیث رسول ﷺ کا نہایت فصیح و بلیغ شگفتہ اور رواں ترجمہ کیا ہے، دونوں کتابیں عوام و خواص میں کافی مقبول ہیں،

میں نے مولانا کی اس حیثیت کو سامنے رکھا اور پوچھا۔

س: مولانا! حدیث کے ترجمے اور تشریح لکھنے کا خیال آپ کے ذہن میں کیونکر آیا، مزید اس میدان میں کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟

مولانا کچھ دیر کے لیے رکے، بیڑی کا ایک زوردار کش لیا، جسم میں حرکت پیدا کی اور یوں گویا ہوئے:

ج: ایک مرتبہ عبدالحی صاحب (مدیر الحسنات) مجھ سے کہنے لگے کہ ہم لوگوں کے پاس حدیث کی کوئی ایسی کتاب نہیں ہے جو دعوتی طرز پر لکھی گئی ہو، جس سے رفقاء استفادہ کرسکیں، چنانچہ انھیں کی تحریک اور اصرار پر میں نے یہ کام شروع کردیا اور درسی مشغولیات کے ساتھ ساتھ چار مہینے لگاتار محنت سے پہلی کتاب 'راہِ عمل' لکھی۔ اس کے بعد 'زادِ راہ' لکھی۔ جہاں تک آئندہ کا سوال ہے اس سلسلہ میں چند کام میرے پیش نظر ہیں پہلا کام ان تقاریر کا مجموعہ تیار کرنا ہے جو غیر مسلموں کے سامنے قرآن میں کی گئی ہیں، دوسری طرف میں ایک حدیث کا مجموعہ ''حدیث خواتین'' تیار کررہا ہوں۔ اس کے علاوہ تربیتی انداز کا ایک مجموعہ قرآنی آیات پر مشتمل ہوگا جس کا کچھ حصہ تیار ہوچکا ہے اور برابر کام جاری ہے، نیز اسوۂ صحابہؓ اور اسوۂ نبیؐ کے تحت ایک مفصل مجموعہ بھی پیش نظر ہے، مولانا جواب دے کر خاموش ہوگئے۔

مولانا قرآن کے بلند پایہ عالم ہیں، قرآن مولانا کا خاص موضوع ہے، قرآن سمجھنے ہی کی خاطر مولانا نے عربی تعلیم شروع کی تھی۔ یہ حیثیت ہمارے ہر وقت سامنے رہتی ہے چنانچہ میں نے ایک مفید سوال کیا۔

س: مولانا قرآن کے طلبہ، قرآن کا مطالعہ کس طرح کریں؟

مولانا نے اپنی مخصوص آواز میں جواب دیا۔

ج: اس سوال کا جواب وہ ہے جو مولانا اختر احسن صاحب مرحوم نے اسی طرح کے ایک سوال کے جواب میں دیا تھا، وہ یہ کہ سب سے پہلے سورہ کے مشکل الفاظ کی تشریحات لغت کی کتابوں سے اپنی کاپی پر درج کی جائیں، اس کے بعد نحوی ترکیب کا نمبر آتا ہے، جو مشکل ترکیبیں ہوں انھیں حل کیا جائے، اس کے بعد سورہ کا اپنے طور پر مطالعہ کیا جائے اور ہر آیت کا مفہوم بطور خود متعین کیا جائے، پھر تفاسیر دیکھی جائیں کہ متقدمین میں کسی نے آپ کا مفہوم لیا ہے یا نہیں، اگر کسی نے بھی نہیں لیا ہے تو پھر غور کرنا چاہیے کہ ہمارے متعین کردہ مفہوم میں کوئی غلطی تو نہیں ہوگئی ہے، یہ تو آیت

کے مفہوم کی بات ہوئی، اس کے بعد یہ دیکھنا ہوگا کہ آیت کے باہمی جملے کس حد تک مربوط ہیں، پھر اوپر کی آیات سے ان کا کیا تعلق ہے، اس کے بعد سورہ بکثرت تلاوت کی جائے اور دیکھا جائے کہ سورہ میں کیا چیز سب سے زیادہ ابھار کر پیش کی گئی ہے، ایسا کرنا اس لیے ضروری ہے کہ اس کے بغیر مرکزی مضمون کی تعیین مشکل ہے اور سب سے آخر میں یہ بات پیش نظر رہے کہ بندہ کو قرآن سے جتنا لگاؤ ہوگا اور جس حد تک اللہ تعالیٰ سے اس کا معاملہ درست ہوگا، اسی لحاظ سے اللہ تعالیٰ اسے صحیح فہم تک پہنچائے گا، میں مولانا کے جواب کو غور سے سن رہا تھا، میرے اندر خیالات کا ایک سیلاب امنڈ اپڑ رہا تھا، میں نے خیالات کے گرداب سے نکلنے کی کوشش کی اور مولانا کی داعیانہ زندگی کی طرف پلٹا، داعیٔ تحریک کے سامنے میں نے اپنی خلش رکھی۔

س: مولانا! عالمِ اسلام میں شکست خوردگی اور انتشار کی کیفیت چھائی ہوئی ہے، اس کے بڑے بڑے اسباب کیا ہیں اور یہ کہ عالمِ اسلام کے اتحاد میں کیا چیز مانع ہے؟

ج: مولانا نے ارشاد فرمایا:

عالمِ اسلام کے انتشار کا واحد سبب یہ ہے کہ اس قوم کے پاس خدا کی کتاب ہے اور جس قوم کو اللہ تعالیٰ اپنی کتاب دیتا ہے، اس کی ترقی وتنزلی، اس کا عروج وزوال سب کچھ موقوف ہوتا ہے اس بات پر کہ خدا کی کتاب کے ساتھ اس قوم کا سلوک کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ کتاب ایک عہد نامہ ہے جو طرفین میں طے پایا ہے، مومنین 'سمعنا واطعنا' کا عہد کرتے ہیں اور خدا کی طرف سے 'انی معکم' کا وعدہ ہوتا ہے یعنی کہ دنیا میں بھی تمہارے ساتھ رہوں گا اور آخرت میں بھی۔ دنیا میں دشمنوں کی دسیسہ کاریوں سے محفوظ رکھتے ہوئے تم کو سیاسی اقتدار سے نوازوں گا اور آخرت میں دار السلام میں بساؤں گا، اب دیکھ لیجئے کہ اس قوم کا خدا سے کیے گئے عہد بندگی کے ساتھ کیا معاملہ ہے؟ کیا یہ قوم نقضِ عہد، غداری اور عہد شکنی نہیں کر رہی ہے؟ وہ لوگ جو کسی ملک میں اکثریت میں ہیں اور وہ بھی جو کسی ملک میں اقلیت میں ہیں، دونوں غدار اور عہد شکن ہیں۔

مولانا کی آواز بھرانے لگی تھی، مولانا جوشیلی آواز میں گویا تھے، اب نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ قوم محتاج ہوگئی ہے کہ اس کو میثاقِ الٰہی یاد دلایا جائے اور قابل ماتم یہ بات ہے کہ عہد بندگی کرنے والی قوم کی اکثریت میثاقِ الٰہی کی یاد دہانی کرانے والوں کے خلاف نبرد آزما ہے، میں تو حیران ہوں کہ یہ قوم کس طرح اب تک زندہ ہے۔ اگر یہ زندہ ہے تو محض خدا کی مہربانی ہے۔

مولانا کے اس جملے نے مجھے چونکا ہی ڈالا۔

کتاب میثاق یعنی قرآن نے کیا ان ہی لوگوں کے بارے میں نہیں کہا تھا 'واعتصموا بحبل اللہ جمیعاً ولا تفرقوا' یہ آیت بتاتی ہے کہ اگر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے نہ تھاما گیا تو لازماً تفرق وانتشار برپا ہوگا، کیا یہ قوم نہیں جانتی کہ ایمان واطاعت کے بعد قرآن میں سورہ مائدہ موجود ہے جو میثاق کی سورہ ہے، اس میں قرآن کے ماننے والوں کو میثاق پر قائم رہنے اور اسے نہ توڑنے کی بار بار ہدایت کی گئی ہے۔ یہ ناقضین عہد بالخصوص یہود کے نقضِ عہد کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ تاکہ یہ قوم جب کتاب اللہ پڑھے تو شروع ہی میں یہ پانچ مدنی سورتیں پڑھے اور قوم یہ بات یاد رکھے کہ اس کی زندگی اسی میثاق سے وابستہ ہے، اب مولانا خاموش ہو چکے تھے۔

مجھے احساس ہوا کہ مولانا کے جذبات میں توازن اور اعتدال اب بھی پوری طرح کارفرما ہے۔

تحریک اسلامی کا ایک قدیم کارکن میرے پاس بیٹھا تھا، کتنا حسین موقع مجھے حاصل ہوگیا تھا، ایسے مواقع بار بار کہاں میسر، میں نے موقع کو غنیمت جانا، پہلو بدلتے ہوئے یوں استفسار کیا۔
'مولانا! آپ جماعت اسلامی کے قدیم کارکن کی حیثیت سے اس کی رفتار ترقی پر روشنی ڈالیں گے؟

ج: مولانا نے بہت محتاط انداز میں فرمایا کہ 'تحریک اسلامی کی رفتار ترقی اللہ تعالیٰ کے شکر سے بہت زیادہ اطمینان بخش ہے، آج جماعتِ اسلامی ایک عظیم طاقت بن کر ابھر رہی ہے، اس کی آواز دنیا کے کونے کونے تک پہنچ رہی ہے، اس میں اللہ کے بندے برابر شامل ہوتے جا رہے ہیں، آج سے تیس سال پہلے یہ آواز بہت نحیف ونزار تھی، یہ نتیجہ ہے اللہ کے فضل وکرم اور کارکنان کے خلوص اور لگاتار محنت کا۔ اس سلسلے میں یہ بات پیش نظر رہے کہ جماعت کی ترقی کا دار ومدار امراء اور سربراہان جماعت پر ہے، امراء اقامت دین کے اس کام میں جس قدر دلچسپی کا مظاہرہ کریں گے، ارکان اس کی اسی قدر پیروی کریں گے، فرض کیجئے امراء کے اندر ۲۵٪ گرمی ہے تو ارکان کے اندر کم از کم ۲۰٪ گرمی ہوگی، اگر امراء کے اندر ۵۰٪ گرمی ہے تو ارکان کے اندر ۴۰٪ گرمی ہوگی، امراء کی حیثیت صحیح معنوں میں پاور ہاؤس کی ہے۔"

تحریک کو چلانا کوئی آسان کام نہیں، یہ تو بڑے جان جوکھوں کا کام ہے، خصوصاً ان حالات میں جبکہ ماحول اس طرح کی تحریک کے لیے بالکل مخالف اور ناسازگار ہو، یہاں تو قدم قدم پر مشقتوں، مخالفتوں، جھوٹے پروپیگنڈوں اور افترا پردازیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، فتویٰ بازی کی مہموں، قید وبند کی سختیوں اور دار ورسن کی منزلوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے، خاندان اور معاشرے سے

جنگ، نفس سے محاربہ اوراسی قسم کی سیکڑوں آزمائشیں آن پڑتی ہیں۔

مولانا نے یہ جواب کتنے پراعتماد لہجے میں دیا تھا، تصور کیجیے۔

مولانا، عربی مدارس کے ایک طالب علم رہ چکے ہیں پھر اس سے بڑھ کر آپ کی حیثیت ایک مدرس کی ہے، میں نے اپنے الفاظ کو جامہ پہنایا اور ایک دوسری نوعیت کا سوال کرڈالا۔

س: آپ نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ عربی مدارس میں گذارا ہے، کیا عربی طلبہ کی خامیاں اور خوبیاں، عربی اساتذہ کی ذہنی کیفیات ورجحانات اور خامیوں کے اسباب کی وضاحت کریں گے؟

ج: مولانا نے جواب میں فرمایا: عربی مدارس کے طلبہ قرآن وحدیث پڑھتے ہیں لیکن وہ لگن اورانہماک اور وہ تگ ودو جوان کے لیے ضروری ہے اس سے وہ یکسر خالی نظر آتے ہیں۔ وہ ایک قسم کے احساسِ کمتری میں مبتلا رہتے ہیں، ان کے اندر دین کے غالب کرنے کا نصب العین نہیں جاگتا، دوسری طرف اساتذہ میں جمود کی کیفیت ہے، وہ اپنے موجودہ حالات پر قانع ہیں، ان پر بھی نصب العین واضح نہیں، یہی وجہ ہے کہ وہ جزوی مقاصد کے لیے کام کررہے ہیں۔

میں گھبرا اٹھا اور سراسیمگی کی حالت میں مولانا سے بےساختہ پوچھا:

س: مولانا اس صورت حال کو بدلنے کے لیے آپ کیا حل پیش کرتے ہیں؟

مولانا نے کھنکھارتے ہوئے جواب دیا:

ج: یہ تو بھائی ان مدارس کا کام ہے کہ وہ اپنی اصلاح کریں، ہم صرف حل پیش کرکے کیا کرسکتے ہیں۔

مولانا کچھ دیر کے بعد اور کہنا شروع کیا۔

مدارس میں عربی اس طرح پڑھائی جائے جو قرآن کو سمجھنے میں مددگار رہے، قرآن کی طرف زیادہ سے زیادہ توجہ دی جائے، اس طرح طالب علم اللہ کی کتاب کو اچھی طرح سمجھے گا اور اپنی زندگی کا ایک مفید نصب العین متعین کرسکے گا، مدارس میں ایک ایسی تنظیم کی ضرورت ہے جو دعوت کی راہیں متعین کرے، اس کا سربراہ ایک ایسا شخص ہو جو عربی مدارس کے علماء اور طلبہ میں قابل اعتماد ہو، یہ کام پڑوسی ملک پاکستان میں بخیر وخوبی انجام پارہا ہے اور اس کے بہترین نتائج سامنے آرہے ہیں، ان کی سرگرمیوں سے تنظیم کو فائدہ اٹھانا چاہیے۔

مولانا کا جواب مجھے معلوم ہوچکا تھا جب کوئی چوٹ کرتا ہے تو انسان اپنا گریبان جھانکنے لگتا ہے، میں نے اپنے جامعہ پر نظر ڈالی، الفاظ کو مرتب کرتے ہوئے دل میں یہ خلش لیے ہوئے

سوال کیا۔

س: مولانا! دیگر مدارس اسلامیہ کے مقابلے میں آپ جامعۃ الفلاح کو کس حیثیت سے ممتاز سمجھتے ہیں؟

مولانا نے انتہائی اطمینان اور کامل اعتماد سے اس کا جواب دیا۔

ج: جامعۃ الفلاح دیگر مدارس کے بالمقابل اپنا ایک امتیازی مقام رکھتا ہے، دیگر خصوصیات سے قطع نظر یہاں کے طلبہ واساتذہ کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان کے پاس ایک واضح اور متعین نصب العین ہے، صحیح راستہ ان کے سامنے روشن ہے، خواہ وہ جماعت اسلامی سے وابستگی کی صورت میں ہو یا طلبہ کی 'تحریک اسلامی' (اسلامک موومنٹ آف انڈیا) سے تعلق کے نتیجہ میں ہو۔ یہ سب دین ہے یہاں کے اساتذہ کی، اس کے بالمقابل جیسا کہ میں واضح کرچکا ہوں کہ دیگر مدارس کے اساتذہ وطلبہ کسی مخصوص راہ کا تعین نہیں کرپاتے، اب یہ یہاں کے طلبہ کا کام ہے کہ فراغت کے بعد اس متعین نصب العین پر کہاں تک گامزن ہوتے ہیں، یا یہ کہ ہوتے بھی ہیں یا نہیں میں بہت پرامید ہوں۔

میرے منھ سے بےساختہ نکلا۔ ''مولانا، خدا کرے آپ کی توقعات پوری ہوں۔''

کیا واقعی مولانا سچ کہہ رہے ہیں؟ میں نے اپنے دل سے معلوم کیا، دل نے اس کی صداقت کی گواہی دی، وہ خلش جو کچھ دیر پہلے مولانا کی گفتگو سے پہلے پیدا ہوئی تھی، اب کافور ہوچکی تھی۔ میرا دل خوشی سے پھولا نہ سماتا تھا، میں اپنی خوش قسمتی پر نازاں تھا اور نہ جانے کیا سوچنے لگا تھا کہ مجھے یکدم احساس ہوا کہ عصر کی اذان ہورہی ہے، میں اجازت لے کر کمرہ سے باہر آیا، اب مجھے کتنا اطمینان تھا اس کا اندازہ ہر کوئی نہیں لگا سکتا۔

☆☆☆

اگرچہ بت ہیں جماعت کی آستینوں میں
مجھے ہے حکم اذاں لا الہ الا اللہ

مولانا جلیل احسن ندوی فاضل دیوبند

ادارہ☆

ادیب ونکتہ سنج، فاضل محقق، فخر اماثل مولانا ابوسعید جلیل احسن بن علیم اللہ بن امیر علی کی پیدائش ۲۵؍جنوری ۱۹۱۳ء مطابق ۱۳۳۲ھ کو ضلع اعظم گڈھ کے ایک گاؤں 'کرمینی' میں ہوئی۔ جو قصبہ بلریاگنج سے دس کلومیٹر شمال میں واقع ہے۔ مولانا کا خاندان راجستھان سے آکر فیض آباد میں آباد ہوا پھر یہاں سیاس علاقہ میں منتقل ہوگیا۔ جس کو مولانا جلیل احسن جیسے عالم وفاضل کے مولد و منشا ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔

ان کے والد شیخ علیم اللہ عام گاؤں والوں کی طرح پڑھے لکھے نہیں تھے اور کلکتہ میں ایک جوٹ مل میں ملازم تھے، یہی ملازمت ان کے اہل وعیال کے گذر بسر کا واحد ذریعہ تھی۔ مولانا جلیل احسن بھی مکتب کے درجہ دوم میں تھے کہ ان کے والد کا مرض طاعون میں انتقال ہوگیا۔ مولانا کے ایک بھائی اور ایک بہن تھی، ان کی والدہ اور ان تین بچوں کی کفالت کا بظاہر اب کوئی ذریعہ نہیں تھا، اس لیے اعزہ نے ان کی والدہ کو دوسری شادی کی ترغیب دی اور اصرار کرکے ان کا نکاح موضع 'طوی' (جو قصبہ سرائے میر سے شمال میں تقریباً تین چار میل کے فاصلے پر واقع ہے) کے شیخ اسماعیل سے کرادیا۔ لیکن وہ بھی جلد ہی وفات پاگئے پھر انکی تیسری شادی 'طوی' ہی میں شیخ عباس مرحوم سے ہوئی۔ عباس مرحوم نے اپنی جائیداد ان تینوں یتیم بچوں کے نام کردی تھی، اس طرح منجانب اللہ گذران کا ایک وسیلہ میسر آگیا۔

مولانا نے ابھی عمر کے چوتھے سال میں قدم رکھا تھا کہ ایک اور ہمت شکن امتحان سے دو چار ہوئے، ان پر فالج کا حملہ ہوا۔ جس کے نتیجہ میں لاچار اور بالکل بے بس ہوگئے، البتہ آنکھیں اور ذہنی قوت محفوظ رہی، بظاہر یہ ایک جاں گسل مصیبت تھی لیکن اس کے پردے میں خدائے رحیم وکریم کی حکمت بالغہ اور تدبیر نافذہ اپنا کام کررہی تھی، اگر وہ تندرست اور صحیح وسالم ہوتے تو لازمی طور پر وہ

گھریلو ماحول کے زیر اثر ایک کسان اور مزدور ہی ہوتے لیکن اس بے بسی اور مجبوری کی حالت میں اس قابل تو رہے نہیں اس لیے ان کے ہر عزیز وقریب اور بہی خواہ کی یہی خواہش اور کوشش رہی کہ وہ لکھ پڑھ لیں، یوں وہ گھر کے ماحول سے آزاد ہوکر پڑھنے میں لگ گئے، یا لگادئے گئے تاکہ کسی طرح اپنا پیٹ پالنے کے لائق ہوجائیں۔

چنانچہ انھیں مکتب میں بیٹھادیا گیا جہاں جناب 'ریاست علی' کی صورت میں ایک نہایت شفیق ومہربان استاذ مل گیا، جس نے پوری توجہ سے انھیں قلم پکڑنا سکھادیا پھر یہاں سے قریب کے ایک دوسرے گاؤں سے پرائمری کے درجہ سوم وچہارم کو پاس کیا۔ بعدازاں بلریاگنج کے مڈل اسکول میں داخل کردئے گئے اور پیروں سے معذوری کے باوجود روزانہ گھر سے دس کلومیٹر کا فاصلہ طے کرکے بلریاگنج آتے اور پھر بلریاگنج سے واپس شام کو گھر جاتے، اس طرح یومیہ بیس کلومیٹر کی مسافت پیروں کی شکستگی کے باوجود طے کرتے۔ اسی دوران ان کی والدہ 'طوی' منتقل ہوگئیں تو کرمینی کی ایک نیک دل خاتون نے انھیں اپنی نگہداشت میں رکھ لیا پھر کچھ دنوں کے بعد وہ بھی کرمینی سے طوی چلے آئے اور مدرسۃ الاصلاح میں پڑھنے لگے لیکن ان کے اقرباء نے معاشی مقاصد کے تحت انھیں مدرسۃ الاصلاح سے اٹھاکر بلریاگنج کے مڈل اسکول میں پھر داخل کردیا۔ کیونکہ ان کے پیش نظر یہی تھا کہ مڈل پاس کرلیں گے تو اعظم گڑھ کچہری کے کسی گوشہ میں بیٹھ کر اپنی دال روٹی بھر کمالیا کریں گے۔

مولانا مڈل اسکول میں زیر تعلیم ہی تھے کہ ایک دن ایک اجنبی دیہاتی نے سر راہ ان سے پوچھا کہ کیا پڑھتے ہو؟ انھوں نے بتایا، اس نے اپنی دیہاتی زبان میں ان سے کہا کہ اس پڑھائی سے کوئی فائدہ حاصل ہونے والا نہیں ہے، وہ پڑھائی پڑھو جس سے تم قرآن کے معنی ومطلب سمجھنے کے قابل ہوجاؤ۔ مولانا نے اس سے پوچھا یہ تعلیم کہاں حاصل ہوگی، اس نے کہا ٹانڈہ چلے جاؤ، مولانا کے دل میں اس کی یہ بات اس طرح پیوست ہوگئی کہ انھوں نے مڈل اسکول میں پڑھنا چھوڑ دیا، جس پر اپنے بہی خواہوں کی ملامت کا نشانہ بنے لیکن انھوں نے اس کی پرواہ نہیں کی اور اپنی والدہ کو کسی طرح راضی کرکے ٹانڈہ چلے گئے۔ گھر کی معاشی حالت اگرچہ ابتر تھی پھر بھی اللہ پر بھروسہ کرکے ٹانڈہ کے مشہور مدرسہ کنزالعلوم میں داخل ہوگئے۔ اس وقت یہ مدرسہ مولانا علیم اللہ تلمیذ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی کی تدریسی وتربیتی مساعی کی وجہ سے گہوارۂ علم ودین بنا ہوا تھا۔

مولانا جلیل احسن رحمہ اللہ نے یہاں پہنچ کر سب سے پہلے قرآن مجید حفظ کیا، اپنی خداداد

ذہانت اور شب و روز کی محنت سے پندرہ مہینے کی مختصر مدت میں حافظ قرآن ہوگئے۔ بعد ازاں فارسی پڑھنی شروع کی اور مولانا علیم اللہ رحمہ اللہ کی خصوصی توجہ اور اپنی بے پناہ ریاضت کی بدولت فارسی کے تین سالہ نصاب کو ایک ڈیڑھ سال میں مکمل کرلیا۔ اس کے بعد عربی شروع کی۔ مولانا خود بیان کرتے تھے کہ جس دن میں نے عربی شروع کی وہ میری زندگی کا سب سے پرمسرت دن تھا۔ میں خوشی سے پھولا نہ سماتا تھا۔ حضرت مولانا علیم اللہ مرحوم نے ان کی جسمانی معذوری اور مالی تنگی کے پیش نظر درجہ کی پابندی سے الگ ان کے درس کے لیے خصوصی انتظام کردیا تھا۔ ادھر ان کا ذوق فراواں بھی انھیں مہمیز کرتا رہا۔ وہ اگرچہ بے بسی کے شکار تھے لیکن دل و دماغ کی صلاحیتیں شباب پر تھیں۔ اس لیے درس نظامی سے متعلق اکثر کتابیں انھوں نے کنز العلوم ٹانڈہ میں مکمل کرلیں اور آگے کے لیے تعلیم الدین ڈابھیل سورت کا رخ کیا۔ مولانا ڈابھیل کب گئے، کتنے عرصہ وہاں تعلیم حاصل کی، پھر وہاں سے دیوبند کب پہنچے، ان ضروری تفصیلات پر ان کے تذکرہ نگار مولانا عبدالرب اثری فلاحی نے یوں روشنی ڈالی ہے۔

''مزید تشنگی علم کو بجھانے کے لیے مشہور جامعہ 'جامعہ اسلامیہ' (سورت) ڈابھیل کا رخ کیا، جہاں اس وقت بہتیرے ارباب علم و کمال دارالعلوم دیوبند کے اہتمام سے جزوی اختلاف کی وجہ سے ٹوٹ ٹوٹ کر مہ و انجم کی کہکشائیں آباد کیے ہوئے تھے، جب یہ اساتذہ پھر دارالعلوم دیوبند واپس آئے تو مولانا بھی ۱۹۲۳ء (اصل میں یہی ہے مگر درست ۱۹۳۳ء ہے) منتقل ہوگئے لیکن مولانا کو افسوس ہوا کہ صحیح بخاری کا درس محدث کبیر حضرت مولانا انور شاہ کشمیری سے نہیں لے سکے، کیونکہ جس دن مولانا دیوبند پہنچے شاہ صاحب کا جنازہ اٹھ رہا تھا، وہ صرف شکل دیکھ سکے۔'' (حیات نو ستمبر ۱۹۹۸ء)

مگر اسے کیا کہیے کہ مولانا اثری کی یہ پوری تحریر از قبیل زیب داستان ہی ہے، حقیقت واقعہ سے اس کا راست تعلق نہیں ہے کیونکہ دارالعلوم دیوبند سے اس وقت جو اساتذہ جامعہ تعلیم الدین ڈابھیل منتقل ہوئے تھے، ان میں بجز حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کسی کو بھی دوبارہ دارالعلوم دیوبند آنے کا موقع میسر نہیں ہوا اور حضرت مولانا عثمانیؒ بھی ۱۹۳۳ء میں نہیں بلکہ ۱۹۳۵ء میں بحیثیت صدر مہتمم کے یہاں آئے تھے اور ابتداء میں تقریباً دو سال تک ڈابھیل سے بھی رسمی تعلق برقرار رہا۔ کچھ مہینے دیوبند رہتے اور کچھ مہینے ڈابھیل، اس زمانہ میں صرف انتظامی امور دیکھتے تھے، درس ان سے متعلق نہیں تھا۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اوائل ۱۳۴۶ھ مطابق ۱۹۲۷ء میں دارالعلوم دیوبند کے درج ذیل اساتذہ ڈابھیل منتقل ہوئے تھے:

(۱) حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی (۲) حضرت مولانا سراج احمد رشیدی (۳) حضرت مولانا انور شاہ کشمیری (۴) حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی (۵) حضرت مولانا بدر عالم میرٹھی مہاجر مدنی (۶) حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی مجاہد ملت رحمہم اللہ۔ ان میں سے:

(۱) حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی جمادی الثانی ۱۳۴۷ھ مطابق ۱۹۲۸ء کے اوائل میں ڈابھیل سے دیوبند آتے ہوئے راستہ میں علیل ہوگئے اور اسی علالت میں ۱۷ر جمادی الثانی کو ان کی رحلت ہوگئی۔

(۲) حضرت مولانا سراج احمد رشیدی تقریباً چار پانچ سال ڈابھیل میں رہے اور ڈابھیل ہی کے قیام میں فوت ہوگئے۔

(۳) حضرت مولانا انور شاہ کشمیری نے ۱۳۵۱ھ مطابق ۱۹۳۲ء تک ڈابھیل میں درس حدیث دیا۔ پھر بیمار ہوکر اپنے وطن دیوبند آگئے اور یہیں ۳ر صفر ۱۳۵۲ھ مطابق ۲۹ر مئی ۱۹۳۳ء کو وفات پاگئے۔

(۴) حضرت شاہ صاحب کی وفات کے بعد حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی ۱۳۵۲ھ مطابق ۱۹۳۳ء میں جامعہ تعلیم الدین ڈابھیل کے شیخ الحدیث مقرر ہوئے اور دو سال کے بعد ۱۳۵۴ھ مطابق ۱۹۳۵ء میں دارالعلوم دیوبند کے صدر مہتمم منتخب ہوگئے، اس تقریب سے وہ دوبارہ دارالعلوم دیوبند واپس آئے۔

(۵) حضرت مولانا بدر عالم میرٹھی تقریباً ۱۷ر سال ڈابھیل میں رہے، آخر میں وہاں کے صدر مدرس ہوگئے تھے پھر خرابیٔ صحت کی بناء پر بھاول پور چلے گئے تھے اور تقسیم ملک کے بعد پاکستان گئے اور پھر وہاں سے مدینہ منورہ ہجرت کرگئے اور اسی پاک سرزمین کے پیوند ہوئے۔

(۶) اور حجرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی تقریباً پانچ سال ڈابھیل رہے، حضرت شاہ صاحب کی وفات کے سال ۱۳۵۲ھ مطابق ۱۹۳۳ء میں وہاں سے انجمن تبلیغ الاسلام کلکتہ چلے گئے، پھر وہاں سے جمعیۃ علماء ہند کے ناظم اعلیٰ کی حیثیت سے دہلی آگئے اور یہیں زندگی بسر کردی۔ (ماخوذ از تاریخ دارالعلوم دیوبند ج ۲)

ان تاریخی حقائق کے مقابلہ میں مولانا اثری کا یہ بیان کیسے درست ہوسکتا ہے کہ ''جب یہ

اساتذہ پھر دارالعلوم دیوبند واپس آئے تو مولانا بھی ۱۹۲۳ء (اصل میں یہی ہے مگر درست ۱۹۳۳ء ہے) منتقل ہوگئے لیکن مولانا کو افسوس ہوا کہ صحیح بخاری کا درس محدث کبیر حضرت مولانا انورشاہ کشمیری سے نہیں لے سکے، کیونکہ جس دن مولانا دیوبند پہنچے شاہ صاحب کا جنازہ اٹھ رہا تھا، وہ صرف شکل دیکھ سکے۔'' (بلفظہ) اسلامی جامعات اور درسگاہوں میں طلبہ علوم کا داخلہ ماہِ شوال ہی میں ہوا کرتا ہے تو مولانا بغرض تعلیم دیوبند صفر کے مہینہ میں حضرت شاہ صاحب کی وفات کے دن کیونکر گئے ہوں گے۔

مولانا اثری صاحب کے اس بیان کے برخلاف تاریخی قرائن کی بنیاد پر ہمارا اندازہ یہ ہے کہ مولانا ڈابھیل ۱۹۳۳ء مطابق ۱۳۵۲ھ میں پہنچے ہیں جبکہ حضرت شاہ صاحب بیمار ہوکر دیوبند آگئے تھے اور ڈابھیل کم ازکم دوسال رہے کیونکہ خود مولانا اثری صاحب لکھتے ہیں کہ مولانا نے حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی صاحب سے یہاں جلالین و بخاری اور مولانا عبدالرحمٰن امروہوی سے تفسیر بیضاوی پڑھی۔ (حیات نوجنوری-فروری ۱۹۹۹ء ص ۶۲)

اسلامی مدرسوں کے نظام تعلیم سے معمولی واقفیت رکھنے والے بھی جانتے ہیں کہ دارالعلوم دیوبند کے نہج پر جہاں تعلیم ہوتی ہے وہاں موقوف علیہ یعنی جلالین، ہدایہ اخیرین، بیضاوی وغیرہ پڑھنے کے بعد دورۂ حدیث (اصول ستہ وغیرہ) کا درس ہوتا ہے، اس لیے ڈابھیل میں مولانا نے پہلے سال جلالین، بیضاوی وغیرہ پڑھی ہوگی اور دوسرے سال حدیث کی کتابیں صحیح بخاری وغیرہ پھر یہاں سے شوال ۱۳۵۴ھ مطابق ۱۹۳۵ء میں دیوبند آگئے ہوں گے، اس کی تائید خود مولانا کی اپنی تحریر سے ہوتی ہے، وہ اپنے مضمون 'نقوش و تاثرات' میں لکھتے ہیں ''دارالعلوم دیوبند کے قیام کے دوران بعض ہم وطن دوست مدرسۃ الاصلاح سے شائع ہونے والا ماہنامہ 'الاصلاح' منگاتے تھے، میرے اور ساتھی تو اسے خرید لیتے اور میں 'پڑھتا' تھا۔ (ص ۱۷، ادارہ علمیہ جامعۃ الفلاح) اور الاصلاح کا اجراء شوال ۱۳۵۴ھ جنوری ۱۹۳۵ء کو ہوا ہے۔

یہاں پہنچ کر انھوں نے غالبًا موقوف علیہ میں داخلہ لیا ہوگا، اس طرح یہاں کم ازکم دوسال رہے ہوں گے، ورنہ انھیں حضرت مولانا اعزاز علی رحمہ اللہ کے ذریعہ عربی ادب کا ذوق کیسے پیدا ہوتا۔ تاریخ کی تصحیح کے لیے یہ طوالت ناگزیر تھی، اس لیے توقع ہے کہ اسے انگیز کیا جائے گا۔

دارالعلوم دیوبند سے تعلیم و تحصیل کے بعد جدید ادب عربی میں مہارت پیدا کرنے کی غرض سے وہ 'دارالعلوم ندوۃ العلماء' لکھنؤ پہنچے۔ جہاں اس وقت مولانا عبدالرحمٰن کاشغری اور مولانا

محمد ناظم ندوی جیسے ادب عربی جدید کے ماہر اساتذہ درس و افادہ میں مصروف تھے۔ وہ ندوہ اسی ارادہ اور خواہش پر آئے تھے کہ یہاں داخلہ لے کر ادب عربی میں اختصاص حاصل کریں گے مگر وہ اپنے اس ارادہ کو روبہ عمل لانے میں کامیاب نہیں ہوئے، مدیر مجلّہ 'الایمان' دیوبند نمبر ۱۹۸۱ء ص ۳۸ پر اس کی تفصیل ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

''مولانا شاید ندوی ایک ہفتہ کے لیے بھی نہیں تھے کیونکہ مولانا جب دیوبند سے ندوہ صرف ادب کی تعلیم کے لیے آئے تو معلوم ہوا کہ یہاں ادب کے طالب علم کی حیثیت سے داخلہ کا اس وقت کوئی قانون نہیں تھا، مستقل کوشش کے باوجود ناکام رہے تو یہ شکل نکلی کہ مدرس ہوکر استفادہ کریں لیکن مولانا آمادہ نہ ہوئے۔'' (بحوالہ حاشیہ حیات نو اکتوبر ۱۹۹۸ء ص ۳۶)

مولانا مرحوم کے تعلیمی سفر کی روداد سے بظاہر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں باضابطہ داخلہ نہ مل پانے کے باوجود انھوں نے اپنے طور پر یہاں قیام کر کے مولانا عبدالرحمٰن کاشغری اور مولانا محمد ناظم ندوی رحمہما اللہ سے فن ادب میں خصوصی استفادہ کیا اور ان کے فیض صحبت سے اپنے ذوق ادب و انشاء کی تسکین کی صورت نکال لی۔ اخذ و استفادہ اور تعلیم و تحصیل کے سلسلے کا یہ ان کا آخری سفر تھا۔ یہاں سے وہ مولانا محمد ناظم ندویؒ کی کوششوں سے مدرسہ اشاعت العلوم بریلی میں مدرس و معلم ہوکر چلے گئے۔

مدرسہ اشاعت العلوم بریلی کی معلّمی سے ان کی علمی زندگی کا دوسرا باب شروع ہوا۔ وہ لکھنؤ کے زمانۂ قیام ہی سے جماعت اسلامی کی تحریک سے متاثر تھے۔ یہاں پہنچ کر اس تاثر میں مزید اضافہ ہوا۔ یہاں تک کہ ۱۹۴۲ء میں انھوں نے باقاعدہ جماعت میں شمولیت کی درخواست اس کے مرکز دارالاسلام میں بھیج دی اور اس کے باضابطہ رکن بن گئے۔ اسی زمانہ میں مولانا مودودی صاحب نے اردو کتابوں کو عربی میں منتقل کرنے کے لیے ایک ادارہ ''دارالعروبہ'' کے نام سے قائم کیا تھا جس کے مدیر مولانا مسعود عالم ندوی تھے۔ مولانا مودودی صاحب نے انھیں اس ادارہ سے متعلق ہوکر کام کرنے کی دعوت دی تو وہ اشاعت العلوم بریلی سے علاحدہ ہوکر جماعت اسلامی کے مرکز دارالاسلام منتقل ہوگئے۔ اسی زمانہ میں مولانا مودودی صاحب کی مشہور کتاب 'قرآن کی چار بنیادی اصطلاحین' کا ترجمہ عربی میں کیا۔ اس کے علاوہ اسلام کا نظام حیات، اسلام کا اقتصادی نظام وغیرہ کے عربی تراجم کیے لیکن وہ یہاں تادیر ٹھہر نہیں سکے اور ڈیڑھ دوسال ہی میں وہاں سے واپس آگئے اور شہر بریلی ہی کے ایک دوسرے مدرسہ 'مصباح العلوم' میں تدریسی خدمت پر مامور ہوئے۔

اس وقت اس مدرسہ کے صدر مدرس مولانا عبدالقیوم اور صاحب 'مصباح اللغات' مولانا عبدالحفیظ بلیاوی مدرس تھے، انھیں دونوں کی سعی مشکور سے مولانا یہاں بحیثیت مدرس پہنچے۔ وہ اپنے تدریسی مشاغل میں یہیں مصروف تھے کہ ۱۹۴۶ء مطابق ۱۳۶۶ھ میں مدرسۃ الاصلاح ایک شدید بحران کا شکار ہوگیا۔ اس کے چار اساتذہ جن میں مدرسہ کے قدیم استاذ مولانا شبلی متکلم صدر مدرس بھی تھے مستعفی ہوگئے چونکہ اس وقت مدرسۃ الاصلاح مکمل طور پر جماعت اسلامی کے زیر اثر تھا اس لیے ناظم مدرسہ مولانا بدرالدین اصلاحی نے مولانا مودودی صاحب کے تجویز پر ان چاروں اساتذہ کی خالی جگہوں کو پر کرنے کے لیے مولانا ابواللیث ندوی کو اکولہ مہاراشٹر سے، مولانا صدرالدین اصلاحی کو دارالاسلام پٹھان کوٹ سے، مولانا ابوبکر اصلاحی کو قادر آبادی بستی سے اور مولانا جلیل احسن صاحب کو بریلی سے بلاکر مدرس بنایا گیا۔ بریلی سے سرائے میر آنے کی اصل وجہ یہی ہے۔ وہ نہیں ہے جس کو مولانا عبدالرب اثری فلاحی نے مولانا کے ترجمہ ذکر جلیل میں لکھا ہے کہ ''مصباح العلوم کی خستہ حالی کے بعد مولانا سرائے میر آ گئے''۔ مولانا جس زمانہ میں مدرسۃ الاصلاح میں درس و تدریس کی خدمت انجام دے رہے تھے، اسی زمانہ میں جماعت اسلامی نے عصری تعلیم یافتہ افراد کے لیے درسگاہ اسلامی ثانوی کے نام سے رامپور میں ایک تعلیمی ادارہ قائم کیا تو وہ اس وقت کے جماعت اسلامی ہند کے امیر کی دعوت پر سرائے میر سے اس ادارہ میں منتقل ہوگئے۔ یہاں ان سے متعلق قرآن کے ساتھ دیوان حماسہ اور سبع معلقات کے اسباق متعلق ہوگئے مگر یہ ادارہ تقسیم ملک کے بعد اپنے وجود کو باقی نہ رکھ سکا۔ اس کے ختم ہوجانے کے بعد مولانا کو جماعت کے شعبۂ تصنیف و تالیف سے متعلق کردیا گیا۔ وہ اگرچہ خدمت لوح و قلم کی پوری صلاحیت رکھتے تھے مگر ان کا اصل موضوع درس و تدریس ہی تھا۔ اس لیے وہ اس شعبہ سے مستعفی ہوکر دوبارہ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر آ گئے لیکن جلد ہی ۱۹۶۲ء مطابق ۱۳۸۲ھ میں وہاں ایسے حالات پیدا ہوگئے کہ جماعت اسلامی سے وابستہ تمام لوگوں کو وہاں سے علاحدہ کردیا گیا تو وہ بھی سرائے میر سے گھر چلے آئے۔ اسی اثنا میں چترپور ہزاری باغ بہار میں (موجودہ جھارکھنڈ) درسگاہ اسلامی ثانوی کے نہج پر ایک مدرسہ 'جامعہ کاشف العلوم' کے نام سے جماعت اسلامی سے وابستہ بعض لوگوں نے قائم کیا تو ان کی طلب پر وہ بحیثیت استاذ وہاں گئے اور درس و افادہ کی محفل آراستہ کی مگر اس مدرسہ نے بھی جلد ہی دم توڑ دیا۔ اس لیے وہاں سے ۱۹۶۴ء مطابق ۱۳۸۴ھ کے اواخر میں اپنے شاگردوں سمیت جامعۃ الفلاح بلریا گنج ضلع اعظم گڑھ آ گئے اور ۱۹۷۲ء مطابق ۱۳۹۲ھ تک پوری دلجمعی کے ساتھ جامعۃ الفلاح کو واقعی جامعہ

بنانے میں مصروف رہے۔ ان کے یہاں آتے ہی انھیں صدر مدرس بنادیا گیا اور پورا تعلیمی نظام ان کے سپرد ہوگیا مگر معذوری اور نقل و حرکت میں پریشانی کے باعث جلد ہی صدارت تدریس سے مستعفی ہوگئے۔ البتہ ناظم تعلیمات برقرار رہے، پانچ چھ ماہ جامعہ کے ناظم بھی رہے، کچھ دنوں تک معتمد تعلیمات بھی رہے مگر اپنی معذوری اور حالات کی ناساعدت سے کسی عہدہ پر تادیر نہیں رہ سکے پھر بعض حالات ایسے رونما ہوئے کہ انھوں نے ۱۹۷۲ء مطابق ۱۳۹۲ھ جامعہ ہی سے استعفا دے دیا اور یہاں سے جامعۃ الرشاد شہر اعظم گڑھ منتقل ہوگئے مگر یہاں بھی مکمل ایک سال قیام نہیں رہا۔ یہاں سے 'جامعہ دارالہدیٰ' محمد نگر آندھرا پردیش چلے گئے، اس دوران جامعۃ الفلاح کی طرف سے ان کی واپسی کی کوشش ہوتی رہی بالآخر درج ذیل شرائط کے ساتھ دسمبر ۱۹۷۳ء مطابق ۱۳۹۳ھ دوبارہ جامعۃ الفلاح آ گئے۔

شرائط واپسی: (۱) چار سو روپئے ماہانہ مشاہرہ لوں گا۔ (۲) وہی کمرہ رہنے کے لیے لوں گا جس میں پہلے رہتا تھا۔ (۳) ایسے حالات پیدا نہ ہوں کہ مجھے جامعہ چھوڑنا پڑے۔ (۴) اب میں کہیں نہیں جانا چاہتا اور میری کتابیں جامعۃ الفلاح کی ہوں گی۔ (حیات نو جنوری-فروری ۱۹۹۹ء)

اس کے بعد مولانا مرحوم نے اپنی پوری زندگی جامعۃ الفلاح ہی میں گذاردی اور یہیں کے زمانہ قیام میں ۵/رمضان المبارک ۱۴۰۱ھ مطابق ۸/جولائی ۱981ء کو رہ گرائے عالم جاودانی ہوگئے، جہاں پہنچ کر پھر کہیں اور جگہ جانا نہیں ہوگا۔

وہ بالکل ٹھیک ٹھاک تھے، حسب معمول سارے کام انجام دئے۔ فجر کی نماز حجرہ میں ادا کی، کچھ مہمان آئے ہوئے تھے انھیں رخصت کیا اور اپنے خادم کو بازار ٹارچ لانے کے لیے بھیجا اور خود مطالعہ میں مشغول ہوگئے۔ 'تدبر قرآن' پڑھ رہے تھے اور جب مطالعہ کرتے کرتے تھک گئے تو اپنے خاص انداز میں کسی نکتہ کو سوچنے کے لیے لیٹ گئے اور لیٹتے ہی سانس تیز تیز آنے لگی، ایسا لگ رہا تھا کہ وہ سوگئے ہیں، اسی دوران خادم ٹارچ لے کر آ گیا، اس نے مولانا کو آواز دی مگر اب جواب کی سکت کہاں تھی وہ تو سفر آخرت شروع کرچکے تھے۔ یہ تیز تیز سانس اسی کی وجہ سے آرہی تھی۔ بس دو ہچکیاں لیں اور اپنے رب غفور کی بارگاہ میں پہنچ گئے۔

دو ہی ہچکی میں ہوا بیمارِ غم کا فیصلہ
ایک ہچکی موت کی اور اک تمہاری یاد کی

مولانا جلیل احسن مرحوم علوم نحو، ادب اور تفسیر کے زبردست عالم تھے اور ان گنے چنے علماء

میں سے تھے جنھیں عربی ادب وانشاء پر پورا عبور حاصل تھا، وہ ایک ماہر تعلیم تھے۔ ان کا طریقہ درس بڑا جاذب تھا، طالب علم کی خفیہ صلاحیتوں کو بیدار کرنے کا انھیں اچھا سلیقہ تھا، ان کے آگے زانوئے تلمذ تہہ کرنے والے سب ان کی تعریف وتوصیف میں رطب اللسان ہیں۔ وہ طلبہ سے کہا کرتے تھے کہ ہمیشہ لفظوں کو پکڑ کر چلو، عبارت کے ذریعہ مفہوم کی تعیین کی جانی چاہیے نہ کہ مفہوم کے ذریعہ عبارت حل کی جائے۔

ہزاروں تلامذہ کے علاوہ ان کی قلمی یادگار یہ ہیں:

(۱) راہ عمل، ۱۴۳۲ احادیث کا مجموعہ (۲) زادراہ، ۱۴۵۰ احادیث پر مشتمل مجموعہ (۳) سفینۂ نجات، اس میں ۱۴۳۸ احادیث کا ترجمہ وتشریح ہے، یہ تینوں کتابیں مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی اور مکتبہ ذکری رامپور سے شائع ہوئی ہیں اور اصلاح وتربیت سے متعلق ہیں (۴) 'تدبر قرآن پر ایک نظر' سورہ اعراف آیت ۱۴۳ تک ہی کام مکمل ہوا تھا کہ داعیِ اجل کو لبیک کہا، اس کا بیشتر حصہ 'زندگی نو' ۱۹۸۱ء، ۱۹۸۳ء، ۱۹۸۴ء میں چھپ چکا ہے۔ (۵) نقوش راہ، اس میں ان کے متعدد دروس قرآن کو جمع کیا گیا ہے۔ جامع مولانا رضی الاسلام ندوی ہیں۔ (٦) نقوش وتاثرات، اس میں ان کے چند مضامین کو جمع کیا گیا ہے۔ ادارہ علمیہ جامعۃ الفلاح بلریا گنج اعظم گڑھ سے یہ مجموعہ شائع ہوگیا ہے۔ (۷) جمہرۃ اشعار العرب، پر مختصر حاشیہ، قلمی (۸) لغات عربی الف سے تا تک ہی کام ہوسکا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مولانا جس پایہ کے عالم وفاضل تھے، اس کے اعتبار سے انھیں کام کے مواقع حاصل نہیں ہوئے۔ اگر وہ ایک خاص دائرہ میں محدود ہو کر کام کرنے کے بجائے کشادہ اور کھلی فضا میں کام کرتے تو ان کے علم کا جوہر مزید نکھر کر سامنے آتا۔

☆☆☆

زمستانی ہوا میں گرچہ تھی شمشیر کی تیزی
نہ چھوٹے مجھ سے لندن میں بھی آداب سحر خیزی
جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

مولانا جلیل احسن ندویؒ - ایک مایۂ ناز مفسر قرآن

مولانا نعیم الدین اصلاحی☆

جماعت اسلامی کو اس کے آغاز ہی میں جن دیدہ ور علماء کی رفاقت نصیب ہوئی ان میں ایک نہایت ہی اہم نام مولانا جلیل احسن ندویؒ کا بھی ہے، مولانا مرحوم ومغفور کو جس طرح فن حدیث اور کتب حدیث میں تبحر اور کامل دسترس حاصل تھی، اسی طرح ان کو انشاء اور ادب عربی کے ساتھ ساتھ اردو زبان وادب کا بھی نہایت اعلیٰ اور صاف ستھرا مذاق حاصل تھا۔

مولانا صدرالدین صاحب اصلاحی نے 'سفینۂ نجات' کے پیش لفظ میں بجا طور پر فرمایا ہے ''اس مجموعۂ احادیث کو منتخب کر کے مرتب کرنے اور اس کا ترجمہ کرنے والے ہندوستان کے مشہور عالم دین مولانا جلیل احسن ندویؒ ہیں جو ابھی جلد ہی اللہ تعالیٰ کے جوار رحمت میں پہنچ چکے ہیں۔ مرحوم ایک زبردست عالم دین کی حیثیت سے تو معروف تھے ہی، ایک صاحب قلم کی حیثیت سے بھی غیر معروف نہیں تھے۔ وہ عربی کے بھی بلند پایہ ادیب تھے اور ان کی اردو بھی بڑی شگفتہ تھی'' (سفینۂ نجات ص ۲٦ رفروری ۹۲ء مطبوعہ مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی)

مولانا کے عربی ادب وانشاء کے اساتذہ میں مولانا مسعود عالم ندویؒ اور مولانا ناظم ندویؒ کے اسمائے گرامی نہایت ہی اہم ہیں مولانا ایسے ان دونوں اساتذہ کے انشاء عربی کے معترف، مداح اور بے حد قدرداں تھے، مولانا مسعود عالم ندویؒ بطور تحدیث نعمت مولانا جلیل احسن ندویؒ کی انشاء کو بنظر استحسان دیکھتے، مولانا مسعود عالم ندویؒ کے ایک دوست مولانا تقی الدین نعمانی نے ان کے تاثرات کا اظہار اس طرح ظاہر فرمایا ہے ''مولانا مسعود عالم ندوی عبدالرحمٰن کاشغری، محمد ناظم ندوی بہاری کی ادبیت سے زیادہ ان کی لغت دانی کے قائل تھے، جلیل احسن ندوی کی عربی ادب میں ان کی کامل دستگاہ کی تعریف کرتے اور تحدیث نعمت کے طور پر جلیل احسن صاحب کو اپنا شاگرد بتاتے۔''
(ماہنامہ زندگی رامپور اگست ۱۹۸۴ء)

☆ استاذ تفسیر، جامعۃ الفلاح، اعظم گڑھ

اس میں شک نہیں کہ جماعت اسلامی کے بنیادی لٹریچر کو جن علماء نے عربی زبان وادب کے نہایت دلکش اور مؤثر اسلوب میں ڈھالا ہے ان میں ہراول دستہ کے طور پر ان تینوں علماء کی کاوشیں نہایت ہی اہم رہی ہیں۔ انھیں کی کوششیں تھیں جن سے دیار عرب اور ان کے علماء جماعت اسلامی اور اس کے طریقۂ کار سے واقف ہوئے۔ بعد میں مولانا خلیل حامدی اور مولا عاصم حداد بھی اس گروہ میں شامل ہوگئے جن کی کوششوں کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

علمائے دیوبند کا اثر

یہ ایک حقیقت ہے مولانا کے اندر ذوق عربی ادب اور انشاء عربی میں کمال ندوۃ العلماء کی فضاؤں میں حاصل ہوا۔ لیکن اس میں بھی دورائے نہیں ہے کہ عربی ادب وانشاء کا صاف ستھرا اور اعلیٰ مذاق دارالعلوم دیوبند میں تشکیل پاچکا تھا۔ مولانا دیوبند کے اساتذہ کرام کا نام بڑے ادب واحترام کے ساتھ لیتے بالخصوص ادب عربی کے استاذ حضرت مولانا اعزاز علی صاحب کا ذکر خیر بار بار کرتے۔ ان کے علمی وقار، متانت وسنجیدگی کے بے حد معترف تھے۔ ان کی ادبی کاوش 'شرح دیوان الحماسۃ' کو بہت سراہتے۔ بعض طلبہ ان کی شرح حماسہ پہ اعتراض کرتے کہ یہ تو شرح فیضی کا چربہ ہے بلکہ بعض سرقہ تک کا الزام لگاتے مگر مولانا جلیل احسن صاحب سختی کے ساتھ اس کی تردید کرتے اور فرماتے کہ یہ سرقہ نہیں بلکہ استفادہ ہے۔

مولانا جلیل احسن ندویؒ مرحوم کا فن حدیث میں تبحر مسلمہ ہے، عربی زبان وادب میں مہارت اور اختصاص ہر شبہہ سے بالاتر لیکن مولانا مرحوم کا طرائے فضل وکمال فن حدیث اور انشاء وادب عربی نہیں بلکہ فن تفسیر ہے۔ اس فن سے دلچسپی انہیں مدرسۃ الاصلاح میں پیدا ہوئی جب وہاں مدرس کی حیثیت سے تشریف لائے اور مولانا اختر احسن اصلاحی کی رفاقت انہیں میسر آئی۔ مولانا اختر احسن اصلاحی مرحوم، مولانا فراہی کے نامور شاگرد تھے، مولانا امین احسن اصلاحی کے ہم سبق تھے۔ مولانا ندوی کو مدرسۃ الاصلاح میں تفسیر قرآن سے جو گہرا شغف اور لگاؤ پیدا ہوا، وہ آخر عمر تک قائم رہا اور مدرسۃ الاصلاح کے بعد مولانا جہاں بھی گئے، ان کی پہچان اور شناخت ایک نامور مفسر قرآن کی حیثیت سے ہوتی تھی۔

ثانوی درسگاہ رامپور ہو، مدرسۃ الاصلاح، جامعۃ الفلاح، جامعۃ الرشاد ہو یا دارالھدیٰ کریمہ نگر ہو، ہر جگہ مولانا فن تفسیر ہی خصوصیت کے ساتھ پڑھاتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ مولانا کی علمی کاوشوں میں ان کی کتابیں 'راہِ عمل'، 'سفینۂ نجات' اور 'زادِ راہ' کو جو وقار اور اعتبار حاصل ہے، وہ

اہل علم سے پوشیدہ نہیں ہے، اس کے باوجود مولانا قرآن مجید کے ایک متبحر عالم تھے۔ اس موضوع پر مولانا کی کچھ دروس القرآن کے علاوہ باقاعدہ تصنیف تو نہیں ہے، البتہ 'تدبر قرآن پر ایک نظر' کے عنوان سے جو انھوں نے زندگی نو میں اشاعت کے لیے دئے تھے اور جو بعد میں شائع بھی ہوئیں اور جن کو ادارہ علمیہ نے باقاعدہ شائع بھی کردیا ہے۔ مولانا کے نظرات مختصر ہونے کے باوجود فن تفسیر پر ایک نہایت ہی قیمتی اضافہ ہیں۔ جن سے تفسیر قرآن کے باب میں مولانا کا نقطۂ نظر صاف طور پر واضح ہوکر آجاتا ہے۔ ذیل میں کچھ اس کی مثالیں پیش کی جارہی ہیں تاکہ تفسیر آیات کے باب میں مولانا کا موقف واضح ہوکر آجائے۔

(۱) مولانا ندویؒ سورہ بقرہ آیت ۷۶ کے سلسلے میں مولانا اصلاحی کے ترجمہ اور تفسیر پر نقد کرنے کے بعد اپنی رائے اس طرح ظاہر کرتے ہیں:

''ہمارے نزدیک صحیح بات یہ ہے کہ یہاں یہود کے اس گروہ کا حال بیان ہورہا ہے جو ازراہِ شرارت اور برائے سازش یہودی لیڈروں کی جانب سے بھیجے گئے ہیں اور کلمہ پڑھ کر اسلامی جماعت میں شامل ہوئے ہیں۔ بالفاظ دیگر اس سے منافقین مراد ہیں۔ یہاں مدنی منافقین جو اوس و خزرج سے آئے تھے زیر بحث نہیں ہیں، یہ لوگ دوعملی میں گرفتار ہیں۔ بار بار مسلمانوں کو اپنے پکے مومن ہونے کا یقین دلانے پر مجبور ہیں اور اپنے مخلصانہ ایمان کی شہادت کے طور پر نبی آخرالزماں اور قرآن سے متعلق توراتی صحیفوں کی پیشین گوئیوں کو مسلمانوں سے بیان کرتے اور مسلمان ان پیشین گوئیوں کا حوالہ دے کر یہودی کو زچ کرتے تو یہ اپنے ان بھیجے گئے یہودی منافقین سے کہتے: یہ کیا غضب کرتے ہو، کس کام کے لیے ہم نے بھیجا ہے اور کیا کررہے ہو؟ تم اپنے صحیفوں کی پیشین گوئیوں کو جو صرف تمہیں معلوم ہیں مسلمانوں کو بتاتے ہو اور وہ ان کا حوالہ دے کر ہم سے نبی اور قرآن پر ایمان لانے کا مطالبہ کررہے ہیں۔ یہودی علماء یہاں آخرت کے محاسبے سے ڈرنے اور ڈرانے کی بات نہیں کررہے ہیں بلکہ اس دنیا میں جن پریشان کن صورت حال سے دوچار ہیں اس کا ذکر کررہے ہیں۔'' (تدبر قرآن پر ایک نظر)

مولانا ندویؒ تدبر قرآن کی اس آیت کی تفسیر پر نقد لکھنے کے بعد مولانا تھانوی کی تفسیر 'بیان القرآن' کا تذکرہ اس طرح کرتے ہیں:

''حضرت تھانویؒ نے اپنی تفسیر 'بیان القرآن' میں اس کا ترجمہ اسطرح کیا ہے [وہ دوسرے یہودی ان سے کہتے ہیں کہ تم کیا غضب کرتے ہو مسلمانوں کو خوشامد میں وہ باتیں بتلادیتے

ہو جوان کے مفید مذہب اللہ تعالیٰ نے توریت میں تم پر منکشف کردی ہیں مگر ہم بمصلحت پوشیدہ رکھتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ لوگ تم کو حجت میں مغلوب کردیں گے کہ دیکھئے مضمون اللہ کے پاس سے تمہاری کتاب میں آیا ہے، کیا تم اتنی موٹی بات نہیں سمجھتے'' (بیان القرآن حصہ اول ص ۴۲)

پھر آخر میں اس تاویل کی تحسین اس طرح فرمائی ہے:

''ہمارے نزدیک یہی تاویل صحیح ہے'' (تدبر قرآن پر ایک نظر ص ۴۰)

(۲) تدبر قرآن، سورہ بقرہ آیت ۸۰ کی تفسیر پر نقد کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس ترجمہ وتفسیر پر گذارش یہ ہے کہ یہود کا عقیدہ سورہ مائدہ آیت ۱۸ میں بایں الفاظ نقل ہوا ہے (وقالت الیہود والنصاری نحن ابناء اللہ واحباء ہ) [اور یہود ونصاری کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں] بتائیے کون شخص اپنے بیٹوں کو چند سکنڈ کے لیے بھی دوزخ میں ڈالنا پسند کرے گا؟ کیا کوئی شخص اپنے محبین اور محبوبوں کو چند لمحوں کے لیے بھی آگ میں ڈالنا گوارا کرے گا؟ اور کیا سورہ بقرہ آیت ۹۴ میں ان کا عقیدہ نہیں بیان ہوا ہے کہ آخرت کی کامیابیاں اللہ کے نزدیک دوسروں کے مقابل میں ہمارے ہی لیے مخصوص ہیں؟ اور کیا بقرہ آیت ۱۱۱ میں خدا نے ان کا عقیدہ نہیں نقل کیا ہے کہ جنت میں نہیں جائیں گے مگر یہود یا نصاری؟ اور کیا سورہ اعراف آیت ۱۶۹ میں یستغفر لنا نہیں یعنی یقیناً ہماری بخشش ہو جائے گی۔ ہم دوزخ سے بچا لیے جائیں گے۔ یہ بات بلا قید وشرط پوری عمومیت کے ساتھ بیان ہو رہی ہے اور آج کسی بھی یہودی کا عقیدہ نہیں ہے کہ وہ ایک لمحہ کے لیے بھی دوزخ میں جائے گا۔''

مولانا عبدالماجد دریا آبادی جو یہود کی تاریخ کے سب سے بڑے عالم گزرے ہیں انھوں نے سب سے پہلے مشہور قول نقل کیا جسے پادری راڈول نے اپنے انگریزی ترجمہ قرآن کے حاشیے میں اکابر یہود کے حوالے سے لکھا ہے، پھر لکھتے ہیں:

''بلکہ بعض یہودی ماخذوں سے معلوم ہوتا ہے کہ گویا اسرائیل اپنے کو آتش دوزخ کی زد سے بالکل ہی باہر اور محفوظ سمجھ رہے تھے۔ چنانچہ جیوش انسائیکلوپیڈیا میں یہ عقیدہ یوں نقل ہوا ہے ''آتش دوزخ گنہگاراران قوم یہود کو چھوئے گی بھی نہیں اس لیے کہ وہ جہنم پر پہنچتے ہی اپنے کا اقرار کرلیں گے اور خدا کے پاس واپس آجائیں گے۔'' (ج ۵ ص ۵۸۳)

اور یہود کے بڑے مقدس نوشتہ تالمود میں یون آیا ہے:

''قیامت کے دن ابراہیم درِ دوزخ پر تشریف رکھتے ہوں گے اور کسی مختون اسرائیلی کو اس

میں گرنے نہیں دیں گے (ص ۴۰۴) جہنم کی آگ اسرائیلی گنہگاروں پر کوئی قدرت نہیں رکھتی۔''
(ص ۴۰۵ تدبر قرآن پر ایک نظر)

اس کے بعد مولانا ندوی نے اس پر ایک نہایت ہی دقیق بحث کی ہے۔ مولانا لکھتے ہیں:

''اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے الا متصلہ ہے کہ منقطعہ۔ ہمارے نزدیک یہ الا منقطعہ ہے، جس کا ترجمہ البتہ اور لیکن سے کیا جاتا ہے۔ ایسے الا کے بعد آنے والا اسم لفظاً منصوب ہوتا ہے اور محلاً مرفوع ہوتا ہے مبتدا ہونے کی وجہ سے اور خبر کبھی لفظوں میں مذکور ہوتی ہے اور عام طور پر حذف ہوتی ہے مثلاً سورہ تین میں مذکور ہے اور سورہ عصر میں حذف ہے، یہاں بھی حذف ہے۔ عبارت عربی میں بنایئے ''ولكن ایاما معدودة نعذب فی الدنیا بالمصائب والآلام مكفرة عنا'' مطلب یہ کہ البتہ گناہوں کی پاداش یہیں دنیا میں مصائب وآلام میں مبتلا ہوں گے۔ یہ مصائب و آلام ہمارے گناہوں کے لیے کفارہ بنیں گے اور پھر دھل دھلا کر سیدھے جنت میں جا بسیں گے۔ آج یہود کا یہی عقیدہ ہے جو تالمود پر مبنی ہے۔ آج کے یہود تورات سے زیادہ تالمود کو مانتے ہیں۔''

مذکورہ دونوں اقتباسات سے یہ بات صاف طور پر جھلکتی ہے کہ مولانا ندوی آیات کی تفسیر وتاویل میں ہر قسم کی گروہی اور جماعتی عصبیتوں سے پاک تھے اور بسا اوقات زبان ومکان کی قید کی بھی پروا نہیں کرتے۔ چنانچہ علماء متقدمین کے مقابلے میں بیسویں صدی کے دو عالموں کی تاویل قبول کرلی اور علمائے متقدمین کی تاویلات کو درخور اعتنا نہیں سمجھا۔

یقیناً مولانا ندویؒ نے مولانا امین احسن اصلاحی کی شہرۂ آفاق تفسیر 'تدبر قرآن' پر سخت تنقید کی بلکہ کہیں کہیں سخت صراحت سے کام لیا ہے مگر اس کے باوجود مولانا ندویؒ نے مولانا اصلاحی کی تفسیری کارنامے کو جو خراج تحسین پیش کیا اور تدبر قرآن کے فضل وکمال کو جو سراہا ہے وہ بھی اپنی مثال آپ ہے۔ والفضل ما تشهد به الأعداء۔ مولانا لکھتے ہیں:

'' 'تدبر قرآن' جناب مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کی عظیم شاہکار تفسیر ہے جو آٹھ ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس تفسیر کے مطالعہ کرنے والوں سے اس کی گوناگوں خصوصیات مخفی نہیں ہیں۔ بالخصوص نظم قرآن کے پہلو سے تو لاثانی تفسیر ہے۔ قدیم وجدید علمائے تفسیر میں متعدد لوگوں نے سورتوں کی تفسیر نظم کی رعایت سے کی ہے لیکن میرے علم کے مطابق وہ اتنے کامیاب نہیں ہوئے جتنے مولانا اصلاحی کامیاب ہوئے ہیں اور اس کامیابی کا بڑا حصہ ان کے استاد مولانا فراہی کے فیضانِ صحبت کا نتیجہ ہے اور خود مولانا اصلاحی کی اپنی محنت کا ثمرہ بھی اس میں آگیا ہے۔ مولانا نے

اگر چہ مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ سے پورا قرآن سبقاً سبقاً نہیں پڑھا ہے لیکن ان کی صحبت میں پانچ سال تک رہے ہیں۔ اجزائے تفسیر کے گہرے مطالعہ، ترجمہ کرنے کی صلاحیت اور غیر مطبوعہ مسودات کی ممارست ان تمام وجوہ سے اپنی تفسیر میں اپنے شیخ ہی کا نہج اختیار کیا ہے۔ یہ عاجز اور تمام ہی اصلاحی برادری مولانا اصلاحی کا شکر گذار ہے اور دوسرے تمام طالبین قرآن کو ان کا شکر گذار ہونا چاہیے اور انھیں اس تفسیر کے مطالعہ کی راہ میں مدرسی اور گروہی تعصب کو حائل نہ ہونے دینا چاہیے۔ تمام خادمان کتاب کی تفسیروں کو کھلی آنکھوں سے پڑھنا چاہیے، اندھی یا بھینگی آنکھون سے نہیں، چاہے اپنوں کی کتاب ہو، چاہے باہر والوں کی۔'' (تدبر قرآن پر ایک نظر ص ۵)

تفسیر قرآن کے سلسلے میں مولانا کے نزدیک روایت کا کیا مرتبہ ہے؟ اس سے آگاہی کے لیے ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں۔ سورہ بقرہ آیت ۱۸۹ کے سلسلے میں تدبر قرآن پر نقد کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''مولانا نے عرب جاہلیت کی جس رسم کا ذکر کیا ہے، اس کا ذکر دوسرے لوگ مختلف نوعیت سے کرتے ہیں، کوئی کچھ کہتا ہے کوئی کچھ۔ سچی بات یہ ہے کہ عربوں نے اس طرح کی کوئی رسم ایجاد نہیں کی تھی اور مولانا نے اس بدعت کے جس محرک کا پتہ دیا ہے اس کا تقاضا تو یہ ہے کہ جن گھروں میں وہ گناہوں کا بوجھ یاد دلا رہے تھے حج سے پاک ہو کر پھر کبھی اپنے پرانے گھروں میں داخل نہ ہوتے۔ نہ اس میں رہتے، بلکہ نئے گھر بناتے اور اس میں رہتے۔ پھر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ وہ احرام تو اپنے میقات پر باندھتے، وہاں سے احرام باندھ کر گھروں میں داخل ہونے کی کیا ضرورت پیش آتی تھی؟ یہ سب کچھ نہیں، یہ جملہ حج سے متعلق آیتوں میں آیا ہے اور معلوم ہے کہ حج کی آیتوں میں بار بار تقویٰ کی تاکید کی گئی ہے۔ مسلمانوں کو ہدایت دی جارہی ہے کہ جب خدا کا گھر تمہاری تولیت میں آئے تو ایسی عظیم عبادت کو میلہ نہ بنانا۔ جب کہ موجودہ متولیوں نے اسے میلہ بنا رکھا ہے۔ ہر گھر کا ایک دروازہ ہوتا ہے، اسی دروازے سے لوگ گھر میں آتے اور نکلتے ہیں۔ خدا کے گھر کا بھی ایک دروازہ ہے جس کا نام 'تقویٰ' ہے۔ پس جو کوئی حج کے ارادے سے نکلے اسے تقویٰ کا زادِ راہ لے کر نکلنا چاہیے اور حج کے ایام میں بھی یہ زاد اپنے پاس رکھے اور حج سے فارغ ہو کر جب واپس ہو تو یہ زادِ راہ ساتھ رہے۔ اگر کوئی شخص اس زادِ راہ کے بغیر سفر حج پر نکلتا ہے تو اس کی مثال اس نادان کی سی ہے جو گھر میں اس کے دروازے سے داخل ہونے کے بجائے چھت پھاڑ کر اندر پھاندے یا پچھواڑے سے نقب لگا کر اندر آئے۔ عرب جاہلیت نے حج کی عبادت کو بالکل الٹ

کر رکھ دیا تھا۔ (ص ۶۲-۶۳)

روایات کے باب میں مولانا ندویؒ کا موقف ایک اور اقتباس سے واضح ہوتا ہے۔ سورہ نساء آیت ۱۹ کی تفسیر پر مولانا امین احسن اصلاحی صاحب پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس آیت کی تفسیر میں مولانا اصلاحی نے شان نزول کی روایت پر اعتماد کیا ہے حالانکہ خود لکھ چکے ہیں کہ براہِ راست غور کرنے کا طریقہ انھوں نے اپنایا ہے، جس مکروہ جاہلی رسم کا انھوں نے ذکر کیا ہے وہ اگر صحیح سند کے ساتھ نقل ہوئی ہے جب بھی اسے آیت زیر بحث کی تفسیر بنانا صحیح نہیں ہے اور مولانا جانتے ہیں کہ کتنی ہی شانِ نزول کی روایتوں کو قرآنی آیات کی تفسیر بنا دیا گیا ہے۔ یہ فہم قرآن کی راہ میں بڑی رکاوٹ ثابت ہوئی ہے۔ خود مولانا تدبر جلد اول کے مقدمہ میں وہ بات کہتے ہیں جو ہم نے ابھی عرض کی ہے اور تدبر جلد ہشتم کے تمہیدی نوٹ میں فرماتے ہیں:

''تفسیر کی کتابوں، قدیم آسمانی صحیفوں، تاریخ کی کتابوں اور شان نزول کی روایتوں سے بھی اس میں پورا پورا فائدہ اٹھایا گیا ہے لیکن ان کو قرآن کے تحت رکھ کر استفادہ کیا گیا ہے۔ یہ نہیں ہے کہ ان کو قرآن پر حاکم بنا دیا گیا ہو اور قرآن کے الفاظ ان کو قبول کریں یا نہ کریں لیکن ان کو قرآن میں گھسانے کی کوشش کی گئی ہو۔ (تدبر ج ۸ ص ۸ بحوالہ تدبر قرآن پر ایک نظر)

لیکن افسوس ہے کہ مولانا نے اس آیت کی تفسیر میں شانِ نزول کی روایت کو قرآن پر حاکم بنا دیا اور قرآن کے الفاظ اس روایت کو قطعاً قبول نہیں کرتے لیکن مولانا نے زبردستی اسے گھسیڑنے کی کوشش کی ہے۔ اس بات کا کیا قرینہ ہے کہ یہاں ''النساء'' سے مراد باپ کی بیویاں ہیں اور ورث یرث جو باب حسب سے قرآن میں استعمال ہوا ہے اس کا یہ مفہوم ہے کہ وہ اپنے باپ کی بیویوں کو اپنی میراث میں شامل کر لیتے تھے، قرآن میں یا عربی زبان میں کہاں استعمال ہوا ہے؟ اسی سورہ نساء کی آیت میراث ورثہ ابواہ آیا ہے، کیا اس کا یہ مطلب ہوسکتا ہے کہ مرنے والا اپنے والدین کی میراث بن جائے اور کیا سورہ نمل آیت ۱۶ میں ورث سلیمان داؤد کا یہ مطلب لینا صحیح ہوگا کہ سلیمان میراث میں ان کے باب دادا بھی آ گئے تھے۔

غرض جو مفہوم مولانا نے لیا ہے اس کا عربی زبان میں کلام عربی میں، جاہلی خطب میں، جاہلی اشعار میں، قرآن میں، حدیث میں کہیں دور دور تک پتہ نہیں ہے۔ یہ سب نتیجہ ہے اس بات کا کہ مولانا کو خیال نہیں رہا اور انھوں نے شانِ نزول والی روایت کو قرآن پر حاکم بنا دیا۔ (تدبر قرآن پر ایک نظر ص ۱۲۱-۱۲۰)

آخر میں ایک اور نمونہ ملاحظہ فرمائیں جس سے مولانا ندوی کے تفسیری رجحانات پر بخوبی روشنی پڑتی ہے۔سورہ یوسف آیت ۱۵ فلما ذهبوا به أجمعوا ان يجعلوه فى غيابة الجب واوحينا اليه اور سورہ صافات آیات ۴-۱۰۳ فلما اسلما وتله للجبين ونادينا ه ان يا ابراهيم مذکورہ آیات میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ 'فلما' کا جواب کیا ہے؟

اسی طرح سورہ زمر آیت ۷۳ وسيق الذين اتقوا ربهم الى الجنة زمرا حتى اذا جاؤوها وفتحت ابوابها میں 'اذا' کا جواب کہاں ہے؟

ہمارے قدیم اہل زبان وادب میں علماء بصرہ کا خیال ہے کہ ان مقامات پر 'فلما' اور 'اذا' کا جواب محذوف ہے۔اور علماء کوفہ بالعموم یہ سمجھتے ہیں کہ مذکورہ آیات میں 'واوحينا'، 'وناديناه'، 'وفتحت ابوابها' میں واؤ زائد ہے اور یہی 'لما' اور 'اذا' کا جواب ہے۔

علمائے تفسیر بالعموم انہیں دونوں مکتبۂ فکر کے مقلد نظر آتے ہیں چنانچہ کوئی کہتا ہے کہ واؤ زائد ہے اور کوئی ان کا جواب محذوف بتاتا ہے۔لیکن مولانا جلیل احسن ندوی مرحوم فرماتے ہیں کہ ان تینوں آیتوں میں 'واؤ' اتصال زمانی کے لیے ہے اور بطور نظیر اور استشہاد معلقات کے نامور شاعر حضرت لبید کا یہ شعر پیش کرتے

حتى اذا يئس الرماة وارسلوا منخفضا دواجن قافلا اعصابها

یہاں تک کہ جونہی شکاری مایوس ہوئے شکار ان کے تیروں کی رسائی سے باہر نکل گئے تو فوراً ہی ان نے اپنے پالتو کتے چھوڑ دئے جن کے کان لٹکے ہوئے اور گلے میں پٹے پڑے ہوئے تھے۔

اس شعر کی روشنی میں مولانا کے نزدیک ان تینوں آیات کا ترجمہ اس طرح ہوگا۔

سورہ یوسف آیت ۱۵ فلما ذهبوا به واجمعوا ان يجعلوه فى غيابة الجب

''جیسے انھوں نے کنویں میں ڈالنے کا فیصلہ کیا ویسے ہی ہم نے یوسف کو غیبی طور سے بتایا کہ'' اسی طرح صافات میں آیات ۴-۱۰۳ میں ''جیسے ہی ان دونوں نے سر تسلیم خم کیا اور ابراہیم کی چھری اسماعیل کی گردن پر چلنے ہی والی تھی ویسے ہی ہم نے ندا دی......'' اور سورہ زمر آیت ۷۳ کا ترجمہ ہوگا ''اور جیسے ہی فرشتے اہل ایمان کو جنت کے دروازے پر لے کر پہنچیں گے ویسے ہی اس کے دروازے کھل جائیں گے۔

☆☆☆

مولانا شبیر احمد انور اصلاحیؒ

ڈاکٹر مجاہد الاسلام بختاوری فلاحی☆

جامعۃ الفلاح بلریا گنج اعظم گڑھ کی تاریخ سے ایک نام جو بتدریج گم ہوتا جارہا ہے اور ماضی کا ایک حصہ بن چکا ہے، وہ نام شاید بلکہ یقیناً مولانا شبیر احمد انوؔر اصلاحی رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت ہے۔ جامعۃ الفلاح اپنے بالکل ابتدائی دور میں جبکہ وہ جامعہ اسلامیہ ہوا کرتا تھا، ایک ایسی شخصیت کا منتظر تھا جو اپنے آپ کو پوری طرح اس باغِ نو کی آبیاری، اس کو پروان چڑھانے اور اس کی تعمیر وترقی اور اس کی نشوونما میں لگادے۔ بالآخر ۱۹۶۲ء میں وہ شخصیت مولانا شبیر احمد اصلاحی کی صورت میں اس ادارہ سے منسلک ہوگئی بلکہ اس نے اس مدرسہ کی خاطر اور اس کو پروان چڑھانے کے لیے اپنا گھر بار چھوڑ دیا اور ہمیشہ کے لیے اسے اپنا گھر بنالیا اور دل وجان سے اس ادارہ کی تعمیر میں اپنا خون پسینہ اور اپنی جان تک نچھور کردی۔ غالبًا آپ سب کو ستمبر ۱۹۸۱ء کی وہ سولھویں تاریخ یاد ہوگی جب ظلمتِ شب میں کچھ شر پسند عناصر نے اس شخصیت پر قاتلانہ حملہ کردیا اور جائے واردات سے فرار ہوگئے۔ آپ صدر مدرس کی حیثیت سے اس وقت فلاح کی ذمہ داریوں کو سنبھالے ہوئے تھے اور بحسن وخوبی اس کا انتظام چلا رہے تھے۔

مولانا شبیر احمد اصلاحی مرحوم کا تعلق مئوناتھ بھنجن کے ایک قربہ بختاور گنج سے تھا۔ ایک باعزت اور باحیثیت خاندان سے تعلق تھا۔ ۵/محرم الحرام ۱۳۵۰ھ میں پیدائش ہوئی۔ ابتدائی تعلیم مئو میں ہوئی۔ جامعہ مفتاح العلوم سے فراغت حاصل کی اور مزید تعلیم وتربیت کے لیے مدرسۃ الاصلاح سرائے میر چلے گئے، جہاں سے تعلیم کے ساتھ ساتھ تحریکی اور دعوتی فکر بھی نمایاں ہوئی اور یہاں سے فارغ التحصیل ہوئے۔ شروع سے ہی متحرک، فعال، خطیب اور جوشیلے نوجوان تھے اور ہمیشہ نئے جذبے اور لگن کے ساتھ بہت کچھ کرنے کا جذبہ رکھتے تھے۔ شروع سے درس وتدریس اور خطابت و کتابت سے منسلک تھے۔ جہاں وہ اپنے مضامین میں تدریس پر پوری طرح عبور رکھتے تھے وہیں ایک ماہر خطیب اور بہترین منتظم اور مشفق ومربی استاذ بھی تھے۔ جامعۃ الفلاح کو بنانے اور سنوارنے

☆ دوحہ قطر

میں اور اس کی تعمیر وترقی اور صفائی وستھرائی میں بنفس نفیس اپنی حیثیت کو بھلا کر بذاتِ خود حصہ لیا کرتے تھے۔ چنانچہ طلبہ بھی بصد شوق پیش پیش رہتے تھے اور پوری طرح ان کا ساتھ دیا کرتے تھے۔ طلبہ کے ساتھ جہاں سختی کے ساتھ پیش آتے وہیں ان کے ساتھ شفقت ومحبت کا بھی معاملہ کرتے۔ قرب وجوار میں فلاح کے چندہ کے لیے اور اس کی ترقی کے لیے خود جایا کرتے۔ بہت مواقع ایسے آئے جب دوسری جگہوں سے ملازمت کے لیے بھاری تنخواہ کے ساتھ بلایا گیا لیکن فلاح سے منسلک ہونے کے بعد آپ نے سوائے فلاح کی تعمیر وترقی کے کسی اور جانب اپنی نظر مرکوز نہیں کی۔ صرف پیش نظر جو مقصد پوری زندگی ان پر حاوی رہا وہ بس فلاح تھا، تعلیم تھی اور بچوں کی تربیت تھی۔ حادثہ سے پہلے تک ان کی زندگی کا محور اور ساری تگ ودو اور ساری توانائیاں فلاح کی تعمیر وترقی اور طلبہ کی تعلیم وتربیت سے متعلق تھیں اور حقیقتاً فرد واحد جو کر سکتا ہے وہ انھوں نے کیا اور سب کو ساتھ لے کر، قدم سے قدم ملا کر پوری ایمانداری کے ساتھ فلاح کی خدمت انجام دی۔......

لیکن ہائے افسوس! وہ حادثہ جس نے ان کی شخصیت کو مٹا ڈالا۔ حادثہ سے پہلے کی وہ شخصیت ختم ہوگئی اور اب نہ تو وہ صحیح سے بول سکتے تھے اور نہ چل سکتے تھے۔ سوچنے اور سمجھنے کی وہ صلاحیتیں ختم ہوگئیں جو پہلے ہوا کرتی تھیں۔ اب دوسری شخصیت تھی۔ لیکن حادثہ کے بعد بھی جامعہ کی محبت ویسی ہی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ روبصحت ہونے کے بعد بھی جامعہ جاتے رہے اور اپنی بچی کھچی صلاحیتوں سے جامعہ کی خدمت کرتے رہے اور طلبہ کو اپنے پسندیدہ مضامین اپنے خاص پیرایہ میں سمجھاتے رہے۔

مولانا عربی زبان خصوصاً علم نحو کے استاذ تھے، سراجی پر بھی عبور حاصل تھا۔ اس کے علاوہ تمام مضامین پر دسترس حاصل تھی، بچوں کی تعلیم وتربیت پر خصوصی توجہ دیتے تھے اور حسنِ انتظام اور نظم وترتیب کی وجہ سے ہی جانے جاتے تھے۔ ان کی کچھ متفرق تحریریں ہیں، کچھ تو غائب ہیں۔ میراث اور ترکہ پر ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریریں باوجود تلاش کے اب تک نہیں مل سکی ہیں۔ علم نحو پر بھی ایک کتابچہ 'معلم النحو' کے نام سے ہے۔ ان کے ہاتھوں منتخب کیا ہوا احادیث کا ایک مجموعہ 'منتخبات الحدیث' کے نام سے ہے جس کو کتابی شکل دینے کی ضرورت ہے۔ ایک تحریر کتابی شکل میں ان کے تجربات کی روشنی میں 'اصول تعلیم' کے نام سے ہے جو تین حصوں پر مشتمل ہے۔

پہلا حصہ: بچوں کی نفسیات اور ان کی تربیت سے متعلق ہے۔

دوسرا حصہ: انتظام مدرسہ سے متعلق ہے اور

تیسرا حصہ: اصولِ تدریس سے متعلق ہے۔

مولانا لڑکیوں کی تعلیم کے لیے بہت فکر مند رہتے تھے۔ چنانچہ جامعۃ الفلاح سے متعلق نسواں کا ایک علاحدہ شعبہ تھا جو شروع میں ثانوی درجات پر مشتمل تھا۔ مولانا نے اس وقت 'بنات مدرسہ' کے نام سے ایک نظم لکھی تھی جو ان کے دلی جذبات کی ترجمان تھی۔ اس کے کچھ اشعار یوں تھے:

میری قانتہ، محسنہ نیک سیرت
یہ سیما، سویدہ، یہ رعنا، مسرت

تمہیں سے ہے رونق صحن چمن میں   کہ جیسے چمکتے ہوں تارے گگن میں
بنات مدرسہ، جہالت کی دشمن   ہو روحِ بہاراں تمہیں جانِ گلشن
حیات اور غیرت کی تصویر ہو تم   کہ انور کے خوابوں کی تعبیر ہو تم
کرو عام تم اسم ایمان و عصمت   لیے جاؤ بیٹی یہ میری نصیحت
تمہیں حسنِ اخلاق فرحت عطا ہو   تمہیں نیک عذرا کی عصمت عطا ہو
رضیہ سے حسنِ رضا لے کے جاؤ   زبیدہ کے دل کی دعا لے کے جاؤ
گل طیبہ کی عطر بیز نکہت   تمہیں بھی عطا ہو یہ فیضانِ رحمت

حسیب مکرم نے دی ہیں دعائیں
ستاروں کی مانند سب جگمگائیں(۱)

آخر میں مولانا کی وہ تحریر پیش کر رہا ہوں جو انھوں نے 2001 میں فارغین طلبہ فلاح کے نام لکھا تھا

''عزیزم! حفظکم اللہ من کل بلاء الدنیا وعذاب الآخرۃ

آپ کو وہ دن یاد ہوں گے جب آپ جامعہ میں تھے (۸-۱۰-۱۵ سال) جتنے دن بھی آپ ہمارے پاس تھے تقریباً دو سو آنکھیں مستقل آپ کی نگرانی کرتی رہتی تھیں۔ آپ کا اٹھنا بیٹھنا، سونا جاگنا، آنا جانا، دوستی دشمنی، دلچسپیاں، نفرتیں سب ہماری نگرانی میں تھیں۔ اس سلسلہ میں کبھی آپ نے مار کھائی ہوگی، کبھی ڈانٹ سنی ہوگی اور کبھی شاباشی بھی ملی ہوگی، مگر آہ آج آپ ہم سے دور ایک ایسے جنگل میں ہیں جو خاردار جھاڑیوں سے گھرا ہوا ہے۔ راستہ بڑا مشکل ہے، ہر قدم پر ٹھوکر، نکڑ پر انسان نما شیطانچے آپ کی راہ کھوٹی کرنے کی جان توڑ کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ اس کے

(۱) قانتہ، محسنہ، سیما، سویدہ، رعنا اور مسرت یہ سب طالبات نسواں تھیں۔ فرحت، عذرا، رضیہ، طیبہ اور زبیدہ انوری (والدہ محترمہ مرحومہ) یہ وہ ٹیچریں تھیں جو اس وقت نسواں میں پڑھایا کرتی تھیں۔ انور یعنی مولانا شبیر احمد اصلاحی اور حسیب مکرم یعنی مولانا عبدالحسیب اصلاحی صاحب۔

ساتھ ہی یہ دنیا ایک نوجوان شہزادی کے روپ میں اپنی ساری رعنائیوں کے ساتھ، ہر قسم کے تقویٰ شکن ناز و ادا سے آپ کو ہیت لک کی دعوت دے رہی ہوگی اور آپ کا دامن پیچھے سے پکڑ کر کھینچ رہی ہوگی، ساتھ ہی آپ کو دھمکی بھی دے رہی ہوگی کہ اگر اس کے دام میں نہیں آئے تو جیل، قید و بند اور عذاب میں مبتلا کر دے گی۔ ایسے میں اس کی ہمت کا جواب ہمت سے دینے سے پہلے آپ کو آپ کے رب کی برہان کی ضرورت ہوگی۔

بیٹے! گھبراؤ نہیں۔ آؤ تم کو دو ہتھیار دیتا ہوں، اس کو استعمال کرو گے تو راہ کا ہر روڑا ہٹ جائے گا۔ ہر جھاڑی سے تم اپنا دامن بچا لو گے۔ دنیا کی شہزادی کا کوئی دام تم پر نہ چل سکے گا۔ جانتے ہو وہ دو ہتھیار کیا ہیں؟...... تمہارے رب نے بنی اسرائیل سے تاجِ امت چھین کر امت مسلمہ کے سر پر رکھا تھا اس وقت امت کو وہ ہتھیار دے دیے تھے اور فرمایا تھا جب تک یہ ہتھیار تم اپنے پاس رکھو گے میں تمہارے ساتھ رہوں گا اور تم کو ہمیشہ غالب رکھوں گا۔ شیطان کی چالوں سے بچاؤں گا۔ وہ ہیں:

صبر اور نماز "استعینوا بالصبر والصلاۃ ان الله مع الصابرین"

صبر یہ ہے کہ تم اپنے ایمان پر جم جاؤ، تمہاری بوٹی بوٹی کر دی جائے اور تم کو جان بھی دینا پڑے تب بھی تم اپنے دین پر جمے رہنے کا عزم پختہ رکھو۔ اس کے بعد تمہارے سارے کام بنا دوں گا۔

ذرا سورۃ بقرہ میں: یا ایہا الذین اٰمنوا استعینوا ...... سے ...... اولٰئك هم المهتدون (سورہ بقرہ: ۱۵۳-۱۵۷) تک غور سے پڑھو، ان شاء اللہ تمہاری ساری مشکلات حل ہوں گی۔ ہماری کمی محسوس نہیں ہوگی۔ دعا گو: شبیر احمد اصلاحی۔" [یادگار ڈائری (۲۰۰۲ء-۲۰۰۱ء) فارغین عالمیت جامعۃ الفلاح]

جیسا کہ بتا چکا ہوں کہ مولانا ۱۹۶۲ء سے جامعۃ الفلاح کی خدمت میں لگ گئے تھے۔ کئی مرتبہ جامعہ کے صدر منتخب ہوئے۔ پہلی مرتبہ ۱۹۶۴ء سے ۱۹۶۵ء تک، دوسری بار ۱۹۷۳ء سے ۱۴/اکتوبر ۱۹۷۷ء تک اور آخری مرتبہ ۶/فروری ۱۹۸۱ء سے ۱۶/ستمبر ۱۹۸۱ء تک۔ اور یہی صدارت کا آخری دن تھا جس دن ان پر جامعہ میں قاتلانہ حملہ ہوا۔ اس کے پس پردہ کیا عوامل تھے، اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔

اس کے بعد اللہ جل شانہٗ نے دوسری زندگی عطا کی اور ان کا سایہ ہمارے اوپر قائم رہا۔ بالآخر ۵-۶/دسمبر ۲۰۱۰ء کی درمیانی شب میں مختصر علالت کے بعد اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی لغزشوں کو درگزر فرمائے اور ان کی مساعی کو قبول فرمائے اور ان کے لیے صدقۂ جاریہ بنائے۔ اللہ تعالیٰ انھیں اپنی رحمتِ جاوداں میں داخل کرے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ آمین ☆

میرے بھیا، میرے محسن، میرے مربی

اقبال احمد اصلاحی ندوی مدنی ☆

میری پرورش اور تعلیم و تربیت میں جس نے اہم کردار ادا کیا ہے، عورتوں میں میری بہن جمیلہ اور مردوں میں میرے بھیا مولانا شبیر احمد اصلاحی۔ ابھی میں چند سال کا تھا کہ میری والدہ کا انتقال ہو گیا۔ میرے والد صاحب اکثر سفر میں رہتے تھے۔ ابتدائی تعلیم اور دیکھ بھال میری بہن اور دادا اور بھیا کرتے تھے۔

میرے بھیا میرے لیے جہاں ایک مہربان بھائی تھے، وہیں میرے لیے وہ ایک محسن اور مربی اور شفیق باپ کی حیثیت سے تھے، ایک باپ جس طرح اپنی اولاد کو دینی، دنیوی، علمی اور اخلاقی اعتبار سے بہت اونچا دیکھنا چاہتا ہے، اسی طرح میرے بھیا بھی ہر طرح کی خوبیوں سے آراستہ مجھے دیکھنا چاہتے تھے۔ اس سلسلہ میں کسی طرح کی سستی اور لاپرواہی نہیں کرتے تھے۔ میرے بھیا کو بچپن ہی سے میری تعلیم و تربیت اور اچھی پرورش کی فکر رہا کرتی تھی، جہاں بھی رہا ہمیشہ اپنے قیمتی مشوروں اور نصیحتوں سے رہنمائی کیا کرتے تھے۔ ہر کام میں ہمت بندھاتے تھے۔ میں بھی ہر موڑ اور ہر چھوٹے بڑے معاملے میں، چاہے میرا ذاتی ہو یا بچوں کا برابر مشورہ طلب کرتا رہتا اور رائے لیتا رہتا تھا اور ان پر عمل کرنے کی کوشش بھی کرتا تھا لیکن اب کس سے مشورہ لوں گا اور کون میری دلجوئی کرے گا ۔

ولمن اقول اذا تلم ملمة
ارني برايك ام الى من افزع

بھیا میری سادہ لوحی اور کم گوئی اور میری زود حسی سے بہت فکر مند اور پریشان رہا کرتے تھے، ذرا سی بات پر گھنٹوں، بلکہ دنوں سوچا کرتے تھے، میری اچھی تعلیم کے لیے بھی بہت فکر مند رہا کرتے تھے۔ ابھی میں جامعہ مفتاح العلوم مئو میں پرائمری میں تھا اور وہ مدرسۃ الاصلاح سرائے

☆ مئو

میر میں زیر تعلیم تھے۔ ۱۹۵۱ء میں مدرسۃ الاصلاح لے گئے کہ اپنی نگرانی میں رکھیں گے اور دیکھ بھال کریں گے۔ عربی اول میں داخلہ ہوا، بھیا کا آخری سال تھا لیکن والد صاحب کی سخت علالت اور کچھ گھریلو پریشانیوں کی وجہ سے درمیان سال ہی میں مدرسہ چھوڑنا پڑا، چونکہ ابھی میں نیا تھا، پہلی بار گھر سے اتنی دور باہر آیا تھا۔ مدرسہ کا کھانا اچھا نہیں لگتا تھا۔ چھوڑنے سے پہلے اپنے ایک ساتھی محمد انصار صاحب جن کا باورچی خانہ سے کچھ تعلق تھا، کھانے پینے کے سلسلہ میں دیکھ بھال اور مدد کرنے کا ذمہ دار بنا گئے اور مولانا شہباز صاحب اصلاحی (مرحوم) جن سے بھیا کے بہت گہرے مخلصانہ اور برادرانہ تعلقات تھے، کی رہنمائی اور نگرانی میں کر گئے، بھیا کے جانے کے بعد مولانا نے بھیا کی کمی محسوس نہیں ہونے دی، برابر میرا خیال رکھتے، ہمیشہ خیریت معلوم کرتے، چونکہ اردو میں بہت کمزور تھا، چھوٹی چھوٹی دینی اصلاحی کہانیوں کی کتابیں لاکر دیتے اور پوچھا کرتے، ان کے بڑے بھائی ماسٹر محمد عالم صاحب بھی بہت خیال رکھتے۔ جب کبھی بیمار ہوتا مدرسہ کے اسپتال میں لے جاتے، ڈاکٹر کو دکھاتے، دوا دلاتے اور پابندی سے وقت پر دوا کھانے کی تاکید کرتے۔

عربی سوم میں قرآن مجید مولانا مرحوم کے ذمہ تھا، برابر سمجھ کر پڑھنے کی تاکید کرتے، یاد کرنے پر زور دیتے، انھیں کے زمانہ میں سورہ حدید سے سورہ ناس تک یاد کر لیا تھا، مولانا نے تاج کمپنی کا چھوٹے سائز کا ایک خوبصورت قرآن شریف دیا، جو آج تک موجود ہے۔

مدرسۃ الاصلاح سے فراغت کے بعد ندوۃ العلماء میں مزید تعلیم حاصل کرنے کی خواہش اور شوق تھا۔ بھیا نے میرے اس شوق کو بھی اپنے مخلص ساتھی حضرت مولانا سعید الرحمٰن صاحب ندوی کے واسطہ سے پورا کیا۔ مولانا کے توسط سے تخصص فی الادب العربی کے دوسرے سال میں داخلہ مل گیا۔ مولانا مدظلہ بھیا کے بہت گہرے اور مخلص ساتھی ہیں۔ دونوں نے ایک ساتھ الہٰ آباد بورڈ کے عالم و فاضل کا امتحان دیا۔ مولانا مدظلہ ندوۃ العلماء کی طالب علمی کے زمانہ میں میرا بہت زیادہ خیال رکھتے۔ برابر خیریت معلوم کرتے، کسی بھی چیز کی ضرورت ہوتی فوراً پوری کرتے، اپنی قیمتی نصیحتوں سے نوازتے رہتے۔ ہر طرح سے مدد کرتے۔

جب میں ندوہ سے فارغ ہوا تو جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کا قیام عمل میں آچکا تھا، میری بھی دلی خواہش تھی کہ وہاں پڑھوں اور اس مقدس سرزمین میں رہنے کی سعادت حاصل کروں، یہ خواہش اور سعادت بھی حضرت مولانا مدظلہ کی وساطت سے حاصل ہوگئی۔ حضرت مولانا کی شفقت اور ہمدردی میرے ساتھ آج تک قائم ہے۔ اب بھی ایک چھوٹے بھائی کی طرح عزیز رکھتے ہیں۔

جب کبھی حاضر خدمت ہوتا ہوں بہت خوش ہوتے ہیں۔ کھانے پر بلاتے ہیں، مہمان خانہ میں قیام کا انتظام کرا دیتے ہیں، اللہ سے دعا ہے مولانا کی یہ شفقت اور یہ تعلق تا دم حیات باقی رہے۔ یہ سعادتیں بھیا ہی کی وجہ سے تو حاصل ہیں۔

نائجیریا سے واپسی کے بعد برابر بھیا کی خدمت میں حاضر ہوتا، جو خواہش اور ضرورت ہوتی پوری کرنے کی کوشش کرتا، وہ شروع سے مجھے بابو کہہ کر بلاتے۔ اس عمر میں بھی بابو ہی کہتے۔ جب کبھی حاضر خدمت ہوتا، بچے چڑھاتے، کہتے آپ کے بابو آگئے۔ اب تو ہم لوگوں سے کوئی مطلب نہیں رہے گا۔ میری حاضری سے بہت خوش ہوتے، ایک ایک بچے کی خیریت معلوم کرتے، ان کو دعائیں دیتے۔ یوسف، عذرا اور لبنیٰ کو بہت یاد کرتے، لبنیٰ کو خاص طور پر یاد کرتے۔ وہ ان کے یہاں کئی ماہ رہ چکی تھی، ان سے بہت بے تکلف ہوگئی تھی۔ اس نے ان کا بیڑی پینا چھڑا دیا تھا۔ علالت کے آخری ایام میں بھی ان کو ہمیشہ میرا انتظار رہتا تھا جب بھی خیریت معلوم کرنے کے لیے فون کرتا، پوچھتے کب آرہے ہو؟ بغرض علاج جب ان کو اعظم گڑھ اقصیٰ اسپتال لے گئے، وہاں جب بھی ان کو محسوس ہوتا کہ میں ان کے قریب ہوں، فوراً میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے، آنکھوں سے لگاتے، سینہ سے لگاتے اور دعا دیتے اور اپنے پاس سے اٹھنے نہ دیتے۔ ان کی خواہش ہوتی کہ ان کے پاس ہی رہوں۔ سچی بات ہے کہ بھیا کے میرے اوپر اتنے احسانات ہیں کہ ان سے کبھی سبکدوش نہیں ہوسکتا۔

بھیا اپنے بچوں اور ان کی اولاد کو علمی، اخلاقی میدان میں بہت اونچا دیکھنا چاہتے تھے۔ اسی لیے اپنے بچوں کو اور ان کی اولاد کو جامعۃ الفلاح میں داخل کرایا اور تعلیم دلائی اور اپنے تمام بیٹے، بیٹیوں کی شادی دیندار گھرانے میں کی۔ یہی وجہ ہے کہ سبھی بچے دیندار اور با اخلاق ہیں۔

بھیا کی محبت اور شفقت اور دردمندی اپنے بچوں اور گھر والوں سے لے کر اہل خاندان اور اقارب تک پھیلی ہوئی تھی۔ ان کو اپنے خاندان اور رشتہ داروں کی بھی فکر رہا کرتی تھی۔ ان کے ہر دکھ درد اور خوشی و غم میں برابر شریک ہوتے اور ان کے ہر چھوٹے بڑے معاملہ سے دلچسپی رکھتے، ان میں اتحاد و اتفاق پیدا کرنے کی کوشش کرتے۔ جس حد تک ممکن ہوتا ان کے کام آتے، ان کی مدد کرتے، ان کے اندر خدمت کرنے کا بے انتہا جذبہ تھا، کوئی بھی بیمار ہو جاتا، خواہ کتنا ہی چھوٹا ہو، اس کی خدمت اور مدد کے لیے تیار ہو جاتے، انھوں نے اپنے والد، دادا اور بڑے بھائی کی بیماری میں بے انتہا خدمت کی۔ ان کے پیشاب سے تر بستر کو ندی لے جاتے اور اپنے ہاتھ سے دھوتے، کبھی

نہیں گھبراتے، نہ گھن کرتے، اللہ تعالیٰ نے ان کی اس خدمت اور نیکی کا بدلہ اس دنیا ہی میں اس طرح دیا کہ ان کی بچیوں، بہوؤں اور پوتی اور بیٹوں نے ان کی طویل بیماری کی حالت میں بغیر گھبرائے بغیر شکوہ کیے جس طرح خدمت کی اس کی بھی مثال کم ملے گی۔ خاص کر ان کی پوتی سمیہ اور اس کی ماں ان کی ہر طرح خدمت کرتی رہی۔ ان کی خدمت ہی کی وجہ سے پڑھائی میں توجہ نہیں دے پاتی تھی، بلکہ فیل بھی ہوگئی، بھیا بھی اس سے بہت محبت کرتے تھے۔ بروا آبا کُم تبرا بناؤکم کے صحیح مصداق تھے۔ انھوں نے اپنے باپ، دادا اور بھائی کی دل و جان سے خدمت کی، ان کے بچوں نے ان کی ہر طرح کی خدمت کی، ان کی جھڑکیاں کھائیں، مار تک کھائی لیکن خدمت سے کبھی منھ نہیں موڑا۔

حادثہ سے قبل برابر اپنے گاؤں بختاور گنج جایا کرتے، لوگون کو اکٹھا کرتے، ان کے آپس کے اختلافات کو دور کرتے۔ ان میں اتفاق و اتحاد پیدا کرنے کی کوشش کرتے۔ خاندان میں ان کی حیثیت ایک سردار کی تھی۔ سب ان کا احترام و عزت کرتے۔ ہر معاملہ میں ان سے مشورہ لیتے۔ ان کے فیصلے کو قبول کرتے، خاندان کی بچیوں کو اپنی بچیوں کی طرح نصیحت کرتے۔ پردہ کرنے پر زور دیتے، بے پردگی سے ناراض ہوتے، سختی سے منع کرتے، بچیوں کے لیے ایسے اشعار کہتے جن میں دین کی باتیں ہوتیں۔

جامعہ اور جامعہ کے اساتذہ و طلبہ سے تعلق اور لگاؤ

بھیا مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر چھوڑنے کے بعد مختلف مدارس میں تعلیم و تربیت کا فریضہ انجام دیتے رہے۔ آخر میں ۱۹۶۰ء میں بلریا گنج مکتب اسلامی (موجودہ جامعۃ الفلاح) میں تعلیم و تدریس اور تربیت کا فریضہ انجام دینے کے لیے آئے اور یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ یہاں آنے کے بعد ان کو ایک ہی دھن تھی اور ایک ہی لگن تھی کہ یہ مکتب ایک معیاری جامعہ اسلامیہ بن جائے۔ ندوۃ العلماء اور مدرسۃ الاصلاح کی طرح دین کی مکمل تعلیم ہو۔ اس میں علوم دینیہ کے ساتھ ساتھ علوم عصریہ کی بھی تعلیم دی جائے۔ اس سے فارغ ہونے والے کسی میدان میں پیچھے نہ رہیں اور 'جو گروہی، جماعتی اور فقہی اختلافات سے بالاتر ہو کر معاشرہ کی اصلاح و تعمیر کا فریضہ انجام دے سکیں۔'' اپنی اس خواہش اور منصوبے کو بروئے کار لانے کے لیے برابر تگ و دو کرتے رہے۔ مدرسہ کا دائرہ اور درجات بڑھاتے رہے لیکن ان کے اس جذبہ اور خواہش کی شروع شروع میں ہمت افزائی اور پذیرائی بہت کم لوگوں نے کی بلکہ زیادہ تر لوگ ایک پاگل کی بڑ سمجھتے مگر ڈاکٹر خلیل احمد اور ماسٹر جنید احمد اور مولانا محمد عیسیٰ صاحب جیسے حضرات برابر ہمت افزائی کرتے رہے، حوصلہ بڑھاتے

رہے اور ان کی کوششوں کو سراہتے رہے۔ اللہ تعالیٰ نے بہت جلد ان کی اس دیرینہ خواہش کی تکمیل کی صورت پیدا فرمادی اور ان کا دیرینہ خواب بہت جلد پورا ہو گیا اور ان کے جیتے جی اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ان کے منصوبے اور پلان کے مکمل ہونے کی صورت نکل آئی اور ایسے اسباب پیدا ہو گئے کہ چند سال کے اندر مکتب نے جامعہ کی صورت اختیار کر لی اور اسلامی مکتب جامعۃ الفلاح کے نام سے جانا جانے لگا۔ اس جامعہ نے چند سال کے اندر جو اعلیٰ مقام حاصل کیا شاید ہی کسی جامعہ نے اتنی قلیل مدت میں اتنا اونچا مقام اور اتنی زیادہ شہرت، داخل ہند اور بیرون ہند حاصل کی ہو، جامعہ کو ایسے اساتذہ مل گئے جو انتہائی قابل اور اپنے فن میں ماہر تھے، مولانا شہباز اصلاحی جیسا ہمہ گیر صلاحیت کا مالک اور مولانا جلیل احسن ندوی جیسا ماہر تفسیر و ادب مل گئے اور بعد میں بھی مولانا عبدالحسیب اصلاحی، مولانا ابوبکر اصلاحی، مولانا عنایت اللہ اصلاحی سبحانی جیسے لائق اور قابل، ماہر فن اساتذہ مل گئے جس سے جامعہ کو چار چاند لگ گیا۔ اس کی شہرت بیرون ملک عرب ممالک کے علاوہ مغربی ممالک تک جا پہنچی اور پڑھنے کے لیے مدرسہ کاشف العلوم، چترپور، ضلع ہزاری باغ کے بہت سے طلبہ یہاں آگئے اور ایک ساتھ کئی عربی درجات کھل گئے۔

جامعہ کا نام جامعۃ الفلاح کیسے پڑا؟

بھیا برابر سوچا کرتے تھے کہ اس مدرسہ اسلامیہ سے فارغ ہونے والوں کا کس نسبت سے تعارف ہو، جس طرح ندوۃ العلماء کے فارغین ندوہ کی نسبت سے ندوی، اور مدرسۃ الاصلاح کے فارغین اصلاحی کہے جاتے ہیں۔ اس مدرسہ کا بھی کوئی ایسا نام ہونا چاہیے جس کی طرف نسبت کر کے تعارف ہو، ایک رات جب وہ سو رہے تھے سنا کوئی کہہ رہا ہے کہ اس مدرسہ کا نام جامعۃ الفلاح رکھا جائے، بھیا کو یہ نام بہت پسند آیا اور بہت خوش ہوئے اور جامعہ کی مجلس انتظامیہ میں پیش کیا۔ سب نے اس کو پسند کیا اور اس کے بعد سے مکتب اسلامیہ کا جامعۃ الفلاح نام ہو گیا۔

جامعہ اس کے اساتذہ و طلبہ اور متعلقین سے تعلق اور محبت

جامعہ اور اس سے تعلق رکھنے والوں سے یہ یک گونہ محبت ہی تو ہے کہ ۱۹۸۲ء میں ان پر قاتلانہ حملہ کرنے میں جو بھی شریک تھے، ان سب کو انھوں نے معاف کر دیا کہ ان کا جامعہ سے کسی نہ کسی درجے میں تعلق تھا۔ جامعہ سے عشق ہی تو ہے کہ ان کی طویل بیماری کے زمانے میں ان کی بچیاں اپنے گھر (سسرال) خدمت اور دیکھ بھال کے لیے لے جانا چاہتی تھیں۔ ان کے چھوٹے بیٹے ڈاکٹر مجاہد الاسلام نے اپنے یہاں دہلی لے جانے کے لیے کئی بار کوشش کی تا کہ وہاں ان کی طبی

اور جسمانی خدمت ہو سکے، صرف ایک دفعہ بغرض علاج گئے اس کے بعد پھر نہیں گئے، میں نے بار بار چاہا کہ مئو رہیں، تمام رشتہ دار تو یہیں ہیں ان کو بھی خدمت کا موقع ملے گا لیکن باوجود بچیوں اور مجھ سے غایت درجہ محبت کے جامعہ سے دور رہنا پسند نہیں کیا۔ جامعہ اور جامعہ کے اساتذہ وطلبہ سے جو قلبی اور علمی رشتہ تھا وہ خونی رشتہ سے کہیں زیادہ مضبوط اور بڑھا ہوا تھا۔ اور ان کی یہی خواہش تھی کہ موت آئے تو جامعہ کے قرب و جوار میں آئے اور یہ جامعہ کے قبرستان میں اپنے مشفق استاذ مولانا جلیل احسن ندوی (نور اللہ مرقدہ) اور مولانا ابواللیث صاحب اصلاحی ندوی رحمہم اللہ کے جوار میں مدفون ہوں، اللہ تعالیٰ نے ان کی دونوں خواہشیں پوری فرما دیں۔

بھیا پہلے کافی صحت مند اور چاق و چوبند تھے۔ ہر کام وقت پر انجام دیتے تھے لیکن ۱۹۸۲ء کے حادثہ کے بعد سے جس میں انکا داہنا ہاتھ مفلوج اور زبان بھی کافی متاثر ہوگئی تھی کہ ان کی بات پورے طور پر نہیں سمجھ میں آتی تھی، آہستہ آہستہ کمزور ہوتے گئے، صحت بھی گرتی گئی۔ ادھر ایک سال سے صحت کافی متاثر ہوگئی اور کمزور ہوتے گئے، دو مہینے سے اور زیادہ کمزور اور صحت خراب سے خراب تر ہوتی گئی، کبھی کبھی ہوش و حواس کھو بیٹھتے۔ کسی کو نہیں پہچانتے اور کئی بار تو ایسی طبیعت خراب ہو جاتی کہ ان کی زندگی سے مایوسی ہونے لگتی لیکن پھر سنبھل جاتے۔ وفات سے آٹھ دس روز پہلے بے چین رہنے لگے۔ سینہ سے گھڑ گھڑاہٹ کی آواز نکلتی۔ آخری دنوں میں بلغم اتنا جم گیا تھا کہ سانس لینے میں سخت دشواری ہوتی۔ اتنے کمزور ہو گئے تھے کہ کھانس نہیں سکتے تھے کہ بلغم نکل سکے۔ بالآخر ڈاکٹروں کے مشورے سے اعظم گڑھ اقصیٰ اسپتال لے جائے گئے، پانچ روز تک اسپتال میں ایڈمٹ تھے۔ مشین سے بلغم نکالا گیا اور کمزوری کے لیے برابر ڈرپ چلتی رہی۔ کسی قدر جب حالت بہتر ہوئی تو ڈاکٹر نے ڈسچارج کر دیا اور ۴؍دسمبر کو بلریا گنج واپسی ہوئی۔ چونکہ حالت بظاہر بہتر معلوم ہو رہی تھی، اس لیے میں دو ایک روز کے لیے مئو چلا گیا، صرف ایک دن گزرا تھا کہ ایک بجے عابدہ کا فون آیا کہ ابا اس دنیا میں نہیں رہے۔ زبردست شاک لگا دل و دماغ پر ایک سکتہ طاری ہو گیا۔ یقین نہیں آ رہا تھا کہ جس بھائی کو قابل اطمینان حالت میں چھوڑ کر آیا تھا، ہٹتے ہی ہمیشہ ہمیش کے لیے ہم سے جدا ہو جائیں گے۔ دو ڈھائی گھنٹے کے اندر بلریا گنج پہنچ گئے، جانے کے بعد بچوں نے بتایا کہ شام سے ہی بے چینی اور گھڑ گھڑاہٹ میں اضافہ ہوتا گیا۔ حالت گرتی ہی جا رہی تھی۔ سب بچے دعا و قرآن پڑھ رہے تھے۔ عابدہ بھیا کو اپنی گود میں لئے زور زور سے کلمہ طیبہ، دعا اور قرآن شریف پڑھ رہی تھی جب سورہ یوسف (۱۰۱) انت ولی فی الدنیا والآخرة توفنی مسلماً والحقنی

بالصالحین پڑھنا شروع کیا، بھیا نے ہاتھ سے اشارہ کیا اور یکا یک بے چینی اور گھڑ گھڑاہٹ ختم ہوگئی۔ عابدہ اپنی ناتجربہ کاری سے اصل بات نہ سمجھ سکی، اس نے سمجھا کہ ابو کو آرام مل گیا۔ لٹانے کے لیے کہہ رہے ہیں۔ اس نے نہیں سمجھا کہ وقت آرام نہیں، بلکہ دنیا کی کلفتوں سے ہمیشہ ہمیش کے لیے آرام مل گیا اور زندگی بھر کا تھکا ہوا مسافر بہتوں کو سوگوار چھوڑ کر اپنی منزل کو جا پہنچا۔ رب رحیم آقا کے حضور پہنچ گیا۔ انا لله وانا اليه راجعون

مولائے رحیم و کریم سے دعا ہے کہ بھیا کی بال بال مغفرت فرمائے، ان کی اچھائیوں کو قبول فرمائے۔ کمزوریوں، لغزشوں، گناہوں کو معاف فرمائے۔ جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، ان کی قبر کو نور سے بھر دے اور ان کی تربت کو ٹھنڈی رکھے، پسماندگان کو صبر جمیل اور ہمت دے۔

جانے والے چلے تو جاتے ہیں — زخم گہرا لگا کے سینے میں
وقت مرہم سہی، مگر سچ ہے — لطف آتا نہیں ہے جینے میں

اللہ تعالیٰ نے بھیا کو جہاں ایک طرف تعلیم و تدریس اور تربیت کی بہترین صلاحیتوں سے نوازا تھا، وہیں ان کو بہترین انتظامی صلاحیت بھی عطا فرمایا تھا۔ تحریر و تقریر کا بھی بہترین ملکہ تھا۔ دعوت و تبلیغ کے لیے جہاں جاتے اچھے انداز میں دعوت اسلامی پیش کرتے۔ ان کا اصل میدان تعلیم و تدریس و تربیت اور دعوت دین تھا۔ لیکن کبھی کبھی مضامین بھی لکھتے۔ بچوں کے لیے اصلاحی نظمیں بھی کہتے، جو مختلف پرچوں میں شائع بھی ہوئیں۔ بہترین خوش نویس بھی تھے، جامعہ کی عمارت کے اوپر جامعۃ الفلاح ان کی خوش نویسی کی بہترین یادگار ہے۔ انھوں نے کوئی زیادہ تحریری سرمایہ نہیں چھوڑا، چند غیر مطبوعہ مسودے ہیں جو ان کے بچوں کے پاس ہیں۔ جیسے مختصر منتخب احادیث کا مجموعہ مع ترجمہ و شرح، نحو و صرف کے ماہر تھے، اس سے متعلق بھی ایک مسودہ ہے۔ سراجی بھی پڑھاتے تھے، اس کے متعلق ایک غیر مطبوعہ مسودہ ہے۔ اسی کے ساتھ ہزاروں کی تعداد میں ایسے طلبہ چھوڑے ہیں جو دین اور علم کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ وہ ان کے حق میں دعا کرتے رہیں گے۔

طبیعت میں بڑی سادگی، تواضع اور قناعت تھی۔ بچوں سے شفقت، بڑوں اور اساتذہ کی عزت اور احترام کرتے تھے۔

☆ ۵؍محرم ۱۳۵۰ھ بختاور گنج مئو کے ایک دیندار اور معزز گھرانے میں پیدا ہوئے۔
☆ ابتدائی تعلیم گھر اور دارالعلوم مئو میں ہوئی۔

☆ اعلیٰ اسلامی تعلیم ہندوستان کی مشہور درسگاہ مدرستہ الاصلاح سرائے میر میں ہوئی۔
☆ جامعۃ مفتاح العلوم مئو سے سند فضیلت حاصل کی۔
☆ الہٰ آباد بورڈ سے عالم، فاضل کی ڈگری حاصل کی۔
☆ ۲۸؍ ذی الحجہ ۱۴۳۱ھ مطابق ۶؍ دسمبر ۲۰۱۰ء کو رب رحیم آقا کے حضور پہنچ گئے۔
☆ بھیا نے اپنے پیچھے دو بیٹے خورشید انور، ڈاکٹر مجاہد الاسلام اور چار بیٹیاں عابدہ، خالدہ، راشدہ اور شاکرہ اور ایک بہن جمیلہ اور ایک بھائی اقبال احمد مدنی چھوڑا۔

بھیا طالب علمی کے زمانہ ہی میں جماعت اسلامی کے رکن ہو گئے تھے اور تادم حیات اس سے منسلک رہے۔

آسماں ان کی لحد پر شبنم افشانی کرے

☆☆☆

ان اعبدوا اللہ واتقوہ واطیعون (سورہ نوح:۳)
[اے میری قوم کے لوگو! اللہ کی عبادت کرو، اس سے ڈرو، میری (رسول کی) اطاعت کرو۔]
اسلامی عقائد و فکرو نظر کا ترجمان
سہ ماہی **دعوت القرآن** لکھنؤ
مرتب: ڈاکٹر سکندر علی اصلاحی
Mob.: 09839538225, 0+919389648331
زرتعاون
فی شمارہ:-/25 روپئے
اندرون ملک:-/100 روپئے
خصوصی تعاون:-/1000 روپئے
Dawat-ul-Qur'an Lucknow
Kallan Ki Lat, Aminabad, Lucknow, U.P. India - 226018

ترانۂ فلاح

(شبیر احمد انور اصلاحی مرحوم)

مطلع انوار رحمت ہے فلاح
مصدر عرفان و حکمت ہے فلاح

ہیں ولی اللہؒ کے اسرار سربستہ یہاں — منزل قاسم و مودودی کا ہم رشتہ یہاں
فکر شبلیؒ و فراہیؒ کا ہے گلدستہ یہاں — آئینہ افکارِ ملت ہے فلاح
مطلع انوار رحمت ہے فلاح
مصدر عرفان و حکمت ہے فلاح

سرزمین ہند کی قسمت جگی — بجھ گئی ہے اس کی ساری تشنگی
اس کی ساری چھٹ گئی ہے تیرگی — نورِ حق شمعِ ہدایت ہے فلاح
مطلع انوار رحمت ہے فلاح
مصدر عرفان و حکمت ہے فلاح

گونج کر اس کے مؤذن کی صدا — ہے فضا میں بن گی بانگ درا
جادہ پیما ہوگیا ہے قافلہ — ہاں اسی میں بہر ملت ہے فلاح
مطلع انوار رحمت ہے فلاح
مصدر عرفان و حکمت ہے فلاح

آگہی ہے اب دلوں کی آرزو — اس کے ہر بچے میں ہے الفت کی خو
علم و حکمت ہی ہے سب کی جستجو — اہلِ دانش کی یہ جنت ہے فلاح
مطلع انوار رحمت ہے فلاح
مصدر عرفان و حکمت ہے فلاح

بچیاں زہرہ بنیں بچے حسین کیونکہ ان کی تربیت ہے فرضِ عین
اب ملے گا ملت خستہ کو چین تربیت گاہِ نبوت ہے فلاح
مطلع انوار رحمت ہے فلاح
مصدر عرفان و حکمت ہے فلاح

بن گئے طلبہ ادھر عالی صفات بہرہ ور ہیں علم و فن سے طالبات
پا گیا ہے ہر کوئی راہِ نجات اہلِ صفہ کی امانت ہے فلاح
مطلع انوار رحمت ہے فلاح
مصدر عرفان و حکمت ہے فلاح

مادرِ علمی ہے تُو ، ہم نونہال ہے تری شانِ جلالی میں جمال
علم و فن میں ہم نے جو پایا کمال سب ترا مرہونِ منت ہے فلاح
مطلع انوار رحمت ہے فلاح
مصدر عرفان و حکمت ہے فلاح

خیرِ امت کی یہی تفسیر ہے اور اقیموا الدین کی تعبیر ہے
قصرِ ملت کی نئی تعمیر ہے مقصد ابرار ملت ہے فلاح
مطلع انوار رحمت ہے فلاح
مصدر عرفان و حکمت ہے فلاح

ہر طرح عصمت بچائیں گے تری شان سے شوکت بڑھائیں گے تیری
ہم نہیں صورت بھلائیں گے تری انور آبِ روئے ملت ہے فلاح

☆☆☆

مولانا صغیر احسن اصلاحی - حیات و خدمات

انیس احمد مدنی☆

مولانا صغیر احسن اصلاحی مرحوم جامعۃ الفلاح کے ان اساسی اساتذہ کرام میں سے تھے جنہوں نے جامعہ کی تعمیر وترقی میں بالکل ابتدائی دور سے حصہ لیا۔ آپ مدرسۃ الاصلاح سے فارغ تھے اور مدرسۃ الاصلاح میں آپ نے اس وقت تعلیم حاصل کی تھی جو اس کا سنہرا زمانہ تھا۔ جب مولانا ابواللیث صاحب مرحوم، مولانا قمر الزماں صاحب، بمہور کے مولانا امین احسن اصلاحی مرحوم، جناب اختر احسن مرحوم اور شبلی متکلم مرحوم بحیثیت استاذ وہاں موجود تھے۔ عالمی جنگ کا زمانہ تھا۔ اشیاء نایاب تھیں، چیزیں گراں تھیں لیکن علم کا جو دریا وہاں بہہ رہا تھا وہ فراواں تھا۔

مدرسۃ الاصلاح میں بحیثیت استاذ

فراغت کے بعد مولانا ۱۹۴۹ء میں وہیں استاذ ہوگئے، جماعت اسلامی سے تعلق کی بنا پر ۱۹۶۰ء میں وہاں سے سبکدوشی کا پروانہ آپ کو عطا کیا گیا۔ چنانچہ سبکدوشی کے بعد آپ نے گاؤں کے مکتب مدرسۃ النجاح کی نجاح کا بیڑا اٹھایا اور جب جامعۃ الفلاح میں ۱۹۶۴ء میں عربی درجات کا آغاز ہوا تو مولانا عبدالحسیب صاحب کی کوششوں سے آپ جامعہ تشریف لائے اور تاحیات یہاں تدریسی خدمات انجام دیتے رہے۔

مولانا کی اہم خوبیاں

۱- سادگی: مولانا کی طبیعت میں بہت ہی زیادہ سادگی تھی، اتنی سادگی کہ کبھی کبھی دونوں چپل بھی الگ الگ ہوتے، استری وغیرہ کا بھی اہتمام نہ کرتے، کسی کو خدمت کا موقع نہ دیتے۔

۲- جفاکشی: جفاکشی بھی بہت زیادہ تھی، بقول ناظم جامعہ جناب مولانا محمد طاہر مدنی صاحب

☆استاذ حدیث وتقابل ادیان، جامعۃ الفلاح، اعظم گڑھ

''مکتب میں جب میں زیر تعلیم تھا تو مجھے اور بڑے بھائی کو سائیکل پر بیٹھا کر رسولپور سے بلریا گنج لے آتے تھے۔''

۳-انفاق فی سبیل اللہ: جذبہ انفاق کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا، فقراء ومساکین کی اعانت کرنا آپ کا معمول تھا۔ چپکے چپکے مدد کرنا آپ کی خصوصیت تھی، وفات سے بیس سال پہلے سے پورا مشاہرہ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے تھے۔

۴-قرض: مولانا ہر قرض مانگنے والے کو قرض ضرور دیتے تھے۔ مولانا افتخار الحسن صاحب کے بقول ان کی وفات کے بعد ممبئی جانے کا اتفاق ہوا، دیرینہ عزیزوں میں سے متعدد نے بڑی عقیدت ومحبت سے ان کو یاد کیا اور کہا ''ہم نے ان سے اتنے اتنے روپئے دستگرداں لیے تھے، لیکن نہ انھوں نے کبھی تقاضہ کیا نہ ہمیں لوٹانے کی توفیق ہوئی۔ اب وہ روپئے کسے لوٹائے جائیں''۔ میں نے ان کو ایک اور واقعہ سنایا کہ

''ایک شخص آئے دن ان کے پاس آتا اور کسی مصیبت کا رونا روکر ان سے روپیے لے جایا کرتا، اسی طرح ایک بار آیا اور اپنے کسی عزیز کی تدفین کے لیے ان سے تین چار سو روپئے لے گیا، تھوڑے دن بعد پھر آیا اور پھر کسی کی تدفین ہی کے لیے روپئے کا سوال کیا، میں نے مولانا سے کہا ''یہ شخص آپ کو دھوکہ دیتا ہے'' انھوں نے فرمایا:
'جس کے نام پر دھوکہ کھاتا ہوں وہ علیم وخبیر ہے، ممکن ہے دھوکہ کھا کر دینے پر ہی وہ خوش ہوجائے۔''

اسی طرح جو شخص بھی ان کے پاس آکر اپنی مصیبت بیان کردیتا وہ اس کی حتی المقدور اعانت وحاجت روائی کرتے، وہ ہمیشہ دکھ درد کے ماروں کے درمیان یا ان کے قریب ہی رہے اور ان کے آنسوؤں اور سسکیوں کو زندگی کی تب وتاب عطا کرتے رہے۔

رباب زندگی کے جتنے ٹوٹے تار ہوتے ہیں
انھیں کو جوڑ کر نغمے میرے تیار ہوتے ہیں

۵-نماز: نماز ان کے دل کی دھڑکن بھی تھی اور ان کی آرزوؤں کا محور جمال بھی۔ دنیا کی ہر چیز سے زیادہ ان کو نماز سے محبت تھی۔ نماز سے ان کی محبت وشیفتگی کا یہ عالم تھا کہ سفر میں بھی آپ بقول ان کے رفیق سفر جناب مولانا احسان الحق صاحب ''وقت ہوتے ہی رک جاتے اور نماز ادا کرتے۔ آپ نے کبھی سفر میں بھی کسی وقت کی نماز قضا نہیں کی۔''

کلیۃ البنات میں جب فقہ وحدیث کی تدریس کی ذمہ داری ان کے سپرد کی گئی تو اگرچہ ظہر کی نماز کے لیے وقفہ کا جو وقت وہاں متعین تھا وہ جامعہ کے اوقات نماز سے مختلف تھا۔ چنانچہ وہاں کے اساتذہ وہیں نماز ادا کرتے تھے لیکن مولانا جامعہ آکر باجماعت ہی نماز ادا کرتے رہے۔ آخر مجبور ہوکر ان کے لیے قانون کو گنجائش نکالنی پڑی۔

یہ سیل غم یہ طوفان حوادث اور یہ پابندی
مگر کب مانتے ہیں زندگی سے ہار دیوانے

نماز سے آپ کو کتنا شغف تھا، اس کا اندازہ آپ اس سے لگائیں کہ آخری ایام میں کوما کی حالت میں آپ ہوتے اور ذرا بھی افاقہ ہوتا تو وضو کروانے کا اشارہ کرتے۔ آپ اس امر کا اہتمام کرتے کہ تکبیر اولیٰ فوت نہ ہونے پائے۔ سفر میں بھی جماعت کا اہتمام کرتے اور اگر لوگ نہیں رکتے تو آپ ناراض بھی ہوجاتے۔ نفلی نمازوں کا بہت اہتمام کرتے، ایام بیض کے روزہ کا لازماً اہتمام کرتے اور دیگر متعلقین کو بھی اس کی تلقین ویاددہانی کراتے۔

نماز سے آپ کا یہ اہتمام اور شغف ہی تھا جس کے اثرات آپ کے چہرے پر ہویدا تھے۔ چنانچہ جو شخص بھی آپ کے چہرے کو پہلی بار دیکھتا، دیر تک دیکھتا رہ جاتا ؎

نکلے ہیں میکدے سے تو چہرہ پہ نور ہے
وہ روشنی تھی کہ اس کا چہرہ دھیان میں تھا
ستارہ سا اک چراغ دل کے مکان میں تھا

۶-آپ کی ایک اہم خوبی یہ تھی کہ کاغذات، اسانید اور اوراق کی کافی حفاظت کرتے۔ چنانچہ جامعہ میں آپ کے تقرری نامہ کا کاغذ، ۱۹۴۹ء کا نتیجہ کارڈ وغیرہ بھی موجود ہیں۔ ایک اہم خوبی یہ تھی کہ اللہ کی نعمتوں کی بڑی قدر کرتے تھے حتی کہ بچے اگر کچھ کھانا پلیٹ میں چھوڑ دیتے تو اسے کھا جاتے، دانہ کی قدر کرتے۔

۷-مذکورہ بالا خوبیوں کے علاوہ آپ مجاہد بھی تھے۔ مولانا محمد عمران صاحب فلاحی روایت کرتے ہیں کہ میرے والد محترم کے بیان کے مطابق: آزادی کے بعد رسولپور میں گائے کی قربانی کے تعلق سے مسلمانوں اور ہندوؤں میں جھگڑے کا اندیشہ ہوا اور رسولپور میں یہ ہوا اڑ گئی کہ قرب وجوار کے مشرکین رسولپور کو لوٹ لیں گے۔ اس موقع پر بلریا گنج اور قرب وجوار کے مسلمان بھی وہاں گئے۔ میں بھی وہاں پہنچ گیا تو دیکھا کہ مولانا دشمنوں کے خلاف لڑنے پر ترغیب دے رہے ہیں۔ آپ کی

تقریر سے حوصلہ پا کر مسلمان دشمنوں کے خلاف سپر ہو گئے۔

جماعت اسلامی سے مولانا کا تعلق

مدرسۃ الاصلاح سے فراغت کے بعد ہی مولانا جماعت اسلامی سے جڑ گئے۔ دعوت وتبلیغ سے آپ کو طالب علمی کے ایام سے ہی دلچسپی تھی، مولانا عبدالحسیب صاحب اصلاحی فرماتے ہیں کہ ''جب ہم اعلیٰ جماعتوں میں پہنچے تو تبلیغ وارشاد کے لیے مضافات کے گاؤں میں پنج شنبہ کی شام کو روانہ ہوتے اور جمعہ کو واپس آتے۔''

آپ ایک فعال کارکن تھے، سائیکل کے ذریعہ قرب و جوار کے مواضعات کا دورہ کرتے۔ لٹریچر، اخبارات اور پمفلٹ تقسیم کرتے، آپ نے جماعت کے تعارف کی خاطر مختلف تحریکی اخبارات و پرچوں کی ایجنسی لے رکھی تھی۔ کمزور اور غیر مستطیع افراد کو مفت پرچہ دیا کرتے تھے۔

جماعت کے فعال کارکن ہونے کے باوجود بھی آپ ہر جماعت سے تعلق رکھتے۔ تبلیغی جماعت، جمعیۃ اہل حدیث اور دارالمصنفین وغیرہ سے آپ کا گہرا تعلق تھا۔ رشتوں کو باقی رکھتے۔ دور دور کی رشتہ داریوں میں بھی پہنچتے اور ان کے دکھ درد میں شریک ہوتے۔

مولانا اور طلبہ

طلبہ اور زیردستوں پر آپ حد درجہ شفیق تھے۔ جہاں کہیں بھی محسوس کرتے کہ طلبہ کو زیادہ ڈانٹا جا رہا ہے وہاں مولانا کی شفقت آڑے آتی۔ ہر ہر طالب علم سے تعلق رکھتے۔ ان کی علمی رہنمائی فرماتے، غلطیوں پر حکیمانہ انداز میں ٹوکتے۔ آپ کی تربیت، وعظ وارشاد اور رہنمائی کا انداز ایسا تھا کہ ہر طالب علم یہ سمجھتا کہ مولانا سب سے زیادہ مجھے چاہتے ہیں۔

طریقہ تدریس

مولانا نے ۱۹۴۹ء سے ۲۰۰۰ء تک کی پوری زندگی تدریس میں لگا دی۔ آپ کے درس کی خوبی یہ تھی کہ خشک مضامین (جیسے منطق وفلسفہ) کو بھی اتنے دلچسپ انداز سے پڑھاتے تھے کہ طلبہ کو اکتاہٹ محسوس نہ ہوتی۔ ہمیشہ ہنسنے ہنسانے کی کوشش کرتے اور کبھی غصہ بھی آتا تو فوراً زائل ہو جاتا۔ فقہ ومنطق کی مشکل ترین عبارتوں کی جانب طلبہ کی ذہنی یکسوئی کی خاطر کہتے جو یہ عبارت حل کر دے ایک چونی پائے گا اور کبھی کہتے یہ عبارت ایک 'اٹھنی' کی ہے اور اس طرح پوری جماعت دلجمعی کے ساتھ اس عبارت کو حل کرنے میں لگ جاتی۔

فقہ وحدیث کے علاوہ درس نظامی میں شامل جملہ مضامین سے آپ کو دلچسپی رہی ہے۔

سابق صدر مدرس مولانا عبدالحسیب صاحب کے بقول: مولانا کا ایک اہم امتیاز یہ بھی رہا ہے کہ ان کو شروع ہی سے ہمہ جہتی علوم سے دلچسپی رہی ہے۔ چنانچہ آپ کی یہ خوبی بعد میں کام آئی اور ان کا یہ ہمہ جہتی علم ہمارے لیے بڑی سہولت کا سبب بنا۔

وفات

۱۴/نومبر ۲۰۰۰ء کو مولانا کا انتقال ہوا۔ جامعہ سے متصل قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔ نماز جنازہ مولانا محمد طاہر مدنی صاحب نے پڑھائی۔ اساتذہ، کارکنان جامعہ، طلبہ اور قرب و جوار کے بے شمار افراد نے آپ کے جنازے میں شرکت فرمائی۔ مولانا نے اگرچہ علمی آثار نہیں چھوڑے ہیں لیکن آپ کے شاگردوں کی ایک بڑی تعداد ملک و بیرون ملک میں تدریس اور وعظ وارشاد میں لگی ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ موصوف کو غریق رحمت کرے، انھیں اعلیٰ علیین میں جگہ نصیب عطا فرمائے اور ان کے شاگردوں کو ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

☆☆☆

اعظم گڑھ

مولانا سعید احمد اکبرآبادی رقم طراز ہیں:

''اعظم گڑھ ایک بڑا مردم خیز خطہ ہے، اس جیسے علاقوں کے سوتے خشک ہو گئے یا ہوتے جا رہے ہیں۔ لیکن اس کی زرخیزی نہ صرف قائم ہے بلکہ روزافزوں ہے۔ (برہان، جون ۱۹۷۶ء)

اور بقول اقبال سہیل:

اس خطہ اعظم گڑھ پر مگر فیضان تجلی ہے یکسر
جو ذرہ یہاں سے اٹھتا ہے وہ نیر اعظم ہوتا ہے

مولانا صغیر احسن اصلاحیؒ

انعام اللہ فلاحی، دہلی☆

مولانا صغیر احسن اصلاحی رحمۃ اللہ علیہ کا تعلق ضلع اعظم گڑھ کے ایک گاؤں زمین رسول پور سے تھا۔ ایک زمانے میں مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اعظم گڑھ کے کچھ اساتذہ محض اس وجہ سے نکالے گئے تھے کہ ان کا تعلق جماعت اسلامی ہند سے تھا۔ یہ حضرات کچھ دنوں تک شہر اعظم گڑھ کے مدرسہ جامعۃ الرشاد میں بھی رہے لیکن فکری و مزاجی ہم آہنگی نہ ہونے کی وجہ سے وہاں بھی زیادہ دنوں تک نہ رہ سکے۔ پھر انھوں نے حکیم محمد ایوب مرحوم اور جماعت کے سربرآوردہ لوگوں کی دعوت پر بلریا گنج اعظم گڑھ کو اپنا مرکز بنایا۔ اس ٹیم میں محترم مولانا عبدالحسیب اصلاحی، مولانا نظام الدین اصلاحی اور مولانا صغیر احسن اصلاحی مرحوم وغیرہ تھے۔ محترم مولانا شبیر احمد اصلاحی مرحوم بھی آچکے تھے۔ گویا لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا۔ اس طرح ایک مضبوط ٹیم جمع ہوگئی اور جامعۃ الفلاح تعلیم و تربیت کا ایک معیاری مرکز بن گیا۔ مولانا سید ابوالحسن حسنی ندویؒ نے اساتذہ کی اس ٹیم کو دیکھ کر جامعۃ الفلاح کی مسجد میں تقریر کے دوران فرمایا تھا: ''کسی بھی ادارے کی ترقی کا انحصار وہاں کے اساتذہ اور کارکنان کے اتحاد و اتفاق پر ہوتا ہے۔ آپ حضرات کے اندر جو ہم آہنگی اور یکسوئی ہے، وہ اس ادارے کی ترقی کا ضامن ہے۔ اللہ اس کو نظر بد سے بچائے۔'' یہ اس وقت کی بات ہے جب محترم ابواللیث اصلاحی ندویؒ ناظم جامعہ تھے اور مولانا تقی الدین ہلالی مراقشی کی تشریف آوری کے موقع پر جامعہ کی مسجد میں ایک اعزازی پروگرام رکھا گیا تھا۔

اوصاف حمیدہ

مولانا صغیر احسن اصلاحیؒ کے مزاج میں سادگی کا عنصر غالب تھا۔ تصنع اور تکلف کا وہاں کوئی گزر نہیں تھا۔ لباس، رہن سہن، بات چیت غرض کہ زندگی کے تمام معاملات میں سادگی ہی سادگی تھی۔ خوش طبع اور خوش مزاج بھی تھے۔ ہمیشہ مسکراتے رہتے تھے۔ اپنی بات سیدھے اور صاف

☆ مرکز جماعت اسلامی ہند

انداز میں رکھتے تھے۔ رجائیت پسند تھے، حالات کتنے ہی سنگین ہوں، گھبراہٹ اور مایوسی ان کے قریب نہیں آتی تھی۔ مزاج کے اخلاص اور نمود و نمائش سے دوری کی وجہ سے انتظامی امور سے ہمیشہ دور رہے۔ جامعہ کی مسجد میں دو نمازوں کی امامت فرماتے تھے۔ نمازیں ہلکی پڑھاتے تھے۔ امامت میں بھی ہمدردی اور خلق خدا پر شفقت کا رنگ غالب تھا۔

آج کل مدارس کے اساتذہ عموماً یہ شکایت کرتے ہیں کہ طلبہ گستاخ ہوگئے ہیں۔ اب ان کے دلوں میں اساتذہ کا ادب و احترام باقی نہیں رہا، لیکن اگر اساتذہ کرام طلبہ کے ہمدرد اور خیر خواہ ہوں اور طلبہ کو اس بات کا احساس ہو جائے کہ اساتذہ ہمارے بہی خواہ اور ہمدرد ہیں تو یہ شکایت بڑی حد تک دور ہوسکتی ہے۔ مولانا کی ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ انھیں طلبہ کے ساتھ بے حد ہمدردی تھی۔ ایک بار کا واقعہ ہے۔ ایک سرپرست اپنے بچے کو لے کر جامعۃ الفلاح میں داخلہ کے لیے آئے۔ وہ مالی اعتبار سے پریشاں حال تھے، بچے کی کفالت نہیں کرسکتے تھے۔ وہ مولانا کو جانتے تھے۔ انھوں نے مولانا سے گذارش کی کہ وہ جامعہ سے ان کے بچے کا وظیفہ منظور کرادیں۔ مولانا نے بتایا کہ یہ سب معاملات ذمہ داران دیکھتے ہیں۔ آپ انھیں سے بات کرلیجیے۔ وہ صاحب دوسرے دن پھر مولانا سے ملے اور بتایا کہ ذمہ داران سے بات کی لیکن ان کی درخواست منظور نہیں ہوئی۔ مولانا تھوڑی دیر تک خاموش رہے پھر کہنے لگے، بچے کا داخلہ ہوگیا ہے۔ اب آپ اس کو چھوڑ کر چلے جایئے۔ اگر ذمہ داران نے وظیفہ منظور کرلیا تو بہتر ہے، ورنہ اس کے مصارف کا نظم میں خود اپنی جیب سے کردیا کروں گا۔

مولانا درمیان سال میں طلبہ کے اخراج کے سخت مخالف تھے۔ فرماتے تھے کہ اس طرح بچے کے لیے تعلیم اور اصلاح کا دائرہ تنگ ہوجاتا ہے اور اس کے ضائع ہونے کا اندیشہ پیدا ہوجاتا ہے۔ اگر سال کے آخر میں داخلہ منسوخ کردیا جائے تو کسی دوسرے ادارے میں داخلہ لے کر طالب علم تعلیم مکمل کرسکتا ہے۔ ایک مرتبہ درمیان سال میں جامعہ کے دو طلبہ کا اخراج ہوگیا۔ مولانا کو معلوم ہوا تو ان دونوں کو اپنے گھر لے گئے، پھر ان کے سلسلے میں ذمہ داران سے بات کی بالآخر ایک ہفتے کے بعد دوبارہ دونوں کو جامعہ میں داخلہ مل گیا۔ ان دونوں نے تعلیم مکمل کی، ان میں سے ایک صاحب آج کل ایک کالج میں لکچرر ہیں۔

دعوت و تبلیغ کا منفرد اسلوب

مولانا کا اسلوب دعوت و تربیت بھی منفرد تھا۔ وہ کسی کر و فر اور نمود و نمائش کے بغیر نہایت

خاموشی سے دعوت وتبلیغ اور کردار سازی کی خدمت انجام دیتے رہتے تھے۔عوام وخواص سب سے ان کے تعلقات تھے۔اپنی بات ظریفانہ انداز میں کہتے اور آگے بڑھ جاتے تھے۔کبھی سوال کرتے اور جواب سنے بغیر نکل جاتے۔کبھی کوئی خبر دیتے جس میں تجسس باقی رہتا اور گفتگو کا رخ دوسری طرف موڑ دیتے تھے،نہ کسی کی غیبت نہ کسی سے کدورت،نہ عہدہ ومنصب کی خواہش،نہ داد ودہش کی تمنا،ایک بے لوث خادم اور مستعد سپاہی کی طرح اپنا فرض ادا کرتے رہتے تھے۔

اپنی طالب علمی کے زمانے میں ایک دن عصر کی نماز کے بعد میں بازار کی طرف جارہا تھا۔ مولانا سائیکل پر سوار ہوکر پیچھے سے آئے، غالباً گھر تشریف لے جارہے تھے،مولانا سلام کرکے سائیکل چلاتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔پھر تھوڑی دور جانے کے بعد رک گئے۔جب میں قریب پہنچا تو کہنے لگے: کل تم کو ایک ''میلاد'' میں چلنا ہے۔میں نے عرض کیا مولانا آپ کو تو معلوم ہے میں ''اہل حدیث'' ہوں۔میلاد کو بدعت سمجھتا ہوں۔مولانا نے فرمایا: اسی وجہ سے تو تم کو لے جانا چاہتا ہوں۔دوسرا دن جمعرات کا تھا۔مقررہ وقت پر ہم دو طلبہ وہاں پہنچ گئے،ہم دونوں نے مختصر تقریریں سیرت کے موضوع پر کیں۔اس کے بعد مولانا کی تقریر ہوئی،جس میں انھوں نے اللہ کے رسول ﷺ کی زندگی کو اسوہ بنانے پر زور دیا اور ''میلاد'' کی مروجہ غلط رسوم پر تنقید بھی کی۔آخر میں شیرینی تقسیم ہوئی دعا پر جلسہ ختم ہوگیا۔دوسرے دن مولانا کلاس میں تشریف لائے تو فرمایا: یہ بتاؤ کیا تمہارا فتویٰ دے کر خود گھر میں بیٹھے رہنا بہتر ہے یا عوام میں جاکر ان سے رابطہ کرکے ان کی اصلاح کی کوشش ہونی چاہیے؟اگر عوام کو چھوڑ دیا جائے تو یہ لوگ بدعت سے کبھی نہیں نکل سکیں گے۔

مولانا مجیب اللہ ندویؒ کو اپنا مرشد کہتے تھے۔ان کے پاس برابر جایا کرتے تھے۔ایک مرتبہ بتانے لگے کہ میں نے ان سے بیعت کررکھی ہے۔میں نے کہا مولانا آپ تو جماعت اسلامی ہند کے رکن ہیں۔یہ پیری مریدی کیا ہے؟ کہنے لگے میں نے اپنی اصلاح کے لیے ایسا کیا ہے۔

مولانا حنفیت میں بہت شدید تھے۔ایک مرتبہ فقہ کی کتاب ''ہدایہ'' پڑھارہے تھے۔ ایک مسئلے پر کسی طالب علم نے صاحب ہدایہ کے بیان کے خلاف امام بخاریؒ وامام مسلمؒ کی کئی روایتیں نقل کردیں۔مولانا ناراض ہوکر کلاس سے نکل گئے۔مولانا کی سائیکل میں ایک تھیلا لٹکا ہوتا تھا۔ جس میں ضرورت کے سامان کے علاوہ کچھ کتابیں ہوتی تھیں۔وہ ان کتابوں کو لوگوں کو مطالعہ کے لیے دیتے تھے۔ایک دن گفتگو کے دوران میں حکیم محمد ایوبؒ کا ذکر آیا۔فرمانے لگے: ''گرو،گرو رہتا ہے چیلا شکر کہو جاتا ہے،پھر فرمایا حکیم ایوب صاحب کو جماعت سے قریب میں نے کیا تھا۔شروع

میں انھیں جماعت کا لٹریچر میں نے ہی پڑھوایا تھا۔دھیرے دھیرے وہ جماعت کے رکن بنے پھر نمائندگان اور شوریٰ میں بھی پہنچ گئے اور میں جہاں تھا وہیں رہا۔

من کے سچے دھن کے پکے

مولانا من کے سچے اور دھن کے پکے تھے۔اس کا بخوبی اندازہ اس واقعے سے کیا جاسکتا ہے،ایک مرتبہ وہ سائیکل سے کہیں جارہے تھے۔بلریا گنج بازار کی جامع مسجد کے پاس پہنچے،دیکھا کہ مسجد کے باہر بھیڑ اکٹھا تھی،لوگ چھوٹے چھوٹے گروپ کی شکل میں ادھر ادھر باتیں کررہے تھے ان کے چہرے اداس تھے۔مولانا نے سائیکل سے اتر کر قصہ معلوم کیا۔پتہ چلا کہ ماسٹر عبدالجلیل صاحب کی بیٹی کا نکاح ہونا تھا۔دولہا بارات چھوڑ کر فرار ہوگیا ہے۔جبکہ لوگ مسجد میں نکاح کے انتظار میں ہیں۔ادھر بارات والے پریشان ہیں۔ادھر ماسٹر عبدالجلیل صاحب اور ان کے گھر اور خاندان کے لوگ غمزدہ ہیں۔مولانا کے دماغ میں یہ خیال آیا کہ کیوں نہ اپنے لڑکے محمد طاہر کا نکاح اس لڑکی سے پڑھا کر اس مسئلے کو حل کردیا جائے۔انھوں نے اپنے صاحب زادے سے مشورہ کیا۔ سعادت مند بیٹے نے جواب دیا۔ابوآپ جو بہتر سمجھیں کریں،میں آپ کے فیصلے پر راضی ہوں۔ چنانچہ اسی وقت محمد طاہر کا نکاح ہوگیا،شام کو جب دولہن لے کر گھر پہنچے تو گھر اور خاندان اور گاؤں کے لوگ حیران رہ گئے۔یہ وہی محمد طاہر ہیں جو اب مسلمانوں کے ایک بڑے طبقے میں مولانا محمد طاہر مدنی کے نام سے مشہور ہیں اور ہندوستان کی مشہور درسگاہ جامعۃ الفلاح کے ناظم ہیں۔

باپ اور بیٹے کا ایک بہت ہی عظیم اسوہ ہے۔اتنا بڑا فیصلہ ہر شخص نہیں کرسکتا ہے،یہ قدم وہی شخص اٹھا سکتا ہے جس کے اندر دوسروں کی مدد اور ہمدردی کا بے پناہ جذبہ ہو۔

☆☆☆

دل میں یہ سن کر بپا ہنگامۂ محشر ہوا
میں شہید جستجو تھا یوں سخن گستر ہوا

مولانا صغیراحسن اصلاحی

غطریف شہباز ندوی ☆

جامعۃ الفلاح کے بزرگ استاد ومربی اورتحریک اسلامی کے ایک مخلص کارکن، عالم باعمل مولانا صغیراحسن اصلاحی اللہ کو پیارے ہوگئے، گزشتہ دنوں ان پر فالج کا حملہ ہوا تھا، جس سے جسم کا ایک بڑا حصہ متاثر ہوا، فوری طور پر اعظم گڑھ اسپتال میں داخل کیے گئے تھے، کچھ افاقہ محسوس ہونے پر گھر (بلریا گنج) منتقل کردیے گئے، لیکن حملہ شدید تھا جو بالآخر جان لیوا ثابت ہوا اور لگ بھگ ۶۰ سال کی عمر میں مولانا مالک حقیقی سے جاملے۔

مولانا کا اصلی وطن بلریا گنج سے متصل موضع رسول پور تھا، انہوں نے تعلیم کی تکمیل مدرسۃ الاصلاح پر کی، جہاں انہیں مولانا فراہی کے تلمیذ رشید مولانا اختر احسن اصلاحی سے بھی کسب فیض کا موقع ملا۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد پہلے مدرسۃ الاصلاح پر ہی تدریسی خدمات انجام دیں، وہیں تحریک اسلامی سے وابستگی اختیار کرلی جو بالآخر مدرسہ سے علاحدگی کا سبب بھی بنی، اسی زمانہ میں جامعۃ الفلاح نے جواب تک مکتب کی شکل میں تھا ترقی کرکے ایک عربی ادارے کی شکل اختیار کی تو مولانا نے بھی اسی کو اپنی خدمات پیش کردیں اور ''یک در گیر ومحکم گیر'' کا اصول اپناتے ہوئے زندگی کے آخری ایام تک اسی درسگاہ کی خدمت کی۔ راقم نے دوسال جامعۃ الفلاح میں گزارے ہیں اور ترمذی کا درس مولانا سے لیا ہے اوران کی شفقتوں اورعنایتوں سے بہرہ مند ہونے کی سعادت ملی اور حقیقت یہ ہے کہ ایسے اہل اللہ کی عنایت وشفقت سے بہرہ مند ہونا اللہ تعالیٰ کے خاص انعامات میں سے ہے۔

تحریک اسلامی سے مولانا فراغت کے بعد ہی وابستہ ہوگئے تھے اور تاحیات اسی سے وابستہ رہے اوراس سلسلے میں جو بھی تعاون مطلوب ہوتا پیش کرتے، مقامی سطح پر تحریک کی ساری سرگرمیوں میں حصہ لیتے، وعظ ونصیحت اور اصلاح ودعوت کا ان کا مزاج بن گیا تھا اور وہ یہ کام اٹھتے

☆ دہلی

بیٹھتے چلتے پھرتے کرتے رہتے تھے، ان کی ذات خود دعوت واصلاح کی مترادف تھی، صوبائی ومرکزی سطح پر بھی جماعت کے پروگراموں میں اکثر وبیشتر شرکت کرتے تھے، وہ قیادت کی سطح کے آدمی نہ تھے کہ انہیں شہرت ومقبولیت ملتی اور ایسی چیزوں کے وہ کبھی خواستگار بھی نہ تھے، لیکن انہوں نے اپنی تدریسی ذمہ داریوں کے ساتھ ایک عام کارکن کا کردار بخوبی اور قابل رشک انداز میں نبھایا، دوسری اہم بات ان کے اندر یہ تھی کہ تحریک سے وابستگی کے باوجود کسی قسم کے تعصب اور بے جا حمایت اور طرفداری کی آفت سے بالکل محفوظ تھے، اسی لیے دوسرے حلقے کے لوگوں اور علماء ومشائخ سے بھی ان کے روابط نہایت خوشگوار تھے، وہ تعاون علی البر والتقوی کی عملی تفسیر اور نمونہ تھے اور ہر دینی وملی کام میں حصہ لینا اور خاموش امداد اور تعاون پیش کرنا ان کی فطرت ثانیہ بن گئی تھی۔

مولانا کی زندگی کا ایک بہت ابھرا ہوا پہلو طلبہ کے ساتھ ان کا رویہ تھا، وہ نہ صرف اپنے شاگردوں سے تعلق خاطر رکھتے تھے بلکہ جامعہ کے سارے ہی طلبہ انہیں عزیز تھے، اس کے علاوہ دوسری جگہوں پر پڑھنے والے طلبہ سے بھی بڑا انس رکھتے اور ضرورت پڑنے پر ان کی دل کھول کر امداد کرتے، مولانا کی تعلیم کا انداز بھی نرالا تھا، اس میں فنی نکتے اور علمی باریکیاں تو نہ ہوتیں لیکن ان کی شگفتہ مزاجی جس میں لطیف مزاج کا غصہ بھی ہوتا تھا پوری کلاس کو زعفران زار بنادیتے تھے، طلبہ ان کے درس سے بور نہ ہوتے تھے، وہ طلبہ کو اپنی اولاد کی طرح چاہتے تھے اور ان کی تربیت اور اصلاح بڑے حکیمانہ طرز سے مسلسل کرتے رہتے تھے، کوئی طالب علم بیمار ہوتا تو مزاج پرسی کرتے، اس کی خبرگیری کرتے اور مستحق طلبہ کی مالی امداد واعانت بڑی خاموشی سے کرتے رہتے تھے، کتنے ہی طالب علم ہوں گے جن کا انہوں نے اسی طور پر تعاون کیا، انہیں سہارا دیا، ان کی حوصلہ افزائی کی، طلبہ کے ساتھ ان کا مشفقانہ رویہ اور مہربانی کا سلوک ہی تھا جس کی وجہ سے طلبہ ان کے ساتھ بڑے بے تکلف رہتے تھے اوران سے کوئی ڈر یا خوف محسوس نہ کرتے تھے، لڑکوں کی اصلاح وتربیت کا ہمیشہ خیال رہتا تھا، علی الصباح فجر کی نماز کے لیے طلبہ کو کئی کئی بار بیدار کرتے، وقفہ وقفہ سے تذکیری گفتگو خود کرتے یا کسی استاد سے کرواتے، ان کی آواز میں بڑا درد تھا اور گفتگو مختصر، درد وسوز میں ڈوبی ہوئی اور موثر ہوتی تھی۔ جامعۃ الفلاح سے انہیں والہانہ لگاؤ تھا، اس درسگاہ سے ان کی وابستگی روز اول ہی سے رہی، اس کے لیے انہوں نے سفر اسفار بھی کیے، اس سے ان کا لگاؤ اپنے گھر جیسا تھا اوراس کے لیے اخلاص اور قربانی کا بے پناہ جذبہ ان کے اندر پایا جاتا تھا، اس کی نشو ونما اور ترقی کے لیے ہمیشہ کوشاں اور دعا گو رہے، اونچے درجوں کی بعض کتابیں تو انہوں نے پڑھائیں لیکن عہدوں اور

مناصب سے وہ ہمیشہ الگ ہی رہے اور اس کا نہ ان کا مزاج تھا اور نہ ہی وہ اس میدان کے آدمی تھے، تاہم طلبہ کے ہاسٹل کی نگرانی کافی عرصہ تک ان کے سپرد رہی اور اسے انہوں نے انہماک اور پورے احساس ذمہ داری کے ساتھ انجام دیا، طلبہ پر ان کی سلامت طبع اور شرافت نفس اور بردباری اور عفوودرگزر کی بلند عادتوں کا بڑا اچھا اثر پڑتا تھا، راقم کا یہ بھی مشاہدہ ہے کہ کبھی کوئی طالب علم ان سے کسی وجہ سے کبیدہ خاطر ہوا تو انہوں نے خود آگے بڑھ کر معافی مانگ لی۔

ملتے کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ   افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

مولانا مرحوم عمر بھر تعلیم وتربیت اور تدریس کے میدان سے وابستہ رہے، لیکن اس کے ساتھ ہی رشتہ داروں، عزیزوں اور احباب اور حلقۂ تعارف نیز عام لوگوں سے بھی تعلقات رکھتے، جب علیل وکمزور نہ تھے تو سائیکل لے کر نکلتے اور راستہ میں جتنے عزیز اور دوست احباب پڑتے سب کی خیر خبر ضرور لیتے جاتے، سب کی خیریت لینا، حال چال معلوم کرنا، مسائل معلوم کرنا اور انہیں حل کرانے کی کوشش کرنا، ان کی عادت ثانیہ بن گئی تھی، سبھی مولانا کی سادگی، شرافت نفس، نیکی اور خدا ترسی کے قائل تھے۔ مولانا تھے بھی بالکل المومن غر کریم (مومن سادہ لوح اور کریم النفس ہوتا ہے) کے صحیح مصداق، علماء کے طبقہ میں بالعموم سماج سے الگ تھلگ رہنے کا مزاج پایا جاتا ہے، لیکن مولانا اس سے بالکل مستثنیٰ تھے اور اس معاملہ میں ان کی ذات دوسرے کے لیے ایک نمونہ اور قابل تقلید مثال ہے، قرآن کریم نے نبی کریم ﷺ کی توصیف میں بالمومنین رؤوف رحیم کہا ہے (یعنی آپ مومنین پر انتہائی درجہ شفیق ومہربان تھے) ذات نبوی سے عشق اور اتباع سنت کے جذبہ سے سرشار اللہ کے مقبول بندوں کو بھی اس صفت کا بھی کچھ نہ کچھ حصہ ضرور ملتا ہے، مولانا صغیر احسن صاحب کو قدرت نے اس وصف سے نوازنے میں کسی بخل سے کام نہیں لیا تھا، یہی وجہ ہے کہ وہ حقوق العباد کا بڑا خیال رکھتے تھے، اس پہلو کو بڑی اہمیت دیتے اور اس معاملہ میں بڑے حساس تھے۔

مولانا کا مطالعہ اچھا تھا اور مختلف موضوعات پر برابر پڑھتے رہتے تھے، قرآن وحدیث سے خاص شغف تھا، اہل علم سے ملاقاتوں اور استفادہ کے حریص تھے اور آخر تک رہے، علم وتحقیق کی قدردانی فرماتے اور اس سلسلے میں جو بھی تعاون ممکن ہوتا ضرور کرتے، والد ماجد جناب مولانا شبیر احمد ازہر میرٹھی مدظلہم جو کتاب اللہ اور حدیث دونوں پر بڑی مجتہدانہ نظر رکھتے ہیں، سے خاص عقیدت تھی۔ والد ماجد دامت برکاتہم سے مولانا مرحوم نے مدرسۃ الاصلاح پر ترمذی کا درس بھی لیا، اس وقت دونوں بزرگ وہاں استاد تھے اور مولانا مرحوم کی تحریک پر چند اساتذہ نے ترمذی ان سے پڑھنی

شروع کی تھی، وہیں سے دونوں بزرگوں میں دوستی، رفاقت اور عقیدت کا تعلق قائم ہوا، جو بحمداللہ آخر وقت تک قائم رہا، مولانا مرحوم والد ماجد کے علوم وتحقیقات کے خاص قدردانوں میں تھے اور ذاتی استفادہ کے ساتھ ہی ان کی نشر واشاعت کی مسلسل فکر میں رہتے تھے، فجزاہ اللہ خیرالجزاء، عبادت کا انہیں بڑا ذوق تھا، نماز سے حقیقی عشق تھا، راقم آثم کو کئی بار ان کے ہاں رہنے اور کئی شب و روز ان کے ساتھ گزارنے کا موقع ملا اور ان کے معمولات کا اس نے بہت قریب سے مشاہدہ کیا، وہ شہادت دے سکتا ہے کہ اس دوران ان کی کوئی تہجد نہیں چھوٹی، فرائض کے ساتھ سنن ونوافل کا خاص اہتمام کرتے تھے، تحریکی حلقہ سے متعلق عام طور پر سنن ونوافل کے سلسلے میں لاپروائی اور کسل مندی کی شکایت کی جاتی ہے، جس میں مبالغہ بھی ہے لیکن اگر وہ صحیح بھی ہو تو مولانا مرحوم کی ذات اس سے بالکل مستثنیٰ تھی، راقم گواہی دے سکتا ہے کہ ابھی تک اس نے چند ہی ایسے علماء دیکھے ہیں جو انتہائی حد تک عبادات میں انہماک رکھتے ہیں، انہی میں ایک مولانا کی ذات بابرکات بھی تھی، نماز کے سلسلے میں ان کا شغف بتاتا تھا کہ انہیں قرۃ عینی فی الصلاۃ (میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز ہے) اور اَرحنی یا بلال بالصلاۃ (اے بلال! نماز کے ذریعہ ہمیں راحت پہنچاؤ) والی کیفیت کا خاص حصہ ملا تھا، ظاہر ہے کہ نماز کا معاملہ ہے بھی ایسا ہی کہ اس کا مقام دینی نظام میں بالکل وہی ہے جو جسمانی نظام میں قلب وروح کا ہوتا ہے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ قرآن وسنت سے حقیقی شغف رکھنے والوں کو نماز سے گہری شیفتگی اور تعلق ہوتا ہے اور یہ گہرا تعلق اللہ کے مقبول بندوں اور صالحین کی مخصوص نشانی ہے، مرحوم کی نمازیں اور نیکی وتقویٰ سے بھری ان کی پوری زندگی شہادت دیتی ہے کہ وہ زمرۂ صالحین میں تھے۔

مولانا کسی حلقۂ ادارت سے وابستہ سکہ بند صوفی نہ تھے لیکن راقم سطور کی نگاہ میں ذات نبوی سے عشق، تقویٰ وپرہیزگاری، انابت اور رجوع الی اللہ کی جو کیفیت مولانا کو حاصل تھی وہ موجودہ دور کے مروجہ حلقہائے طریقت ومشیخت حضرات کو شاید ہی نصیب ہوتی ہو، تصوف وطریقت کسی مروجہ اور روایتی جامد طریقہ کا نام نہیں، بلکہ دراصل وہ جذب وشوق اور محبت سے عبارت ہے، جذبۂ شکر اور والہانہ عقیدت سے اس کا جوہر تیار ہوتا ہے اور اس محبت کے بغیر ایمان بھی معتبر نہیں، محبت کا اعلیٰ درجہ وہ ہے جو بندہ کو اپنے خالق ومالک اور پالنہار سے ہوتی ہے، اسی کو سلوک وطریقت کی زبان میں عشق حقیقی سے تعبیر کیا جاتا ہے، عشق حقیقی کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ خدا سے محبت کرنے والا اس کی مخلوق سے بھی محبت کرے اور اپنی ذات سے خلق خدا کو آرام پہنچائے، یہ وہ جذبہ ہے جو کسی کے اندر

پیدا ہوجائے تو اسے مسلسل بے چین رکھتا اور حرکت وعمل پر ابھارتا رہتا ہے، مولانا کی زندگی کا سب سے ابھرا ہوا پہلو یہی تھا، وہ لوگوں سے خندہ پیشانی سے ملتے تھے، ان کے مسائل معلوم کرتے اور ان کو حل کرانے کی کوشش کرتے، سب کو دعائیں دیتے، سب کے ساتھ تواضع سے پیش آتے، لوگوں سے محبت اور خدمت خلق ان کا شیوہ تھا۔ حرارت قلب، محبت انسان، تواضع وخاکساری اور لوگوں سے ہمدردی وغمگساری جیسی بلند صفات ان کا مایۂ خمیر تھیں، وہ جہاں جاتے نیکی کے بیج بوتے جاتے تھے، احترام آدمیت ان کی زندگی کا روشن عنوان تھا، مہمانوں کا خاص خیال رکھتے اور حدیث نبوی من کان یومن بالله فلیکرم ضیفه (مومن کو اپنے مہمان کا اکرام کرنا چاہیے) پر پورا عمل کرتے اور ان کے اکرام اور خدمت میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھتے، انہوں نے کشادہ حالی کے ساتھ زندگی گزاری لیکن مال کی محبت، بخل اور تنگ دلی اور کسی منصب کی خواہش جیسی آفات سے محفوظ رہے، کسی شخص کے ظاہری حالات اور کاموں کو دیکھ کر اگر اس کے باطن کے بارے میں رائے قائم کرنا درست ہو تو بلا مبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ حب مال، حب جاہ اور تنگ دلی سے ان کے قلب کو صاف کردیا گیا تھا اور وہ ان شاء اللہ فمن یوق شح نفسه فاولٰئك هم المفلحون (التغابن) جو لوگ انفس کی تنگی سے بچائے گئے وہی کامیاب ہیں] کے خاص مصداقوں میں سے ہوں گے۔ آہ! ان کے چہرہ سے کتنی پاکیزگی جھلکتی اور پیشانی سے کتنا نور ٹپکتا تھا، ان کے ساتھ باتیں کرکے طبیعت خوش ہوجاتی، ان کے ساتھ بیٹھ کر خدا یاد آتا اور ان کی صحبت سے نفس کا تزکیہ ہوتا تھا، راقم کا قلب شہادت دیتا ہے کہ وہ ان لوگوں میں سے تھے جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اولٰئك قوم لا یشقی بهم جلیسهم [یہ ایسے لوگ ہیں جن کا ہم نشیں محروم نہیں رہتا] عام طور پر علمائے کبار، ادباء اور مصنفین مشہور اور روایتی صلحاء اور زہاد، قائدین اور امراء وغیرہ کو یاد رکھا جاتا ہے، ان پر کتابیں اور مضامین لکھے جاتے ہیں، سادہ لوگوں اور گمنام طبیعتوں کو زمانہ بھلا دیتا ہے، حالانکہ یہی غیر معروف مگر مخلص، گم نام مگر قربانی دینے والے کائنات میں بیت الغزل کی حیثیت رکھتے ہیں، بنیاد کا کام ہمیشہ وہ اینٹ دیتی ہے جو نیو میں اپنے کو دفن کرلینا گوارا کرلیتی ہے، مولانا کی وفات پر تحریک اور جامعۃ الفلاح کا ایک بے لوث خادم، علم وتحقیق کا قدرداں اور چھوٹوں کی حوصلہ افزائی کرنے والی شخصیت ہم سے جدا ہوگئی۔ اللہ غریق رحمت کرے۔ آہ! موت نے کیسے صاحب دل، زاہد حقیقی، متبع سنت اور خادم انسانیت کو ہم سے چھین لیا۔

مقدور ہو تو خاک سے پوچھو کہ اے لئیم　　تو نے وہ گنجہائے گراں مایہ کیا کیے

مولانا شہباز احمد اصلاحیؒ - حیات وخدمات کے آئینہ میں

اخلاق احمد کریمی قاسمی ندوی☆

ولادت باسعادت

آپ کا وطن یوں تو سیوان، صوبۂ بہار کا ایک گاؤں 'بھگوتا' ہے لیکن پیدائش ۱۹۲۷ء میں 'توپسیہ' کلکتہ میں ہوئی۔ کیونکہ آپ کی والدہ اور چچا، چچی وغیرہ گھر اور کلکتہ دونوں جگہ رہتے تھے۔ کلکتہ میں آپ کا نام آپ کے والد نے غوث الاعظم رکھا تھا جو بعد میں شہباز احمد ہوگیا اور مولانا نے شاعری سے دلچسپی کی بنا پر 'شہباز ہندی' تخلص رکھ لیا۔ البتہ خاندان کے لوگ غوث بابو اور غوث بھیا ہی آخر تک کہتے رہے۔

خاندانی حالات

آپ نے ایک ایسے گھرانے میں آنکھ کھولی جو خوشحال اور معزز گھرانہ تھا۔ جسے لوگ عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور اس گھرانے سے قرب کو اعزاز وافتخار کی چیز سمجھا جاتا تھا۔ ان کے والد جناب محمد حبیب احمد صاحب کلکتہ کے صف اول کے تاجروں میں تھے۔ پورے کلکتہ اور اس کے اطراف میں کاروبار پھیلا ہوا تھا۔ بلڈنگ میٹریل اور کنسٹرکشن کا کام ہوتا تھا گاؤں کے ہندو مسلم تمام گھرانوں کی ایک خاصی تعداد ان کے یہاں نوکری کرتی تھی۔

آپ کے والد کے رعب ودبدبہ کا حال یہ تھا کہ جب کلکتہ سے گھر آتے تو لوگ آپس میں بھی جھگڑا نہیں کرتے تھے۔ ساتھ ہی سخاوت اور دریا دلی کا حال یہ تھا کہ رشتہ داروں کے حقوق کی ادائیگی کے ساتھ ہر ضرورت مند کی ضرورت کو پورا کرنے کی کوشش کرتے۔ کھانے پینے میں بھی بڑی نفاست تھی اور دینداری روایتی انداز کی تھی۔

ابتدائی اور عصری تعلیم

آپ نے اپنے بڑے بھائی محمد ادریس صدیقی صاحب جو مدرسہ عالیہ کلکتہ میں پڑھتے تھے ان سے ابتدائی تعلیم شروع کی۔ پھر گھر ہی پر یکے بعد دیگرے مولوی محمد بشیر صاحب رانی پور،

☆استاذ فقہ، جامعۃ الفلاح، اعظم گڑھ

سیوان اور مولوی رحمت اللہ صاحب قاضی پور گوپال گنج نے بہت شفقت اور محبت سے پڑھایا۔

یہ دونوں بزرگ مصطفیٰ آباد پرائمری اسکول میں پڑھاتے تھے، گھر سے دو کلومیٹر دوری پر مصطفیٰ آباد واقع ہے۔ چنانچہ وہاں سے آپ نے پرائمری اسکول پاس کرنے کے بعد 'سی سئیں' مڈل اسکول میں تعلیم حاصل کی۔ یہ گھر سے تقریباً تین کلومیٹر دوری پر ہے۔ پرائمری تعلیم کے دوران ایک مقابلہ جاتی امتحان پاس کر کے 'میرٹ اسکالرشپ' کے حقدار ہوئے۔ ۱۹۴۲ء میں مڈل اسکول پاس کرنے کے بعد 'گوریا کوٹھی' کرم یوگی وددیالے ہائی اسکول میں داخلہ لیا، یہ 'گوریا کوٹھی' مولانا کے گھر سے لگ بھگ ۸ کلومیٹر دور ہے۔

ہائی اسکول میں بھی ان کی کارکردگی سابق کی طرح بڑی اچھی رہی، آپ کی ہمیشہ پہلی پوزیشن اچھے نمبرات سے آتی تھی۔ آپ پر ہر مضمون کے استاد رشک کرتے تھے، ہیڈ ماسٹر صاحب کو یہ امید تھی کہ آپ کے ذریعہ ان کے اسکول کا نام روشن ہوگا۔

نئی تبدیلی

اجتماع عام کل ہند جماعت اسلامی ہند ۵ تا ۷ اپریل ۱۹۴۶ء بمقام الہ آباد کے بعد کا واقعہ ہے کہ مولوی کریم الدین صاحب کے ذریعہ حضرت مولانا کو جماعت اسلامی کا لٹریچر ملا۔ اس کے مطالعہ کے بعد انہیں لگا جیسے وہ مسلمان نہیں ہیں اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ باطل کی درسگاہوں میں تعلیم حاصل کرنا صحیح نہیں ہے۔ چنانچہ طے کیا کہ ہمیں علم دین حاصل کرنا چاہیے، انہوں نے بانیٔ تحریک جماعت اسلامی ہند کو خط لکھا کہ آپ حضرات ہماری دینی تعلیم کا انتظام کیجئے، انہوں نے جواب دیا کہ ابھی یہاں اس کا کوئی نظم نہیں ہے۔ انہوں نے خواہش ظاہر کی کہ درخت کے نیچے ہی بیٹھ کر پڑھ لیں گے۔ کیا شانتی نکیتن کی کوئی عمارت ہے؟ محترم نعیم صدیقی صاحب کے قلم سے لکھا ہوا جواب آیا کہ باطل کی درسگاہوں میں تعلیم حاصل کرنا مناسب نہیں ہے۔ اسی لیے آپ جیسے لوگوں کی خاطر 'چمن گنج' کانپور میں ایک مدرسہ قائم ہوا ہے۔ آپ لوگ وہاں سے ربط قائم کریں۔ آپ گیارہویں جماعت کا ششماہی امتحان دے چکے تھے۔ سالانہ امتحان باقی تھا۔ جولائی ۱۹۴۶ء میں اسکول کی تعلیم ترک کر دی۔ گھر کے لوگوں نے ہر ممکن دباؤ ڈالا اور مختلف سنہرے خواب دکھائے لیکن آپ تھے کہ اپنی منزل کی جانب بڑھ رہے تھے اور آپ کے بدن کے بال بال سے یہ صدا آ رہی تھی ؎

دنیا میں راج بدی کا ہو کیا ہم سے دیکھا جائے گا
اور ڈنکا ہر سو باطل کا کیا یوہی بجتا جائے گا

ہم اس کو بڑھ کر روئیں گے ہم اس پر بند لگائیں گے
ہم نیکی کے جانباز سپاہی نیکی کو پھیلائیں گے

جس چیز کا انہوں نے فیصلہ کر لیا تھا اس کے لیے انہوں نے عزم وحوصلہ کے ساتھ اپنا سب کچھ نچھاور کر دیا اور کسی کی پروا کیے بغیر گویا 'لاطاعة لمخلوق فی معصیة الخالق' کے پیش نظر جامعہ الہیات چمن گنج کانپور پہنچ گئے اور داخلہ لے لیا۔

مدرسۃ الاصلاح اور اسلامی تعلیم

ایک سال جامعہ الہیات کانپور میں پڑھنے کے بعد مولانا ایوب اصلاحی جیراجپوری کے مشورہ سے جو اس وقت جامعہ الہیات کے صدر مدرس تھے مدرسۃ الاصلاح سرائے میر آ گئے اور ۵/ذی قعدہ ۱۳۶۶ مطابق ۱۹۴۷ء وہاں عربی پنجم میں داخلہ لیا اور امتحان میں پہلی پوزیشن حاصل کی۔ اس وقت ان کی عمر تقریباً ۲۰ سال تھی۔ آپ کے ہم جماعت طلبہ میں نظام القرآن سہ ماہی کے ایڈیٹر مولانا محمد ایوب اصلاحی تھے۔ یہ محض خداداد ذہانت تھی کہ ایک سال کے اندر چار سال کا کورس مکمل کر لیا اور وہ بھی مدرسۃ الاصلاح کے چار سال کا کورس عربی اول سے عربی چہارم تک اور اس درجہ میں پہلی پوزیشن حاصل کی۔ آپ نے مدرسۃ الاصلاح سے ۲۴/شعبان ۱۳۷۰ھ مطابق ۳۱/مئی ۱۹۵۱ء میں فراغت حاصل کی۔

اساتذۂ کرام

یوں تو مدرسۃ الاصلاح میں بہت سے اساتذہ تھے۔ مولانا صدر الدین اصلاحیؒ، مولانا جلیل احسن ندویؒ، مولانا مصطفیٰ ندویؒ، مولانا حکیم عبید اللہ رحمانی وغیرہ لیکن صحیح معنوں میں ان کے استاد مولانا اختر احسن اصلاحی صاحب تھے۔ ان کی ان پر خصوصی توجہ تھی، مشکل یہ ہوتی تھی کہ مختلف اساتذہ کی گھنٹیاں ہوتیں۔ حدیث، فقہ، ادب وغیرہ کا کوئی مسئلہ آتا، کوئی اشکال ہوتا، مولانا اختر احسن اصلاحی کا اگلا گھنٹہ ہوتا یا کسی طرف سے وہ آ نکلتے بیٹھ جاتے، ان کے آنے کے بعد میر مجلس وہ ہوتے، پہلے سے موجود اساتذہ اور طلبہ اپنے اپنے ظرف کے مطابق ان سے استفادہ کرتے، روز کا یہ معمول تھا۔

انہوں نے ان کے اندر قرآنی فکر اور قرآن فہمی کا ملکہ پیدا کیا۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا شہباز اصلاحی صاحب، مولانا اختر احسن اصلاحی کے علم وتقویٰ کے معترف اور ان کے بڑے قدرداں تھے بلکہ حقیقت میں انہی کو استاد مانتے تھے۔ پوری زندگی مدرسۃ الاصلاح کے سیاق میں ان کا نام احتراماً

صرف 'مولانا' کر کے لیتے رہے۔

تدریس

اصلاح سے فراغت کے فوراً بعد کچھ دنوں اپنی مادرِ علمی میں خداداد ذہانت وصلاحیت کی بنا پر تدریس کے فرائض انجام دئے۔ مدرسۃ الاصلاح میں جب جماعت اسلامی سے وابستہ اساتذۂ کرام کے لیے ماحول سازگار نہ رہا تو مولانا جلیل احسن ندوی اور حبیب اللہ محمد رانچوی کے ساتھ 'چترپور' میں قائم ایک شخصی دینی مدرسے سے منسلک ہوگئے۔ یہاں تک کہ جامعۃ الفلاح بلریاگنج کا قیام ۱۹۶۲ء میں عمل میں آیا اور مولانا روز اول ہی سے اس آواز سے وابستہ ہوگئے۔ استاد گرامی حضرت مولانا شہباز احمد اصلاحی، حضرت الاستاذ ابوالحسن علی حسنی ندوی سے بیعت وارادت کا تعلق رکھتے تھے۔ یہ تعلق بڑھتا گیا اور حضرت مولانا ندویؒ کے مشورہ سے پہلے تو انہوں نے جامعہ اسلامیہ بھٹکل کی ذمہ داری سنبھالی، پھر حضرت مولانا ندویؒ کی ہدایت پر ندوہ آگئے اور تادم حیات اسی سے وابستہ رہے۔

جامعۃ الفلاح میں بحیثیت استاد، مہتمم اور صدر مدرس

اوپر چترپور جانے اور جامعۃ الفلاح آنے کا سرسری ذکر آچکا ہے، تفصیل یہ ہے کہ 'چترپور' ہزاری باغ میں ایک بڑے منصوبہ کے تحت جامعہ کاشف العلوم کے نام سے درسگاہ قائم کی گئی تھی اور مولانا شہباز احمد اصلاحیؒ کو بڑے اصرار کے ساتھ وہاں لے جایا گیا۔ حضرت مولانا جلیل احسن ندویؒ بھی وہاں بلالئے گئے، یہاں کے اساتذہ میں مولانا محمود عالم اصلاحی، مولانا محمد عنایت اللہ سبحانی، مولانا شہباز اصلاحی مہتمم تھے اور جامعہ کاشف العلوم کو مرکز بنا کر خطہ میں دعوت واصلاح کا کام ہر طبقہ میں بڑھ رہا تھا تو دوسری جانب جامعہ ایک معیاری جامعہ کے طور پر ابھر رہا تھا۔ کاشف العلوم کے بانی انیس الدین احمد امیر حلقہ بہار تھے اور مالیات کی ذمہ داری جناب علی احمد صاحب بیکری والے کے اوپر تھی۔ بدقسمتی سے ان کی بیکری فیل ہوگئی اور انہوں نے معذرت کرلی۔ حسن اتفاق انہی دنوں بلریاگنج میں جامعۃ الفلاح کی داغ بیل پڑ رہی تھی، جامعۃ الفلاح، بلریاگنج کے منتظمین اور رفقاء نے امیر جماعت کے توسط سے مولانا شہباز احمد صاحب اصلاحی کو جامعۃ الفلاح بلالیا، جہاں مولانا عبدالحسیب اصلاحی، مولانا صغیر احسن اصلاحی، مولانا شبیر انور اصلاحی اور مولانا ابوبکر اصلاحی جیسے بزرگ دوست اور قدرداں موجود تھے۔ اس طرح جامعہ کاشف العلوم کے متعدد اساتذہ اور بہت سے طلبہ یہاں آگئے اور ایک ساتھ یہاں کئی درجات کھل گئے۔ یہاں مولانا شہباز احمد صاحب

اصلاحی ۱۹۶۶ء سے ۱۹۶۹ء تک صدر مدرس رہے اور مہتمم بھی رہے۔ جامعۃ الفلاح کا پہلا بیچ (Batch) انہی کے دور اہتمام میں فارغ ہوا۔

بحیثیت شیخ الحدیث اور ممتحن

حدیث شریف میں مولانا کو حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب اور شیخ عبدالفتاح ابوغدہ سے اجازت حاصل تھی، بخاری شریف کا سالانہ امتحان مولانا عبیداللہ مبارکپوری نے لیا تھا اور بہت اچھے نمبر دئے تھے۔ آپ کی خداداد صلاحیت وذہانت اور ان حضرات کی اجازت و حوصلہ افزائی نے آپ کے اندر ایسے موتی جڑ دئے کہ آپ دیگر کتابوں کی تدریس کے ساتھ بخاری شریف اور مسلم شریف کا بھی پوری بصیرت اور تفقہ کے ساتھ درس دیتے رہے۔

استاد گرامی جب ندوۃ العلماء چلے گئے، اس وقت بھی جامعۃ الفلاح سے رشتہ استوار رکھا اور جامعۃ الفلاح کے منتظمین ان سے آخری درجات کے لیے قرآن کریم کے امتحانی پرچے بنواتے۔ صحت کی خرابی کے باوجود بڑی محنت سے وہ پرچے بناتے، کاپیاں جانچتے، ایک بار کا واقعہ ہے کہ جامعۃ الفلاح سے پرچہ بنانے اور کاپی جانچنے کا معاوضہ بطور اکرامیہ پیش کیا گیا تو انہوں نے تنگدستی کے باوجود شکریہ کے ساتھ رقم واپس کردی۔ اللہ جزائے خیر دے۔ آمین

مرکزی درسگاہ اسلامی رام پور

تقریباً نصف صدی تک استاد گرامی حضرت مولانا شہباز احمد اصلاحی مختلف مرکزی درسگاہوں اور دینی تعلیمی اداروں سے وابستہ رہے۔ درسگاہ اسلامی رام پور سے مولانا کی وابستگی اس دور کی ہے جسے اس درسگاہ کا عہد زریں کہا جاسکتا ہے۔ یونیورسٹیوں کو خیرباد کہہ کر اور علم دین کی طلب صادق لے کر درسگاہ کا رخ کرنے والے طلبہ کا اپنا جذبہ اور اپنی نفسیات ہوتی ہے۔ ان کے جذبہ کی قدردانی اور ان کی نفسیات کی رعایت کرنا آسان نہیں ہوتا۔

اس تجربہ سے مولانا کو بھی گزرنا پڑا اور مولانا نے جس خوبی سے اسے نبھایا ہوگا اس کی کامیابی کا اندازہ اس بنیاد پر قائم کرنا غلط نہیں ہوگا کہ درس گاہ اسلامی رامپور کے اس دور کے طلبہ آج اپنے اپنے میدانوں میں نمایاں اور ممتاز ہیں۔

جامعہ اسلامیہ بھٹکل

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کی سرپرستی شروع سے جامعہ اسلامیہ کو حاصل رہی۔ ۱۹۶۷ء میں جامعہ کے پہلے مہتمم مولانا عبدالحمید ندوی کے بعد جامعہ کی رفتار گویا رک سی

گئی۔۱۹۷۳ء میں نئی بستی جامعہ آباد میں اس کی منتقلی عمل میں آئی۔ایک نئے حوصلے کے ساتھ یہاں سے جامعہ کی تعمیر وترقی کے لیے سرپرست جامعہ کی نگاہ مولانا شہباز احمد اصلاحی پر پڑی اور جامعہ نے اپنے نئے مہتمم کے ساتھ تعمیر وترقی کے عہد نو کا آغاز کیا۔ جو ۱۹۷۷ء تک تقریباً پانچ سال جاری و ساری رہا۔ یہ جامعہ کا عہد زریں تھا۔ جامعہ آباد کی نئی آبادی میں جب جامعہ اسلامیہ منتقل ہوا تھا اس وقت یہ ایک ویرانہ تھی، لیکن مولانا نے اس ویرانے کو آباد کیا، جامعہ میں مولانا کی شخصیت ایک مشفق باپ کی تھی۔ مولانا کی سرپرستی میں نہ صرف طلبہ نے بلکہ اساتذہ نے بھی بہت کچھ سیکھا۔

مولانا نے اساتذہ کی رہنمائی اور تربیت کا خاص خیال رکھا۔ مصنوعی اور تکلفانہ طرز زندگی سے انہیں دور رکھنے کی بھرپور کوشش کی۔ ابتدائی درجات کے بچوں پر خاص توجہ تھی، وہ ہر ہفتہ چھوٹے درجات میں تعلیمی رفتار کو دیکھنے ضرور آتے، مولانا کے نظام تعلیم وتربیت میں استاد کو کلیدی اہمیت حاصل تھی۔ وہ بچوں کے سنوار و بگاڑ میں استاد کو زیادہ ذمہ دار ٹھہراتے تھے۔ انہوں نے اساتذہ کو شفقت کرنا سکھایا، انہیں انتقامی جذبات سے دور رکھنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔

مولانا کی عادت تھی کہ سہ ماہی اور ششماہی امتحانات کے بعد تمام اساتذہ کو جمع کرتے۔ وہ نتائج کا گہرا مطالعہ کرکے آتے، وہ ہمیشہ یہی کہتے کہ بچوں کی تربیت کے اصل ذمہ دار اساتذہ ہیں۔ اگر والدین بچوں کی تعلیم وتربیت کر سکتے تو اساتذہ کے پاس کیوں بھیجتے۔ وہ طلبہ کے والدین سے بھی ان کی تعلیم وتربیت کے تعلق سے ربط رکھتے تھے۔ وہ اساتذہ کی مجلسوں میں اس طرح مسائل کا احاطہ کرتے کہ بات عمومی ہونے کے باوجود ہر ایک کو آئینے میں اپنا چہرہ نظر آتا۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء

استاد گرامی قدر حضرت مولانا شہباز احمد اصلاحی ندوہ کے ایک سینئر مدرس تھے۔ طلبہ ان کے گرویدہ تھے، ہر قسم کے مسائل کا حل ان کی ذات میں تلاش کرتے تھے۔ اساتذہ کی بھی ایک خاصی تعداد ان سے مختلف مضمون کے تعلق سے رجوع کرتی تھی۔ میں نے دیکھا استاد محترم مولانا یعقوب صاحب ندوی کو جو بلا ناغہ مولانا سے کچھ نہ کچھ عصر کے بعد مسجد کے صحن میں پوچھتے رہتے تھے۔ آپ ندوہ میں مسلم شریف، موطأ امام مالک، سنن ابوداؤد، سنن نسائی، ابن ماجہ اور حجۃ اللہ البالغہ وغیرہ پڑھاتے رہے۔ آپ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی سے بہت قریب تھے۔ پورا رمضان تکیہ رائے بریلی میں گزارتے اور شام کی نشست جو مہمان خانہ کے صحن میں ہوا کرتی اس میں حضرت مولانا ندوی کی موجودگی میں پابندی سے بیٹھتے اور جب دوسرے حضرات چلے جاتے اس وقت بھی

آپ مغرب کی نماز تک موجود رہتے۔

حضرت مولانا بحیثیت معلم

مولانا شہباز احمد اصلاحی صاحب کی ذات میں مختلف حیثیتیں اکٹھا تھیں لیکن بنیادی طور سے وہ ایک معلم اور مربی تھے۔ جہاں اور جب جس میدان میں رہے ان کی اس حیثیت کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔ مولانا ایک خاموش اور مخلص خادم علم ومعلم کی حیثیت سے طلبہ کو فائدہ پہنچاتے تھے، وہ اپنی تدریسی مشغولیت کے ساتھ ساتھ طلبہ میں علمی اور دینی شوق اور جذبہ بھی بڑھانے کی فکر رکھتے تھے، کیونکہ آپ اس سطح اور اس نوعیت کے معلم تھے جو درس وتدریس کو کار پیمبری سمجھتے ہیں۔ تقریباً نصف صدی تک وہ تعلیم وتربیت سے وابستہ رہے۔ وہ اس مقدس مشن کے لیے ایسے یکسو ہوئے کہ تعلیم وتربیت کے ساتھ انہوں نے کسی بھی قسم کی دوسری مصروفیت یا مشغولیت کی آمیزش کو قبول نہیں کیا۔ مولانا نے اپنے طرز عمل سے درس وتدریس کی جس طرح پاسداری کی وہ پاسداری کی ایک روشن مثال ہے جو انحطاط کے اس دور میں خال خال ہی دکھائی دیتی ہے۔

مولانا مرحوم نے خود کو تعلیم وتربیت کے لیے فارغ کر رکھا تھا بلکہ وقف کر رکھا تھا۔ اب ایسے سچے معلم ومربی کو دیکھنے کے لیے آنکھیں ترس رہی ہیں کہ ایک طرف جس کے علم وفضل پر بھی اعتبار واعتماد کیا جا سکے اور اسی کے ساتھ جس سے اس قدر آسانی وسہولت سے ملاقات بھی ممکن ہو سکے۔

حضرت مولانا بحیثیت مربی

مولانا کے نزدیک تربیت کے بغیر تعلیم کا تصور ہی ناقص ہے۔ چنانچہ مولانا نرے معلم نہیں تھے بلکہ سچے معلم تھے اور ایک سچا معلم، مربی ہوتا ہی ہے۔ آپ کو بچوں کی اصلاح وتربیت کا بڑا اہتمام تھا، اپنے بچے کو بھی آزاد نہیں چھوڑ رکھا تھا، اس سلسلہ میں یہاں تک اہتمام کیا تھا کہ وہ یہ پسند نہیں کرتے تھے کہ کوئی ان کے بچے کو کوئی چیز چاکلیٹ وغیرہ دے۔ کہتے اس سے چٹورپن کی عادت پڑتی ہے۔

ایک صاحب نے اپنے بچے کے لیے ان کے پاس رقم جمع کی اور جس انداز سے بچے پر خرچ کرنے کے لیے کہا کہ اس سے فضول خرچی کے ساتھ بچے کے بگڑنے کا اندیشہ تھا، مولانا نے فرمایا: آپ کی ہدایت کے مطابق تو نہیں البتہ بچے کے حق میں جو مفید ہوگا کروں گا۔ اگر آپ کو پسند نہیں تو پھر مجھے معاف رکھئے۔

تربیت کا اہتمام

وہ تعلیم وتربیت کوایک دوسرے سے الگ نہیں سمجھتے تھے،کوئی استاد ہو یا طالب علم۔ایک شفیق وخیرخواہ مربی کی طرح ہمیشہ ان کی یہ کوشش رہی کہ اس کے علمی ارتقاء کے ساتھ کیسے اس کے اندر وہ خوبیاں پروان چڑھیں جوانبیاء کی وراثت اور جانشینی کا لازمہ ہیں اور کیسے وہ کمزوریاں دور ہوں جن سے وارثین انبیاء کو پاک وصاف ہونا اوردور رہنا چاہیے۔طلبہ کے اندر ڈسپلن پیدا کرنا،ان کی صفائی ستھرائی،طرز معاشرت اورنشست وبرخواست پرنظر رکھنا اور بروقت مناسب رہنمائی ان کی خصوصیات تھیں۔ وہ دیکھتے رہتے کہ کہیں کسی پر کوئی زیادتی نہ ہوجائے۔کوئی نوجوان ان کی بے توجہی سے ضائع نہ ہوجائے۔ بیجا سختی یا نامناسب طرز عمل سے کوئی اپنا حوصلہ نہ ہار بیٹھے یا غلط رخ اختیار نہ کرے۔اس معاملہ میں وہ اپنے کواللہ کے آگے جوابدہ سمجھتے تھے۔ایسا بھی نہیں کہ جب وہ ذمہ دارہوں توان چیزوں کا خیال رکھیں اور جب ذمہ دار نہ ہوں توانھیں کوئی مطلب نہ ہو۔

ابتدائی دور میں مولانا محمد طفیل صاحب سے اپنی خط وکتابت میں مولانا شہباز احمد اصلاحی اس بات پر زور دیتے ہیں کہ رفقاء اورکارکنوں کی اصلاح وتربیت پر زیادہ توجہ دی جائے اور بعد میں یہی چیز ان کی توجہ کا اولین محور رہی ہے۔ان کی ابتدائی دور کی جوڈائری ہے اس سے بھی ان کی نگاہ میں اس کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔

ایمرجنسی کے بعد مسلم اورغیر مسلم دونوں کے ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے مولانا کہتے ہیں اس ملک کا سب سے اہم مسئلہ نوجوانوں کی تربیت اورکردار سازی ہے۔

تربیت میں اعتدال

سب جانتے ہیں تربیت بڑا مشکل اور صبر آزما کام ہے۔ بہت سے لوگ اتنی سختی کرتے ہیں کہ یا تو بچے بھاگ جاتے ہیں یا ان کی شخصیت ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوجاتی ہے۔بہت سے لوگ تربیت کے نام پر اس طرح ہاتھ دھوکر پیچھے پڑجاتے ہیں جیسے کسی جاسوس اوردشمن کا کردار ادا کررہے ہوں، بہت سے لوگ کسی بات کو وقار کا مسئلہ بنالیتے ہیں اورطالب علم کی زندگی سے کھیل جاتے ہیں، ان سب باتوں کا نتیجہ یا تو یہ نکلتا ہے کہ طالب علم دین اوراہل دین مدرسہ اورارباب مدرسہ سے بدظن اورمتنفر ہوجاتا ہے یا اس کے اندر منافقت پیدا ہوجاتی ہے۔

مولانا شہباز احمد اصلاحیؒ کا طرز عمل اس معاملہ میں بھی بڑا متوازن ہے۔وہ سختی بھی کرتے ہیں اورانھوں نے اخراج بھی کیا ہے لیکن بہت کم، ناگزیر حالات میں، جذبات میں آکر نہیں۔ بالکل

ٹھنڈے ہوکر جیسے کوئی طبیب اورڈاکٹر مریض کے کسی عضو پر نشتر چلاتا ہے۔

اصلاح کا واقعہ ہے کہ ایک ماسٹر صاحب نے ایک طالب کی گستاخی کی بنا پر پٹائی کی اور اخراج کا فیصلہ کرلیا لیکن مولانا شہباز صاحب کی گفتگو کے بعد اس طالب علم کا اخراج نہ ہوسکا۔ ماسٹر صاحب نے معاف کردیا اورطالب علم کی تعلیم جاری رہی۔

مولانا کا یہ اپنا ایک نرالا انداز تربیت تھا، وہ طلبہ میں اعتدال وتوازن پیدا کرنا چاہتے تھے اور افراط وتفریط سے انہیں بچانا چاہتے تھے۔مولانا کی ایسی تربیت کے طفیل طلبہ کی فکر کی تعمیر، ان کے شعور کی تربیت اوران کی صلاحیتوں کو پہچاننے اورنکھارنے اورطلبہ میں خودشناسی پیدا ہونے کا جوکام ہوا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔

ملت کی بڑی خدمت یہ ہے کہ قرآن وسنت کی بنیاد پر طلبہ کوافراط وتفریط اورغلو سے نکالا جائے۔ان کے اندر توازن پیدا کیا جائے۔ایک دوسرے کو برداشت کرنے اورایک دوسرے کا احترام کرنے کی عادت ڈالی جائے۔مولانا کے اندر یہ اعتدال،میانہ روی کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے۔ملت کے شاہینوں کی تربیت وہ اسی انداز سے کرتے نظر آتے ہیں کہ ان کے اندر توازن و اعتدال پیدا ہو۔

انداز تربیت

مولانا کی تربیت کا انداز ایسا نہیں ہوتا تھا کہ طلبہ کو یا اساتذہ کو شرمندگی یا دوسروں کے سامنے ذلت کا احساس ہو۔وہ لوگوں کی خامیوں اورکمزوریوں کی تلاش میں نہیں رہتے کہ اس کو بے عزت کیا جائے یا اس کے خلاف کارروائی کا بہانہ ہاتھ آئے یا غصہ میں کوئی بات کہی جائے۔

واقعہ یہ ہے کہ جامعۃ الفلاح میں ایک ساتھ لڑکے کھانا کھاتے تھے جس سے کھانا ضائع ہوتا تھا۔اس کو دیکھ کر مولانا نے بقول مولانا محمد اسماعیل فلاحی ایسی مؤثر اوردلپذیر تقریر کی کہ پھر کھانا ضائع ہوتا ہوا نظر کم آیا۔

سلامتیٔ فکر

اللہ تعالیٰ نے مولانا کوفکر کی سلامتی اوراعتدال وتوازن عطا فرمایا تھا، جس کو ہر معاملہ میں آپ ملحوظ رکھتے۔

ایک بار کا واقعہ ہے کہ ان کے ایک عزیز نے ان سے جاننا چاہا کہ فیصد حاضری کے ضابطہ کی وجہ سے طلبہ کا سال برباد ہوجاتا ہے، اس میں کیا حرج ہے اگر ایسے طلبہ کی غیر حاضری کو خاموشی

سے حاضری بنا دیا جائے۔ انہوں نے جواب دیا یہ چیز 'ضابطہ شکنی' بھی ہے اور 'امانت و دیانت' کے خلاف بھی۔

تربیت میں عملی مثال

مولانا طلبہ کو جس جس بھلائی کا حکم دیتے ہیں، نہ صرف یہ کہ خود اس پر عمل کرتے بلکہ اس کے کرنے میں پیش پیش نظر آتے۔ جن برائیوں سے روکتے ان سے خود سب سے زیادہ دور نظر آتے۔ آپ کی زندگی میں اس کی بہت ساری مثالیں موجود ہیں۔ جن میں سے چند درج ذیل ہیں۔

'خنجر پور' بھاگلپور کے جناب ماسٹر قمر الدین صاحب کا بیان ہے کہ مولانا شہباز صاحب کا تربیت کے سلسلہ میں انداز یہ تھا کہ طلبہ کے سامنے عملی مثالیں پیش کی جائیں۔ مولانا شہباز صاحب کہتے ہیں کہ راستہ میں اینٹ پتھر یا کوئی تکلیف دہ چیز پڑی ہے تو اسے خود ہٹا دیجئے۔ بچے دیکھیں گے تو خود کریں گے۔ ایک بار کا ذکر ہے درسگاہ کے اندر کچھ گرا ہوا تھا۔ ماسٹر قمر الدین صاحب نے لڑکوں سے صاف کرنے کو کہا، مولانا شہباز صاحب نے حکم دینے سے روکا اور خود صفائی کرنے لگے، لڑکے دیکھ کر دوڑے اور صفائی میں شامل ہو گئے۔

مولانا ظہیر عالم فلاحی کہتے ہیں، میں عربی پنجم کا طالب علم تھا۔ جاڑے کی رات تھی۔ ایک دن فجر سے قبل اٹھا۔ بیت الخلاء گیا، کیا دیکھتا ہوں کہ مولانا شہباز صاحب بیت الخلاء کی صفائی کر رہے ہیں، کہتے ہیں کہ اس کے بعد بھی کئی مرتبہ فجر سے پہلے بیت الخلاء کی صفائی کرتے دیکھا ہے۔

یہ واقعہ تو بہت سے لوگوں نے دیکھا ہے کہ حسن البناء منزل سے مشرقی حصے کے بیت الخلاء کا حوض بھر جانے کی وجہ سے بڑی دشواری کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ ایک روز حوض کی صفائی کے لیے مولانا شہباز صاحب آگے بڑھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے بعض اساتذہ اور کچھ سینئر طلبہ آ گئے اور حوض کی غلاظت بالٹی سے نکال نکال کر تھوڑی دیر میں ان لوگوں نے حوض کو دوبارہ استعمال کے لائق بنا دیا۔ لوگ بتاتے ہیں کہ دارالاقامہ میں چھوٹے بچے کبھی بستر پر پیشاب کر دیتے تو فجر سے پہلے مولانا شہباز صاحب ان کا بستر دھو دیا کرتے تھے۔

اس بارے میں کہا جاتا ہے 'الفعل ابلغ من القول' عمل کا دلوں پر اثر الفاظ سے زیادہ ہوتا ہے۔ اسی کے بارے میں کہا جاتا ہے۔

Actions speak louder than words.

طلبہ سے ربط و تعلق

آپ کا طلبہ سے اتنا گہرا تعلق تھا کہ آپ نے سلسلۂ تعلیم کو کسی مخصوص وقت میں محدود نہ کیا تھا کہ اس کے علاوہ دیگر اوقات لوگوں کو اپنے فیض سے محروم رکھتے ہوں۔ بلکہ آپ کو جب بھی مناسب موقع میسر آتا تعلیم دیتے حتی کہ رات اور رات کی کوئی گھڑی یا ساعت بھی اس راہ میں رکاوٹ نہ تھی۔ جس کی تفصیل درج ذیل ہے۔

غیر تدریسی اوقات میں طلبہ کے ساتھ

غیر تدریسی اوقات میں طلبہ ان سے بے تکلف ملتے اور استفادہ کرتے اور شام کے اوقات میں جب کہ عام طور پر لوگ ٹہلتے یا بے تکلف مجلسی گفتگو کا انداز اختیار کرتے ہیں، مولانا مسجد کے سامنے بالکل رہگذر پر ایک چبوترے پر بیٹھ جایا کرتے تھے اور لوگ ان سے بے تکلف ملتے تھے اور ان کی گفتگو سے فائدہ اٹھاتے تھے۔

حال میں کی گئی توسیع سے قبل مسجد دارالعلوم ندوۃ العلماء کے سامنے ایک کنواں ہوا کرتا تھا عصر بعد مولانا اسی کنویں کی منڈیر پر بیٹھ جایا کرتے تھے، طلبہ جمع ہونے لگتے اور پھر بھانت بھانت کے سوالات کا سلسلہ چل پڑتا۔ مولانا جواب دیتے رہتے۔ مختلف ذوق رکھنے والے طلبہ اپنے اپنے ذوق کے مطابق سوالات پوچھتے، اشکالات کرتے، اپنی گتھیاں سلجھاتے، بلا تکلف مولانا کے سامنے اپنی کچی پکی فکر اور ناپختہ رائے کا اظہار کرتے، اس طرح مولانا کی یہ مجلس علمی، تعلیمی، مذہبی، تحریکی، ادبی اور سیاسی جیسے مختلف موضوعات پر محیط ہوا کرتی۔

ہمہ وقت طلبہ کے ساتھ

مولانا شہباز احمد اصلاحیؒ کا عجیب و غریب حال تھا۔ نہ انھیں تکان محسوس ہوتی اور نہ اکتاتے۔ ہر وقت طلبہ انھیں گھیرے رہتے، ابتدائی سے لے کر فضیلت اور تخصص تک کے طلبہ اور اساتذہ بھی، وقت کی کوئی قید نہیں؛ فجر بعد، ظہر بعد، عصر بعد، مغرب بعد اور عشاء کے بعد بیمار ہوں یا صحت مند، ہر وقت اور ہر حال میں طلبہ کی الجھنیں دور کرنا، اشکالات دور کرنا اور صحیح نہج پر ذہن کی تربیت کرنا ان کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔

امتحانات کے زمانہ میں طلبہ کے ساتھ

امتحانات کے زمانہ میں مغرب وعشاء کی نماز کے بعد مولانا کا مسجد سے نکلنا مشکل ہو جاتا تھا، طلبہ ایک کے بعد ایک اپنی مشکلیں لے کر حاضر ہوتے اور مولانا پوری خوش طبعی کے ساتھ

ان کو سلجھانے میں لگ جاتے۔

نگراں کی حیثیت سے طلبہ کے ساتھ

مولانا ندوہ کے رواق اطہر کی تیسری منزل کے بہت دنوں تک نگراں رہے ہیں، شام کو مغرب بعد سے رات دیر تک طلبہ کی درسی وغیر درسی مشکلات حل فرماتے تھے۔

چلتاپھرتاکتب خانہ

انھیں بجاطور پر ’چلتا پھرتا کتب خانہ‘ کہا جاتا تھا۔طلبہ کے ہر معقول اور نا معقول سوال اور ہر کس و ناکس کا جواب دیتے اور بشاشت کے ساتھ دیتے۔قدرت نے انھیں علم کے ساتھ حلم بھی عطا فرمایا تھا،اس امتزاج نے ان کی نافعیت کو عام کیا اور استحکام بخشا اور کئی دہائیوں تک طلبہ ان سے اکتساب فیض کرتے رہے۔

مجلس علمی کا حال

مولانا کی ان مجلسوں کی ایک خصوصیت تھی تنوع،لیکن اس سے زیادہ اہم خصوصیت تھی بے تکلفی،نہ ہٹو بچو کا ماحول،نہ علم کے پندار کا اظہار اور نہ سوال پوچھنے والے کے لیے شرمسار ہونے کا اندیشہ،نہ ناراضگی و خفگی کا کوئی خطرہ۔طلبہ گزرتے ہوئے سرراہ کنویں کے پاس ٹھہر جاتے،سوال پوچھا،جواب سنا اور چلتے بنے۔مولانا کی یہ مجلس علمی صاحب فراش ہونے کے ایک دن پہلے تک مستقل لگتی رہی۔

بحرالعلوم کی حیثیت سے

مولانا مرحوم کتاب الٰہی کے معلم،نکات قرآنی کے فاضل بے بدل،نظام قرآن کے ترجمان،دقائق حدیث کے رمز شناس،فقہ و اصول فقہ کے پیچیدہ مسائل کے گرہ کشا،علوم عقلیہ و لغویہ کے ماہر،اردو شاعری و تنقید کے امام اور مسائل تصوف کے عارف بے نظیر تھے۔ان علوم سے آگے بڑھ کر تاریخ اسلامی،تاریخ عالم،علم النفس،علم الاجتماع،علم السیاسۃ،علم الاقتصاد،علم الجغرافیہ،علم الحساب جیسے علوم میں بھی طلبہ ان سے اپنی پیاس بجھاتے اور اپنی مشکلات دور کرتے۔عربی زبان و ادب کے علاوہ اردو،ہندی،فارسی اور انگریزی ادب کا بھی خاصا مطالعہ تھا۔زبان و ادب کا اچھا ذوق رکھتے تھے۔یادداشت بلا کی تھی،ایک بار جو چیز دیکھ لیتے یاد ہو جاتی،لمبی لمبی نظمیں ایک بار دیکھ لیتے تو ذہن میں نقش ہو جاتیں،حقیقت میں وہ اپنی ذات میں ایک کتب خانہ بن گئے تھے۔چلتا پھرتا کتب خانہ،ایسا کتب خانہ جس سے ہر کسی کو چلتے پھرتے،اٹھتے بیٹھتے استفادہ کی آزادی تھی۔

قرآن فہمی

قرآن کریم ان کا خصوصی موضوع تھا،اسے پڑھنا،پڑھانا،اس پر تدبر اور غور و خوض ان کا سب سے محبوب مشغلہ تھا،کیونکہ مولانا کے استاد خاص حضرت مولانا اختر احسن اصلاحی نے مولانا کی مشہور نظم سننے کے بعد کہا تھا ”کیا اچھا ہوتا اپنی ساری توجہ قرآن پر صرف کرتے اور مولانا فراہی کے چھوڑے ہوئے کام کی تکمیل کرتے“ مولانا فراہی کے کام کی تکمیل تو نہ کر سکے لیکن اپنے آپ کو قرآن اور علوم قرآن کی اشاعت کے لیے وقف کر دیا۔

مولانا فراہی کی قرآنی خدمات کی بنیاد یہ ہے کہ قرآن کریم ایک منظّم کتاب ہے۔اس کی تمام سورتیں اور آیتیں آپس میں مربوط ہیں۔استاد گرامی مولانا شہباز احمد قرآنی دقائق کے ماہر تھے۔مولانا فرماتے تھے لوگ نظام قرآنی کی دلیل پوچھتے ہیں جبکہ میں اپنی آنکھوں سے پورے قرآن میں ربط و نظم دیکھ رہا ہوں۔یہاں مولانا کی نظم پر مبنی تفسیر کی ایک مثال پیش کی جاتی ہے۔

سورۃ الاحزاب کی آیت ’ماکان محمد أبا احد من رجالکم، ولکن رسول اللہ وخاتم النبیین ‘ کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ قادیانی اس سے استدلال کرتے ہیں کہ حضور ﷺ کے پاس مہر نبوت تھی۔اب جو نبی بھی آئے گا آپ کی مہر کی تصدیق سے آئے گا،کوئی مستقل نبی نہیں آسکتا،قادیانیوں کا یہ استدلال آیت کے سیاق سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔نظم قرآن کی روشنی میں آیت کی تفسیر یہ ہے کہ عربوں کے رسم و رواج میں متبنیٰ کو بیٹے کا مقام حاصل تھا۔قرآن نے اس رسم کو ختم کرنا چاہا اور حکم دیا کہ لوگوں کو ان کے حقیقی باپ کی طرف منسوب کیا جائے۔اس لیے زینب سے شادی کرنے میں کوئی حرج نہیں۔اس پر سوال پیدا ہو سکتا تھا کہ اگرچہ آپ زید کے باپ نہیں پھر بھی کیا ضروری ہے کہ آپ زینب سے شادی کریں۔اس لیے فرمایا ’ولکن رسول اللہ‘ چونکہ یہ خدا کے پیغمبر ہیں۔اس لیے ضروری ہے کہ ان کے ذریعہ یہ جاہلانہ رسم توڑی جائے۔اس پر یہ بات ذہنوں میں آسکتی تھی کہ کیا ضروری ہے کہ اتنے بڑے پیغمبر اس کام کو کریں۔ان کے بعد جو دوسرے نبی آئیں گے وہ اس رسم کو ختم کر سکتے ہیں اس شبہ کو دور کرنے کے لیے فرمایا ’وخاتم النبیین‘ آپ نبیوں کی مہر ہیں۔آپ کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں۔اس لیے اس رسم کو توڑنا آپ ہی کے ذمہ ہے۔

حدیث فہمی

حدیث شریف میں مولانا کو کسی نامور محدث کی باقاعدہ شاگردی کا موقع نہ ملا لیکن چونکہ مولانا کو اللہ تعالیٰ نے ذہن رسا سے نوازا تھا،اس لیے حدیث شریف کا مطالعہ بھی مولانا نے تحقیق و

تفقہ کے ساتھ کیا تھا۔ یہاں مولانا کی حدیث فہمی کے چند نمونے پیش کیے جا رہے ہیں۔

۱- امام بخاریؒ نے اپنی سند سے حضرت سائب بن یزیدؓ سے نقل کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ اور ابوبکر وعمرؓ کے عہد میں جمعہ کی پہلی اذان اس وقت ہوتی تھی جب امام منبر پر بیٹھتا تھا، جب حضرت عثمان خلیفہ ہوئے اور آبادی میں اضافہ ہوگیا تو آپ نے زوراء کے مقام پر تیسری اذان کا اضافہ کیا۔

اس حدیث کی بنیاد پر عام طور سے محدثین اور فقہاء کی رائے ہے کہ حضور ﷺ کے عہد مبارک میں جمعہ کی نماز کے لیے خطبہ کی اذان کے علاوہ کوئی اور اذان نہ تھی اور قرآن کریم میں سعی الی الجمعہ کا حکم جس اذان کے بعد ہے وہ یہی خطبہ کی اذان ہے، جمعہ کی پہلی اذان کا اضافہ حضرت عثمان کے عہد میں ہوا اور اس وقت سے جمعہ میں دو اذانیں جاری ہیں۔

مولانا اس تشریح کے خلاف تھے، مولانا کی رائے تھی کہ جمعہ کے لیے دو اذانیں حضور اکرم ﷺ کے عہد سے تھیں، سورہ جمعہ میں جس اذان کا تذکرہ ہے وہ پہلی اذان ہے، حضرت عثمان نے ایک وقتی ضرورت کے تحت تیسری اذان کا اضافہ کیا تھا جیسا کہ حدیث میں خود صراحت ہے کہ مدینہ کی آبادی کی کثرت تھی۔ اس لیے یہ اذان مدینہ کے دوسرے علاقے مقام زوراء میں ہوتی تھی۔
مولانا اپنی اس رائے پر متعدد دلائل دیتے تھے۔ تفصیل کے لیے 'ذکر شہباز' دیکھیے۔

۲- 'انما الاعمال بالنیات' یہ مشہور حدیث ہے۔ اس حدیث کے فوائد پر علماء نے بہت تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ امام شافعیؒ سے منقول ہے کہ اس حدیث کا فقہ کے ستر ابواب میں دخل ہے اور بعض حضرات نے اس سے تین سو سے زائد فقہی مسائل مستنبط کیے ہیں۔

مولانا فرماتے تھے کہ اس حدیث سے فقہ کی نیت پر استدلال کرنا تکلف ہے، یہ حدیث تصوف اور احسان کے باب سے متعلق ہے۔ اگر کسی نے فقہ کی تمام جزئیات کی رعایت کرتے ہوئے دو رکعت نماز ادا کی لیکن اس نے اللہ تعالیٰ کی رضا کے علاوہ کچھ اور طلب کیا تو اگرچہ فقہاء کے نزدیک اس کی نماز صحیح ہوگئی لیکن اس حدیث کی رو سے اسے اللہ تعالیٰ کے یہاں کوئی اجر نہیں ملے گا۔

۳- ظہر اور عصر کی نماز کے وقت کے سلسلہ میں فقہاء کرام اور محدثین کا مشہور اختلاف ہے۔ مولانا اس مسئلہ میں پورے شرح صدر کے ساتھ امام ابوحنیفہ کی تائید فرماتے تھے اور فرماتے کہ امام صاحب کی اصل دلیل قرآن کریم کی آیت ہے 'وعشیا وحین تظہرون' 'عشیا' سے مراد عصر کی نماز ہے۔ یہ لفظ عربی زبان میں شام کے وقت کے لیے جب کہ دن ٹھنڈا اور خوشگوار ہو جاتا ہے مستعمل ہے۔ حضور اکرم ﷺ اور خلفائے راشدین نے کبھی عصر کی نماز اس وقت سے پہلے نہیں پڑھی۔ مثل اول کی

روایت محفوظ نہیں ہے بلکہ سند کے لحاظ سے صحیح روایتوں میں 'فی التلول' (ٹیلوں کا سایہ) کا تذکرہ ہے امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ نے ظہر کی نماز بہت تاخیر سے پڑھی، کیونکہ عام طور سے ٹیلوں کا سایہ زوال آفتاب کے بہت بعد ظاہر ہوتا ہے۔

مولانا فرماتے ہیں کہ کسی مستطیل چیز کا سایہ جب ایک مثل ہوگا ٹیلوں کا سایہ اس وقت ٹیلوں کے دامن میں ہوگا، ٹیلوں کا سایہ نظر آئے گا مطلب یہ ہے کہ وقت ایک مثل سے زائد ہو چکا ہے۔

اس کے علاوہ اور بھی مولانا کی احادیث اور اصول حدیث کے سلسلہ میں تحقیقات ہیں جن کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں ہے۔ تفصیل کے لیے 'ذکر شہباز' دیکھیے۔

فقہ واصول فقہ

مولانا ہمیشہ حنفی مسلک پر کار بند رہے۔ امام ابوحنیفہ کی فقاہت کے بہت قائل تھے اور اختلافی مسائل میں واضح کرتے تھے کہ امام صاحب کس طرح قرآن کریم کے دقائق سے استدلال کرتے ہیں۔ فرماتے تھے کہ امام ابوحنیفہ اور امام بخاری کے مذاہب میں مجھے بہت مشابہت نظر آتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دونوں اماموں کی نظر قرآن کریم کے دقائق پر رہتی ہے۔

مولانا کی رائے تھی کہ اصول فقہ کا علم پختہ ہونے سے پہلے ہی جمود کا شکار ہوگیا، اصول فقہ سے مختلف رایوں اور مذاہب کی صحت کی جانچ کا کام لیا جاتا لیکن بہت جلد لوگوں نے ہر مذہب کے اصول جدا کر لیے۔ فقہ کی طرح اصول فقہ بھی حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی شاخوں میں تقسیم ہوگیا۔

مولانا کے فتووں اور فقہی آراء میں صفت اعتدال نمایاں تھی۔ مولانا فقہی مسائل میں قرآن وسنت سے استناد کے قائل تھے۔ مسلمانوں میں گروہ بندی کے سخت مخالف تھے۔ یہی وجہ ہے کہ دلیل واضح ہو جانے کے بعد کسی کی تقلید کے روادار نہیں تھے۔ امام بخاری کے بارے میں فرماتے :امام بخاری کی فقہ صحیح بخاری کے تراجم میں پنہاں ہے۔

فقہ شافعی کی ایک کتاب ہے 'فتح المعین شرح قرۃ العین' چند اساتذہ اس کتاب کو شامل درس رکھنے کے خلاف تھے لیکن مولانا اس کتاب کو نصاب میں رکھنے کے حامی تھے۔ آپ کی رائے تھی مشکل کتابیں داخل درس رہنی چاہئیں۔ ان سے طلبہ کو تدبر کی عادت پڑتی ہے۔ مشکل عبارتوں کو سمجھنے کا ملکہ پیدا ہوتا ہے۔

ادب و شاعری

ادب وشاعری سے بڑی دلچسپی تھی۔ اردو اور فارسی کے سیکڑوں شعر زبانی یاد تھے اور ان کو

موقع ومحل کی مناسبت سے پڑھتے تھے۔آپ کوتقریباً تمام اساتذہ کے کلام سے دلچسپی تھی۔خاص طور سے میرتقی میر، غالب، اقبال، فانی بدایونی، حسرت موہانی اور اصغر گونڈوی کے اشعار پڑھتے تھے۔ فارسی شاعری میں حافظ شیرازی، شیخ سعدی، مولانا روم اور غالب و اقبال سے خصوصی دلچسپی تھی۔ شعروشاعری کا شوق ان کے اندر ہائی اسکول کے زمانہ ہی سے تھا، اصلاح کی طالب علمی کے زمانہ میں انہوں نے جماعت اسلامی ہند اعظم گڑھ کے ماہانہ اجتماع میں اپنی معروف نظم ''نیکی کے سپاہی'' سنائی تو رفقاء نے بڑی تحسین کی۔ جماعت کی درسیات میں 'ہماری کتاب' حصہ پنجم میں اس طویل نظم کے چند بند شامل ہیں۔ ماسٹر منور علی صاحب کا کہنا ہے کہ مولانا شہباز صاحب کو اس فن میں بڑا ملکہ حاصل ہے۔

تصنیف و تالیف

استادگرامی ایک کامیاب مصنف ہوسکتے تھے لیکن مولانا نے تصنیف وتالیف کی طرف توجہ نہیں کی۔ اگر تصنیف کا میدان اپناتے تو زندہ و پائندہ نقوش چھوڑ کر جاتے۔ مولانا کو اللہ تعالیٰ نے کتابوں کی تصنیف نہیں بلکہ انسانوں کی تصنیف کے لیے پیدا فرمایا تھا۔ اس لیے انہوں نے اپنے لیے تصنیف رجال کو پسند کیا، کیونکہ تصنیف رجال، مردم گری اور مردم سازی کا کام وہ بنیادی اور ٹھوس کام ہے جس سے قومیں اوپر اٹھتی ہیں۔ پھر بھی ان کے ادبی اور اصلاحی ذوق کا اندازہ ان کے مضامین کے علاوہ ان مکاتیب سے بھی لگایا جاسکتا ہے جو برجستہ لکھے گئے ہیں۔ مکاتیب کے لیے 'ذکر شہباز' دیکھئے۔

مولانا نے نظمیں بھی کہی ہیں، مضامین بھی لکھے ہیں، جماعت اسلامی ہند کے ماہانہ ترجمان 'زندگی نو' کی ادارت بھی کی ہے، ان کے مضامین اور افسانے 'الحسنات' اور 'زندگی' اور اس دور کے بعض دوسرے رسالوں میں چھپتے رہے ہیں۔ حیدرآباد کے رسالہ 'انوار' میں بھی آپ کے مضامین اور افسانے چھپتے تھے۔ اس زمانہ میں آپ کے مضامین اور دوسری چیزیں 'ش' کے نام سے بھی چھپتی تھیں۔ ہندی کے مضامین جماعت کے ترجمان 'اجالا' کی زینت بنتے تھے۔ جماعت کی بعض کتابوں کے ترجمے بھی انہوں نے ہندی میں کیے ہیں لیکن یہ ساری چیزیں عام طور سے ان کی زندگی کے شروع دور سے تعلق رکھتی ہیں۔ میرے خیال سے لگتا ہے کہ آگے چل کر انہوں نے اپنے استاد مولانا اختر احسن اصلاحی کے کہنے پر ساری توجہ قرآن کریم کے غور وفکر میں لگادی۔ ذیل میں مولانا کی تحریروں کا اشاریہ لکھنا مناسب سمجھتے ہیں تا کہ اہل ذوق ان کی طرف رجوع کرسکیں۔

خودفراموشی خدا فراموشی کا ہولناک لازمہ، مسخ عذاب الٰہی کی بدترین شکل، کائنات تذکر وتفکر کا قدرتی سامان، اشارات، عرض تمنا، مرہم دل صد چاک پر، امت قرآن کی برکتوں سے محروم کیوں؟ زبان خلق کو نقارہ خدا سمجھو، دو برس کے بعد۔ انجمن طلبہ قدیم جامعۃ الفلاح کے نام پیغام، نیکی کے سپاہی (منظوم)، محمود کی تمنا (منظوم)، زادراہ (منظوم)، دعا (منظوم) ان مضامین کے لیے 'ذکر شہباز' دیکھئے۔

تنقید برائے اصلاح

تنقید مولانا کا خاص ذوق تھا۔ مزاج تنقید نگار تھا، ہر کلام اور ہر بات کو تنقیدی نگاہ سے دیکھتے تھے، کسی کی بات بغیر دلیل کے قبول نہ کرتے تھے، تنقید میں کبھی متضاد موقف اپناتے، مولانا طلبہ کو بحث کی مکمل آزادی دیتے اور پھر ان کے دلائل کا تجزیہ کرتے اور صحتمند تنقید کا سلیقہ سکھاتے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ مولانا طلبہ کی تربیت کرنا چاہتے تھے کہ بات کے تمام پہلوؤں سے واقف ہوں اور طلبہ مختلف موضوعات پر اچھی طرح تیار ہوں تاکہ عملی میدان میں اسلام کی ٹھوس خدمت کرسکیں۔

جماعت اسلامی ہند میں آپ کا مقام و مرتبہ

جماعت اسلامی سے آپ کا تعلق مدرسۃ الاصلاح میں داخلے سے متصل ہی ہوگیا تھا، مولانا اختر احسن اصلاحی کی صحبت نے اس میں پختگی اور توازن پیدا کیا اور مدرسۃ الاصلاح کے عہد طالب علمی ہی میں جماعت اسلامی کے رکن بن گئے۔ انہوں نے جماعت کی بہت خدمت کی۔ وہ جماعت کے لیے تقریریں کرتے اور مضامین لکھتے۔ وہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی سے کافی متاثر تھے۔ آپ اپنی ذہانت وصلاحیت کی بناپر جماعت کے مقامی امیر، کمشنری کے ناظم، مجلس نمائندگان اور حلقہ کی شوریٰ کے ممبر رہے ہیں۔ ایمرجنسی میں جیلوں کی ہوا بھی کھائی۔ جماعت کے اندر اکابر واصاغر سب سے عام طور سے خوشگوار تعلقات رہے۔ مرکز کے اکابرین نے ہمیشہ ان کی قدر کی، وہ بھی ان کی قدر کرتے تھے۔ جماعت اسلامی کے نظم سے آپ کا تعلق ۱۹۷۷ء تک قائم رہا۔ جماعت سے علاحدہ ندوہ کی تدریس کے دوران ہوئے لیکن علاحدہ ہونے کے بعد بھی جماعت کے لوگوں سے حسب سابق تعلقات قائم رہے۔

داعی اور مصلح

مولانا مودودیؒ کی کتابوں کے نتیجہ میں مولانا شہباز صاحب نے علم دین اور اصلاح و دعوت کے لیے اپنے آپ کو لگادیا تھا، ان کی زندگی کا نصب العین دین کی اقامت اور اس کا احیاء بن

چکا تھا۔ مدرسۃ الاصلاح میں زمانہ طالب علمی کے دوران ان کی کوششوں سے کتنے طلبہ کی زندگیاں سدھر گئیں اوران کی بری عادتیں چھوٹ گئیں۔ جماعت کی توسیع اور فروغ کی تاریخ جب لکھی جائے گی تو ان کو فراموش نہیں کیا جاسکے گا۔ آپ منصوبہ بند طریقہ سے گاؤں گاؤں پہنچتے، لوگوں سے ملاقاتیں کرتے، کتابیں دیتے، تقریریں کرتے، الجھنیں دور کرتے، اس طرح آپ جہاں رہے پورے علاقے میں زندگی کی ایک لہر دوڑادی تھی۔

دعوتی مواقع

مولانا شہباز صاحب اپنے گاؤں میں ہوں یا بھاگلپور میں یا جہاں کہیں بھی ہوں، وہ غیرمسلموں کے سامنے اسلام کا پیغام پیش کرنے کے مواقع نکالتے۔ غیرمسلم خود سے بھی آتے اور یہ ان کو بلاتے بھی، گفتگو ہوتی، تقریر ہوتی، اپنے غیرمسلم ساتھیوں کو خطوط بھی لکھتے۔

ایک قادیانی نے مولانا سے کہا 'ہر زندہ چیز مردہ چیز سے بہتر ہوتی ہے' یہ ایک مسلم اصول ہے۔ اس کی روشنی میں حضرت عیسیٰؑ، حضرت محمد ﷺ سے بہتر ہیں۔ اتفاق کی بات کہ مولانا شہباز صاحب کے سامنے وہیں ایک کتا سو رہا تھا مولانا نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ آپ کے اصول کے مطابق یہ کتا مرزا غلام احمد سے بہتر ہے، اس لیے کہ یہ زندہ ہے اور غلام احمد کا انتقال ہوچکا ہے۔

مولانا کی زندگی میں اس طرح کے بے شمار واقعات ہیں کہ آپ نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے لوگوں کو اسلام کی صحیح اور سچی دعوت دی۔

دعوتی حکمت عملی

مولانا شہباز صاحب نے ایک مرتبہ اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ اس ملک میں دعوت کے کام میں بڑی حکمت، احتیاط اور خاموش طریقہ سے کام کی ضرورت ہے، اشتہار اور اخباری رپورٹوں سے نقصان ہوتا ہے، بغداد میں تاتاریوں نے ظلم و بربریت کی جو داستان مرتب کی ہے وہ تاریخ کا ایک المناک باب ہے، ان تاتاریوں کے درمیان وہاں کے مسلمانوں نے کس خاموش طریقہ سے کام کیا ہے، یہ چیز غور وفکر کی متقاضی ہے۔

تبلیغی جماعت

مولانا کو تبلیغی جماعت سے باقاعدہ مناسبت نہیں تھی لیکن پھر بھی تبلیغی جماعت کی افادیت کے قائل تھے۔ طلبہ جماعت میں نکلتے تو خوشی کا اظہار کرتے، مولانا فرماتے کہ تبلیغی جماعت سے

رابطہ رکھو تاکہ غیر دینی ماحول کے مضر اثرات سے محفوظ رہو۔ مولانا فرماتے تبلیغی جماعت کا بھاگلپور میں ایک بڑا اجتماع تھا۔ اس موقع پر ایک متعصب ٹی سی افسر نے زبردست چیکنگ کی لیکن اس افسر کو اس وقت بڑی مایوسی ہوئی جب ایک شخص بھی بلاٹکٹ نہیں پکڑا گیا۔ مولانا فرماتے تھے کہ جب بحیثیت مجموعی ملت کی ایسی خوبیاں سامنے آئیں گی تو تعصب ونفرت کی دیواریں خودبخود منہدم ہوجائیں گی۔

تزکیۂ نفس

مولانا تہجد گزار اور اذکار کے پابند تھے۔ زہد وقناعت، جود وسخا، صلاح وتقویٰ کے اوصاف سے متصف تھے۔ اکثر صوفیائے متقدمین اوراہل دل بزرگوں کے واقعات مؤثر انداز سے سناتے تھے لیکن تصوف کی بدعتوں سے متنفر تھے۔ تصوف کے سارے مسائل کو قرآن وسنت کی روشنی میں جانچتے تھے۔ مولانا کا ایمان تھا کہ انسان روحانیت میں کتنی ترقی کیوں نہ کرجائے وہ خدا کی بندگی سے بے نیاز نہیں ہوسکتا۔ بلکہ انسان کی روحانی ترقی کو طاعات وعبادات میں اس کی ترقی سے جانچتے تھے۔

بیعت و ارشاد

مولانا کے یہاں تزکیۂ نفس اور اصلاح باطن کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس لیے آپ نے مرشد کی حیثیت سے سب سے پہلے شاہ وصی اللہ فتح پوری سے بیعت وارادت کا تعلق پیدا کیا، ان کے انتقال کے بعد آخر میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے حلقۂ بیعت میں شامل ہوگئے۔

تحریک آزادی

ہائی اسکول کی تعلیم کے دوران تحریک آزادی ہند شباب پر تھی۔ اس تحریک میں مولانا نے اہم کردار ادا کیا۔ اس کے ایسے دلدادہ ہوگئے کہ ہر وقت اسی کی پلاننگ اور منصوبہ بندی کرنے لگے۔ گاندھی جی اور دیگر تحریک کے افراد سے ملنا جلنا بڑھ گیا۔ اگر مولانا نے اپنی لائن تبدیل نہ کی ہوتی تو آزادی کے بعد آپ کا بھی ملکی سیاست میں ایک نمایاں مقام ہوتا۔

خدمت خلق

آپ عوام کے دکھ درد میں شریک ہوتے۔ بیواؤں اور یتیموں کی خبرگیری رکھتے، بیماروں کی دوا کا انتظام کرتے، مہمانوں کی ضیافت کرتے، مسافروں کے آرام کا خیال رکھتے، آپ ذمہ دار کی حیثیت سے بھی اپنے شعبے کے سارے کاموں میں دوسروں کے ساتھ شریک ہوتے۔ دوران امتحان ہال کی نگرانی کرنے والوں میں خود بھی ہوتے۔

مسائل کا حل

مولانا دوسروں کے مسائل حل کرنے میں دلچسپی لیتے، سفارش کرتے، حتی الوسع انجام دینے کی کوشش کرتے۔ اس ضمن میں مولانا کے سیکڑوں واقعات لکھے جاسکتے ہیں لیکن رسالہ کی ضخامت اس کی اجازت نہیں دے رہی ہے۔ بس مشتے نمونہ از خروارے دو واقعہ کے لکھنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھئے 'ذکر شہباز'۔

ماسٹر قمرالدین صاحب خنجر پور کا بیان ہے کہ خنجر پور کی مسجد میں ایک امام تھے۔ زبان ذرا موٹی تھی، اس لیے لوگ ان کو ہٹانا چاہتے تھے، مولانا نے سمجھایا کہ اس بنیاد پر ہٹانا مناسب نہیں۔ ظہر کی نماز سری ہوتی ہے اس میں وہ پڑھتے ہیں، نماز ہوتی ہے یا نہیں؟ یہاں تو لوگ آواز بھی سن رہے ہیں، نماز کیوں نہیں ہوگی۔ اس گفتگو کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج تک وہ اس مسجد کے امام ہیں۔

جامعۃ الفلاح کے قیام کے زمانہ میں ایک استاد کا مکان بن رہا تھا، ایک صاحب کی فصل کا مٹی کے لانے کی وجہ سے نقصان ہوگیا۔ جس کی بنا پر موجود طلبہ اور اساتذہ کی ناسمجھی سے کچھ کہا سنی ہوئی اور بات بڑھ گئی لیکن مولانا شہباز صاحب نے دو تین سر برآوردہ لوگوں سے بات کی اور دو منٹ کے اندر سارا معاملہ ختم ہوگیا۔

اوصاف حمیدہ

مولانا اخلاص وللّٰہیت کے پیکر تھے۔ اگر انھیں کسی سے اختلاف ہوتا تو خاموشی سے الگ ہوجاتے۔ اس کے خلاف محاذ قائم نہیں کرتے۔ ان کا یہ طریقہ نہیں تھا کہ ایک چیز پر اعتماد نہیں ہے پھر بھی اس سے چمٹے ہوئے ہیں۔ مولانا کی دوسری خوبی یہ تھی کہ بڑے جفاکش تھے، تعلیم کے دوران ان کا معمول تھا کہ صبح سے گھنٹی کے کچھ پہلے تک کھیت میں کام کرتے، گھنٹی سے ذرا پہلے دوڑتے ہوئے اسکول چلے جاتے۔ مولانا دوپہر کی چلچلاتی دھوپ میں پیدل کبھی کبھار چلتے اور سائل کے جواب پر فرماتے ہر طرح کے حالات کے لیے تیار رہنا چاہیے اور اپنے آپ کو جفاکش، محنت کا خوگر اور مشکلات برداشت کرنے کا عادی بنانا چاہیے۔ مولانا کی تیسری خوبی یہ تھی کہ وقت کے بڑے پابند تھے۔ کلاس بڑی پابندی سے لیتے، کبھی ناغہ نہ کرتے حتی کہ جس روز مولانا کے فرزند کا ولیمہ تھا اس روز بھی کلاس سے غیر حاضر نہ ہوئے۔ مولانا کی چوتھی خوبی یہ تھی کہ حالات کیسے بھی ہوں ان کو مایوسی نہیں ہوتی تھی۔ اسی تناظر میں وہ مدرسہ کے طلبہ سے کبھی مایوس نہیں ہوئے۔ فرماتے ہزاروں آدمیوں پر کام ہوتا ہے تب جاکر دو چار آدمی مطلوبہ معیار کے نکلتے ہیں۔ پھر ایسا بھی نہیں ہے کہ بقیہ لوگ بیکار

ہوجاتے ہیں۔ وہ بھی بڑے کام کے ہوتے ہیں۔ مولانا کی پانچویں خوبی یہ تھی کہ آپ نہایت ہی سادہ مزاج اور سادہ طبیعت کے انسان تھے۔ علم کا پہاڑ ہونے کے باوجود تواضع وانکساری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، مولانا کی چھٹی خوبی یہ ہے کہ آپ کی پوری زندگی تقویٰ، خشیت الٰہی، سنت پر عمل اور سنت سے محبت سے عبارت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ڈاکٹر نے آپریشن کے لیے کہا کہ ڈاڑھی منڈوانا ضروری ہے تو آپ نے نہیں منڈوایا اور فرمایا میں نے زندگی بھر ڈاڑھی رکھی۔ نہیں چاہتا کہ اس آپریشن کے دوران موت آجائے تو اپنے رب کے حضور بغیر داڑھی کے جاؤں۔ مولانا کی ساتویں خوبی یہ تھی کہ مخالف ماحول سے گھبرانے کے بجائے پوری استقامت کے ساتھ مردانہ وار اس کا مقابلہ کیا اور سنت یوسفی پر عمل کرتے ہوئے جیل بھی گئے۔ ان کے علاوہ بھی بے شمار خوبیوں کے آپ کے مالک تھے جن کا احاطہ کرنا اس مختصر تحریر میں ناممکن ہے۔

وفات

اس طریقہ سے انہوں نے اپنی زندگی علم کی خدمت اور دینی تعلیم وتربیت کے راستہ میں کامیاب طریقہ سے گذار دی اور اپنے تعلق والوں اور جاننے والوں میں بہت اچھی یادیں چھوڑ کر اس عالم سے عالم آخرت کو ۲؍رمضان المبارک ۱۴۲۳ھ کو منتقل ہوئے۔ انہوں نے زندگی کی ۷۷ بہاریں اور خزاں اس دنیا میں دیکھیں۔ اللہ تعالیٰ انھیں جنت الفردوس میں جگہ عنایت فرمائے۔ آمین ثم آمین

☆☆☆

قوموں کی ترقی کا راز:

قوموں کی ترقی کی اولین منزل نیک کرداری اور صلاحیت قوی ہے۔ ناتراشیدہ پتھروں سے دیوار چننا دشوار ہے جب تک ایک ایک پتھر کے تمام پہلو ہموار نہ کردئے جائیں تاکہ ایک پتھر دوسرے پتھر پر ٹھیک طور پر منطبق ہوجائے اسی طرح قومیت کی مثال ہے۔

(مولانا نجم الدین اصلاحیؒ)

مولانا شہباز اصلاحی اپنے خطوط کے آئینہ میں

دل کی تپش زندگی کو زندہ تر بناتی ہے

ادارہ☆

﴿بعض ذرائع سے مولانا شہباز اصلاحی مرحوم کے چند خطوط ہمیں دستیاب ہوئے ہیں جن کے کچھ حصے نذر قارئین کرتے ہوئے ہمیں مسرت ہو رہی ہے۔

پہلے خط میں مکتوب نگار نے مولانا مرحوم کے نام ایک خط میں کوئی ایسا شعر لکھ دیا تھا جس کا مفہوم یہ تھا کہ انسان کو جھیل کی طرح ٹھہرے رہنے کے بجائے دریا کی طرح رواں دواں ہونا چاہیے۔ اس کے جواب میں مولانا نے یہ تحریر سپرد قلم فرمائی تھی جس سے درس و تدریس سے ان کی وابستگی کے جذبے کو بھی سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اسی خط کے آخر میں مولانا مرحوم نے 'المرتضیٰ' سے متعلق بھی چند اعتراضات کا جواب تحریر فرمایا ہے۔ دوسرے خط میں ''قرآن پاک میں چڑیوں کا ذکر'' کے عنوان سے چند باتیں آگئی ہیں جن میں ''شہباز'' کا تذکرہ بھی ہے۔﴾

(۱)

برادر عزیز!

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ

پھر آپ نے جوابی لفافہ بھیج دیا، افسوس کہ میں اپنے احباب کے اندر اتنا اعتماد بھی نہ بحال کر سکا کہ ساٹھ نئے پیسے خرچ کر کے جواب لکھوں گا۔ برادرم! جھیل اور دریا کی تمثیل سے دل میں طرح طرح کے خیال آنے لگے۔ یہ خیال بھی آیا کہ شاعر کو جھیل کے پانی کا ٹھہراؤ ہی نظر آیا، کیسی کوتاہ نظری ہے، ہر دریا کسی نہ کسی جھیل ہی سے نکلا ہے۔ گنگا کیا ہے گنگوتری جھیل کا فیض دور تک پہنچانے کا ایک واسطہ۔ برہمپتر اور سندھ کس کو دور تک لے جاتی ہے۔ مانسرور کے پانی ہی کو تو آہ! دنیا میں گنگا، برہمپتر اور سندھ کی دھوم ہے لیکن گنگوتری اور مان سرور ہمالیہ کی بلندیوں میں روپوش ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے عورت کی عظمت کا راز فاش کرتے ہوئے کہا ہے ؎

مکالمات فلاطوں نہ لکھ سکی لیکن
اسی کے شعلہ سے ٹوٹا شرار افلاطوں

محراب و منبر کی اینٹوں پر سب کی نگاہ پڑتی ہے لیکن بنیاد کے اندر پوشیدہ پتھروں کو کوئی نہیں دیکھتا۔ زمزم ہی کو دیکھئے آپ کہتے ہیں ٹھہرا ہوا ہے، وہ کہاں نہیں پہنچتا؟ دنیا کا سب سے بڑا دریا می سیسی پی ہے لیکن ایک براعظم کے اندر محدود ہے۔ زمزم کی کوئی حد نہیں۔ ایشیا، یورپ، افریقہ، امریکہ، آسٹریلیا تمام جگہوں تک پہنچتا ہے۔ ہر دریا صرف نشیب کی طرف جاتا ہے لیکن زمزم نشیب و فراز سے بے پرواہ ہر مقام پر پہنچتا ہے۔ ہر دریا کسی بڑے دریا یا سمندر میں جا کر اپنا وجود گم کر دیتا ہے لیکن زمزم کبھی اپنی خودی پر آنچ نہیں آنے دیتا، شاعر کی نگاہ دوربیں ہوتی تو وہ ٹھہراؤ کی دوررسی کو دیکھ لیتا، شاعر کا کیا قصور! آج ساری دنیا دریاؤں کو دیکھتی ہے، جھیلوں کو اہل نظر ہی دیکھتے ہیں۔

برادرم! آپ کو زمزم اور جھیل کے ذکر سے اپنی محرومیاں یاد آگئیں۔ میں اسی ذکر سے آپ کو متوجہ کرتا ہوں کہ دریا نہ بن سکنے کا کیا غم، جھیل بن کر دریاؤں کو مالا مال کیجیے۔ کیا قلم و قرطاس ہی ایک ذریعہ ہے؟ کسی نے کہا تھا کہ ؎

در کنز و ہدایہ نتواں یافت خدارا
سیپارۂ دل بیں کہ کتابے بہ ازیں نیست

ترجمہ: کنز الدقائق اور ہدایہ میں خدا نہیں مل سکتا۔ دل کا سیپارہ دیکھو کہ اس سے اچھی کوئی کتاب نہیں۔

مولانا رومؒ نے فرمایا تھا ؎

صد کتاب و صد ورق در نار کن
سینہ را از نور حق گلنار کن

ترجمہ: سیکڑوں کتابوں اور سیکڑوں اوراق کو آگ میں ڈالو، سینہ کو حق کے نور سے روشن کرو۔

علامہ اقبالؒ نے کرم کتابی اور پروانہ کا مکالمہ نظم کیا ہے ؎

شنیدم شبے در کتب خانۂ ما
پروانہ می گفت کرم کتابی
بہ اوراق سینا نشیمن گرفتم
بسے دیدہ ام نسخہ فاریابی

نہ فہمیدہ ام حکمت زندگی را
ہماں تیرہ روزم ز بے آفتابی
چہ خوش گفت پروانۂ نیم سوزے
کہ ایں نکتہ را در کتابے نہ یابی
تپش می کند زندہ تر زندگی را
تپش می دہد بال و پر زندگی را

ترجمہ: میں نے سنا کہ ایک رات ہمارے کتب خانہ میں کرم کتابی پروانہ سے کہہ رہا تھا کہ میں نے بوعلی سینا کے اوراق میں نشیمن بنایا، فاریابی کے بہت سے نسخے چاٹ گیا لیکن زندگی کی حکمت اب تک نہیں سمجھ سکا، اب تک میرا دن بے آفتابی کی بنا پر تیرہ و تاریک ہے۔ ایک آدھ جلے پروانہ نے کیا عمدہ بات کہی کہ یہ نکتہ تم کسی کتاب میں نہ پاؤ گے، تپش زندگی کو زندہ تر بناتی ہے اور تپش زندگی کو بال و پر عطا کرتی ہے۔

برادرم! اللہ کا شکر ادا کیجیے کہ اس نے آپ کو دل کی تپش سے نوازا ہے، ورنہ کتنے ہیں جو بقول کسے ؎

وگرنہ پڑھنے کو سب خاص و عام پڑھتے ہیں
ہزاروں طوطے ہیں کلمہ کلام پڑھتے ہیں

کتاب خوانی کوئی بڑی چیز نہیں، علامہ اقبالؒ نے طالب علم کو خطاب کر کے کہا ہے ؎

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں
تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو
کتاب خواں ہے مگر صاحب کتاب نہیں

کون جانے اللہ تعالیٰ نے آپ کو کتاب سے فراغ بخش کر صاحب کتاب بنا دیا ہو۔

''المرتضیٰ'' کے تعلق سے یہ عرض کروں گا کہ اس کی تہہ کو پہنچنا سطح بینوں کا کام نہیں۔

جو لوگ عام سیرتوں اور تاریخوں کے مطالعہ کے عادی ہیں انھیں حضرت مولانا علی میاں کی کتابوں میں لطف نہیں آئے گا، لوگوں نے سیرت کا مقصود سمجھنے میں سخت ٹھوکر کھائی ہے اور واقعات و حوادث کے تجزیہ میں بڑی کم فہمی کا ثبوت دیا ہے، مہاتما گاندھی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ایک شخص خاص طرح

کے حالات میں ایک رویہ اختیار کرتا ہے، بعد کو کوئی تبصرہ نگار اس کے رویہ کے مناسب و نامناسب ہونے پر تبصرہ کرتا ہے حالانکہ وہ ان حالات کی سنگینی اور نزاکت کا پورا احاطہ نہیں کرسکتا، اس طرح ناکافی معلومات کی بنا پر کیا ہوا تبصرہ بالکل ناقص ہوتا ہے۔ حضرت مولانا، مشاجرات صحابہ کے بال سے باریک اور تلوار سے تیز پل صراط سے جس احتیاط اور مہارت کے ساتھ پار ہوئے ہیں وہ ان کی سلامتی طبع، پختگی فکر، مطالعہ کی گہرائی اور حسن انتخاب اور سب سے زیادہ تائید ربانی پر دلالت کرتا ہے۔ سارے صحابہ عادل ہیں اور سارے صحابہ نجوم ہدایت ہیں، حضرت مولانا نے ''المرتضیٰ'' میں نہایت خوبی کے ساتھ تاریخی شواہد سے ثابت کیا ہے کہ تمام خلفائے راشدین نے اور حضرات حسنین نے اور سارے صحابہ کرام نے حسب موقع برمحل اور درست اقدام کیے۔ جو کچھ فرق نظر آتا ہے وہ احوال وظروف کا فرق ہے، لوگوں کو نہیں معلوم کہ ایسے مواقع بھی آتے ہیں جہاں حالات کے تقاضے کے طور پر غلط فیصلہ کرنا ہی صحیح رویہ ہوتا ہے۔ آنحضورﷺ نے خود فرمایا ہے کہ دو آدمی میرے سامنے مقدمہ لاتے ہیں، ایک زبان آور ہوتا ہے اپنا کیس اس صفائی سے رکھتا ہے کہ میں اس کے حق میں فیصلہ کر دیتا ہوں لیکن وہ فیصلہ حقیقت کے مطابق نہیں ہوتا، فیصلہ کرنے والا اپنی معلومات اور اپنے احساسات و تاثرات کے مطابق دیانت داری کے ساتھ ایک فیصلہ کرتا ہے اور اس لحاظ سے وہ بالکل صحیح فیصلہ کرتا ہے لیکن حقیقت نفس الامری کے لحاظ سے وہ فیصلہ صحیح نہیں ہوتا۔ اس سے قاضی پر کوئی حرف نہیں آتا۔ جن حالات میں جو کام حضرت عثمان نے کیے ہم کیسے کہہ سکتے ہیں کہ بعینہٖ انھیں حالات میں حضرات شیخین وہی کام نہیں کرتے۔ حضرت حسن نے جن حالات میں خلافت سے دست برداری اختیار کی، کیا وہی حالات وظروف حضرت حسین کے سامنے کربلا میں تھے؟ جب احوال وظروف میں فرق تھا تو رویہ میں فرق کیوں نہ ہوتا۔ حضرت مولانا شاید تاریخ اسلامی کے پہلے مورخ ہیں جنھوں نے یہ نکتہ سمجھا ہے اور اسے نہایت وضاحت اور خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

(۲)

دوسرے خط میں آپ نے یہ پوچھا ہے کہ قرآن پاک میں کن کن چڑیوں کا ذکر ہے۔
عرض ہے کہ قرآن میں ہابیل قابیل کے واقعہ کے ضمن میں غراب (کوا) کا ذکر ہے اور حضرت سلیمان کے ذکر میں 'ہدہد' کا ذکر ہے۔ اس کے علاوہ بہت سی جگہوں پر مطلق چڑیوں کا ذکر ہے۔ شاہین کا ذکر قرآن پاک میں نہیں ہے۔ عربی شاعری میں عقاب وغیرہ کا ذکر آتا ہے، فارسی شاعری میں شہباز و شاہین کا ذکر زیادہ ہے۔ شہباز کا استعارہ اچھے حوصلہ مند مومن کے لیے بعض صوفیاء کے

یہاں نظر سے گزر رہا ہے۔ مشہور ہے کہ جب مخدوم الملک حضرت شرف الدین یحییٰ منیریؒ ابتدا میں حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے یہاں حاضر ہوئے تو انھوں نے فرمایا ''شہباز بست و لے نصیب ما نیست'' ...... ہے تو شہباز لیکن میرے نصیب کا نہیں ہے۔ پتہ نہیں علامہ اقبال کا خیال ادھر کیوں کر گیا۔ ان کی اپنی ذہنی رسائی بھی ہوسکتی ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ مغربی ادب میں کہیں سے اشارہ ملا ہو۔ جو بھی ہو اقبال نے اس کو وہ عظمت اور ندرت بخشی ہے کہ شاہین ان کا امتیاز ہوگیا ہے۔
(بشکریہ تعمیر حیات ۲۵/دسمبر ۲۰۰۲ء)

(۳)

ندوہ ۶/ربیع الثانی ۱۴۰۰ھ

عزیزم سلمہ! سلام مسنون

بہت دن ہوئے ایک شعر پڑھا تھا ؎

نہ جانے کس لیے امیدوار بیٹھا ہوں
اک ایسی راہ پہ جو تیری رہ گذر بھی نہیں

اس کا مطلب سمجھ میں آیا جب اس سال شوال میں بلریا گنج گیا۔ بلاوجہ بار بار خیال آتا تھا کہ تم سے ملاقات ہوجاتی حالانکہ کوئی تک نہیں تھا۔ عید کے دوسرے دن تمہارے بلریا گنج آنے کا کیا امکان تھا۔ تم سے کوئی خط و کتابت نہیں ہوسکی لیکن تمہاری یاد برابر آتی ہے۔ مدینہ کے طلبہ سے ملاقات ہوتی ہے تو تمہارے بارے میں بھی پوچھتا ہوں۔ اس وقت تم مخاطب ہو اور یہ بات ذہن میں ہے کہ سلامت اللہ صاحب، ظفر، رحمت، رضوان سب وہاں ہو۔ اس جگہ ہو جہاں کے لیے ہر مسلمان کی روح تڑپتی ہے اور کبھی ؎

دکھادے یا الٰہی وہ مدینہ کیسی بستی ہے
جہاں پر رات دن مولا تری رحمت برستی ہے

کہہ کر اور کبھی ؎ میرے مولا بلالو مدینہ مجھے گنگنا کر اپنی مضطرب روح کو تسکین دیتا ہے۔ ہاں تو تم سب لوگ اس جگہ ہو جہاں واقعی روضۃ من ریاض الجنۃ ہے اور میں بالکل ایک اجنبی اور نامانوس ماحول میں پچھلی یادوں کے سہارے جی رہا ہوں۔ اس وقت مجھے یاد آرہا ہے کہ چتر پور میں کھلونا وغیرہ کسی رسالہ کی نظم تم بہت بہت مست ہو کر پڑھتے تھے۔ یاد نہیں کیا کیا تھا صرف اتنا یاد ہے ؎

اے پاس ہونے والے! ہم کو بھی ساتھ لے لے

ہم رہ گئے - اکیلے

پتہ نہیں تمھیں یاد ہے یا نہیں۔ مجھے خوب یاد ہے اور اس وقت جی چاہتا ہے کہ میں بھی خوب زور زور سے گاؤں، اتنے زور سے کہ تم بھی سن لو!

یثرب کو جانے والے! ہم کو بھی ساتھ لے لے
ہم رہ گئے - اکیلے

لیکن میرے مقدر میں شاید تمنائیں ہی تمنائیں ہیں اور بقول کسی شاعر کے ؎

یہ آرزو بھی بڑی چیز ہے مگر اے دوست
وصال یار فقط آرزو کی بات نہیں

بس یہ درخواست ہے کہ میرے لیے کبھی کبھی دعا کرنا کہ اللہ تعالیٰ اپنی محبت سے نوازے۔ دنیا و آخرت کی سرخروئی نصیب فرمائے۔ تمام احباب کو سلام کہنا۔

والسلام

شہباز

(۴)

ندوۃ العلماء، لکھنؤ

۶/رجب ۱۴۰۰ھ

عزیزم سلمہ! رزقک اللہ علما نافعا و عملا صالحا

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

تمہارا ایک خط میرے خط کے جواب میں عرصہ ہوا ملا تھا۔ خط میں نے سرہانے رکھ لیا تھا کہ جواب فوراً دوں گا لیکن اصل سبب تو اپنی کاہلی تھی اور اس کے لیے بہانہ گھر کے مختلف افراد کا یکے بعد دیگرے بیمار ہوتے رہنا ہوگیا اور جواب ٹلتا رہا۔ یہاں تک کہ تمہارا دوسرا خط آگیا۔ بڑی شرمندگی ہوئی اور جواب لکھنے بیٹھ گیا۔ تمہارے خط سے جس محبت اور تعلق کا احساس ہوا اس نے مجھے مایوسی کے اندھیروں سے نکال لیا۔ میں تو بالکل اپنے آپ سے مایوس ہوگیا تھا، تم نے لکھا ہے کہ میرے پاس روزانہ بہت سے خط آتے ہوں گے۔ نہیں عزیزم! مجھے کون خط لکھتا ہے۔ اس معاملہ میں بدقسمت ہی کہلائے جانے کا مستحق ہوں اور اس میں میرے احباب اور شاگردوں کا کوئی قصور نہیں۔ عام میری نالائقی، سستی اور کاہلی کو دخل ہے۔ بہت دنوں تک شاگردوں نے اور احباب نے

خطوط لکھے لیکن ادھر سے کاہلی اور سستی کا مظاہرہ ہوا۔ تنگ آکر سب نے خط لکھنا چھوڑ دیا۔ جب دیکھتا ہوں کہ لوگوں کے پاس اہل تعلق کے خطوط آتے ہیں تو رشک آتا ہے۔ لیکن اب خطوط نہیں آتے۔ اس وجہ سے میں بالکل مایوس ہوگیا تھا کہ مجھے اب کوئی خط نہیں لکھے گا لیکن تمہارا خط اور میری کاہلی کے باوجود دوسرا خط پاکر مایوسی دور ہوئی۔ اللہ تعالیٰ تمہیں جزائے خیر دے۔ علم وعمل میں برکت دے۔ اپنے حبیب کے شہر کی قدر ومنزلت کی کما حقہ نصیب فرمائے۔ جوارِ نبی کی نورانیت سے بہرہ مند فرمائے۔ ہے! ہے! تمہارا مقدر! اور تمہارے جیسے اور دوسرے لوگوں کا مقدر، مولانا سلامت اللہ کا مقدر کہاں پہونچا دیا تمہارے مقدر نے تمہیں۔ مدینہ کی گلیاں، مسجد نبوی اور ریاض الجنۃ کی نمازیں، آستانہ نبوت کی سلامیاں، عزت بخاری ایک فارسی شاعر گزرے ہیں۔ ان کا ایک شعر ہے۔

ادب گاہیست زیرِ آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید ایں جا

ترجمہ: آسمان کے نیچے ایک ادب کی جگہ ہے جو عرش سے بھی زیادہ نازک ہے۔ یہ ایسی جگہ ہے کہ جہاں جنید وبایزید جیسے لوگ بھی دم بخود ہوتے ہیں۔

عزیزو! اپنے مقدر پر جتنا بھی ناز کرو کم ہے۔ اللہ تعالیٰ کا جتنا بھی شکر کرو کم ہے، اس دنیا میں لاکھوں اور کروڑوں مسلمان ہیں اور تھے جو اس مقام کی ایک جھلک دیکھنے کو ترستے رہ گئے۔ اللہ نے تمہیں وہاں پہنچا دیا۔ قدر کرو اس عزت افزائی اور کرم فرمائی کی۔ اس تصور سے کہ تم وہاں ہو اور میں تم سے مخاطب ہوں میں اپنے آپ کو کمتر محسوس کر رہا ہوں۔

میرے لیے دعا کرو۔ اپنے اس نالائق اور نامراد استاذ کے لیے دعا کرو۔ شاید تمہاری دعا کی برکت سے میرا کچھ بھلا ہو جائے۔ شاید تمہاری سفارش سے میرا بھی بلاوا آجائے۔ اس وقت جی چاہتا ہے کہ اپنی بکواس چھوڑ کر تمہیں حفیظ جالندھری کی ایک نظم سناؤں جو انھوں نے مدینہ کو جانے والے ایک دوست کو مخاطب کر کے لکھی ہے۔

عزیزم! معاف کرنا، مدینہ کا تصور آتا ہے تو دل قابو میں نہیں رہتا، قلم سے کیا کچھ نکلنے لگتا ہے، کاش یہ محض دماغی خیال آرائی نہ ہوتی بلکہ دل کا حال ہوتا۔

میں اچھا ہوں، بال بچوں کے ساتھ ندوہ میں رہتا ہوں۔ کب تک رہوں گا کون کہہ سکتا

ہے۔ جب الاصلاح چھوٹ گیا، چتر پور چھوٹ گیا۔ جامعۃ الفلاح چھوٹ گیا تو کسی بھی جگہ کو کیا کہا جا سکتا ہے۔ تمہاری چھٹی پہلی شعبان سے ہوری ہے، خدا کرے ملاقات کا کوئی موقع نکل آئے۔

مولانا سلامت اللہ صاحب کو میرا سلام پہنچا دو اور دوسرے جو جاننے والے احباب ہیں سب کو۔ عزیزم راشد سلمہ کو بھی۔ تمہارے دوسرے خط کی پشت پر سلام درج تھا۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے۔ دعا کی درخواست ہے۔

ندوہ میں بھی طلبہ زور وشور سے امتحان کی تیاریوں میں مشغول ہیں، غالباً شعبان کے نصف اول میں امتحان ہوں گے۔ ابھی قطعی طور پر تو نہیں کہا جا سکتا لیکن توقع ہے کہ ۱۵؍شعبان یا دو چار دن بعد چھٹی ہو جائے گی۔ بلریا گنج وغیرہ کی خبریں تو شاید مجھ سے زیادہ وہاں ملتی رہتی ہوں گی۔

تمہارے والد والدہ وغیرہ پتہ نہیں اس وقت کہاں ہیں اور تمہارا بھائی (اسدالاسلام) کہاں ہے؟ کیا کر رہا ہے؟

پھر آخر میں عرض ہے کہ میرے لیے دعا کرنا اور دوسرے احباب کو بھی سلام پہنچا کر ان سے دعا کی درخواست کر دینا۔

والسلام
شہباز

☆☆☆

حسن البناء شہید کی وصیت

أقيموا دولة الاسلام على قلوبكم تقم على أرضكم

اسلام کی حکومت اپنے دلوں پر قائم کرو تو خود بخود تمہاری زمین پر اس کی حکومت قائم ہو جائے گی۔

پیغام

(انجمن طلبۂ قدیم جامعۃ الفلاح کے ایک اجلاس عام کے موقع پر دعوت نامہ کے جواب میں)

عزیزان گرامی!

دلی خواہش تھی کہ آپ کے اجتماع میں شریک ہوکر آپ کی سرگرمیاں آنکھوں سے دیکھتا اور عرصۂ دراز کے بعد سب سے ملتا لیکن حالات کچھ ایسے ہیں کہ یہ خواہش پوری نہ ہوسکی۔ آپ جانتے ہیں کہ میں بیمار ہوں۔ ابھی تک دواؤں کا سلسلہ جاری ہے، بہت سی پابندیاں ہیں جن کو سفر میں برقرار رکھنا دشوار ہے۔ اس لیے تحریری طور پر نصف ملاقات ہی کو غنیمت سمجھتا ہوں۔ آپ تمام حضرات میرا بہت بہت سلام قبول فرمائیں اور جو نہیں آسکے ہیں ان کو بھی جہاں تک ممکن ہو پہنچادیں اور دعا کریں کہ زندگی کے جو دن باقی رہ گئے ہیں وہ بعافیت گزر جائیں اور اللہ تعالیٰ اپنے یہاں ستاری وغفاری کا معاملہ فرمائے۔

میں آپ سب سے بہت دور ہوں لیکن آنے جانے والوں اور 'حیات نو' کے ذریعہ آپ کی سرگرمیوں کی اطلاع ملتی رہتی ہے۔ یوں تو کم وبیش سبھی مدرسوں میں طلبہ قدیم کی انجمنیں قائم ہیں لیکن بیشتر بس نام کی ہیں، مدرسہ کے کسی بڑے جلسہ کے وقت آنے والے طلبہ مل بیٹھتے ہیں اور پھر اپنے اپنے مقام پر چلے جاتے ہیں۔ کوئی مستقل پروگرام نہیں چلتا لیکن الحمدللہ آپ کے یہاں ایسا نہیں ہے۔ میری معلومات کی حدتک آپ کی انجمن طلبہ قدیم شاید واحد انجمن ہے جو مستقل پروگرام رکھتی ہے، مادر علمی سے قلبی تعلق رکھتی ہے۔ وہاں کے ذمہ داروں کے خلاف محاذ بنانے کے بجائے تعاون کرتی ہے، اپنے پیش رو اور پس رو ساتھیوں کی خبرگیری کرتی اور ممکن تعاون کرتی ہے۔ یہ میرے ہی لیے نہیں، ہر اس شخص کے لیے جو جامعہ سے قلبی لگاؤ رکھتا ہے انتہائی خوشی کی بات ہے۔ آپ کی انجمن ایک فعال، متحرک اور سرگرم انجمن ہے۔ میں آپ کو کیا پیغام دوں۔ میں خود آپ کی سرگرمیوں سے اپنے دل کی بجھتی ہوئی حرارت کو بچانے میں مدد لیتا ہوں۔ بس علامہ شبلی کی زبان میں

اتنا کہہ سکتا ہوں۔

کیے تھے ہم نے بھی کچھ کام جو کچھ ہم سے بن آئے
یہ قصہ جب کا ہے، باقی تھا جب عہد شباب اپنا
اور اب تو سچ ہے یہ، جو کچھ امیدیں ہیں وہ تم سے ہیں
جواں ہو تم، لب بام آچکا ہے آفتاب اپنا

اللہ تعالیٰ آپ سب کو اس لائق بنائے کہ میری اور میرے جیسے بہت سے لوگوں کی امیدیں جو آپ سے وابستہ ہیں وہ پوری ہوں، آپ سب کے سب علم وعمل اور اخلاق وشرافت کے افق پر آفتاب وماہتاب بن کر روشن ہوں۔ جامعۃ الفلاح ہی نہیں پوری ملت کی کشتی کو آپ بھنور سے نکالنے میں پورے طور پر مددگار ثابت ہوں اور اپنے آقا ومولیٰ کے حضور میں بامراد اور سرخرو قرار پائیں۔

ربنا تقبل منا انك انت السميع العليم

والسلام عليكم ورحمة الله وبركاته

دعاگو

شہباز

استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

☆☆☆

صالحین کے تذکرہ حسن اور 'لسان صدق' کی جو بنیاد حق تعالیٰ نے رکھی، امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے علماء نے اس بنیاد پر تذکروں اور سوانح عمریوں کی بڑی بڑی عمارتیں کھڑی کردی ہیں۔ اس طرح ان کے ذکر خیر کا غیر منقطع اور استعداد کا محکم سلسلہ قائم ہوگیا۔ تاریخ بغداد، اختصار تاریخ بغداد، تاریخ دمشق، تاریخ مکہ، تاریخ مدینہ، تاریخ اصفہان، تاریخ قاہرہ، علماء، فقہاء، محدثین اور نحویوں وغیرہ کے احوال وکوائف پر مشتمل طبقات کی کتابوں کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے جو امت کے لیے باعث سعادت بھی ہے۔

مولانا ابوبکر اصلاحی

اقرار علی اصلاحی☆

نام و سلسلہ نسب

ابوبکر بن ذاکر علی بن وزیر علی بن جعفر علی۔ آپ خاندانی خان ہیں۔ کہتے ہیں کہ بہت پہلے آپ کے آباء واجداد موضع پاکر پور ضلع فیض آباد سے موضع بینا پارہ ضلع اعظم گڑھ آکر کے آباد ہوئے تھے۔ آپ کی والدہ ماجدہ کا نام کلثوم تھا۔ آپ کی ولادت ۳؍جولائی ۱۹۲۲ء کو اپنے وطن بینا پارہ اعظم گڑھ میں ہوئی۔ آپ کی ابتدائی تعلیم گاؤں کے مکتب اسلامیہ میں ہوئی اس کے بعد مدرسۃ الاصلاح سرائے میر میں داخل ہوئے جو اس موضع سے کم وبیش ۲ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ آپ نے فضیلت تک تعلیم مکمل کی اور ۱۹۴۲ء میں فراغت حاصل کی۔ آپ کے اساتذہ کرام میں مولانا امین احسن اصلاحی، مولانا اختر احسن اصلاحی، مولانا شبلی متکلم ندوی، مولانا عبدالصمد ندوی، مولانا سعید احمد ندوی، مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی، مولانا داود اکبر اصلاحیؒ بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ دورطالب علمی ہی میں آپ کا نکاح منگراواں اعظم گڑھ کی شریف زادی محترمہ نجمہ خاتون سے ہوا تھا جن کا انتقال ۱۷؍نومبر ۱۹۷۳ء میں ہوا۔ محترمہ انتہائی پاک طینت اور صالح طبیعت کی تھیں۔

آپ کی زندگی سراپا تحریک تھی، یہی وجہ ہے کہ فراغت کے بعد ہی آپ مختلف علمی وتحریکی کاموں میں مشغول ہوگئے۔ ہندو پاک کی تقسیم سے بہت پہلے جماعت اسلامی میں شامل ہوگئے۔ تدریس آپ کا مشغلہ تھا لیکن اس سے جتنا وقت بچتا سب تحریکی سرگرمیوں میں لگاتے۔ آپ کام انتہائی منصوبہ بند طریقے سے کرنے کے عادی تھے۔ آپ مسلم پرسنل لاء بورڈ کے تاسیسی ممبر تھے، آپ کا اصل مشغلہ درس وتدریس اور تعلیم وتربیت ہی تھا۔

آپ جامعۃ الفلاح کے تاسیسی ممبران میں سے ہیں اس کے خاکہ کی تشکیل، دستور کی

☆استاذ جامعۃ الفلاح

تدوین، اساتذہ کی فراہمی، تعارف کی مہم اور تعمیر وترقی وغیرہ میں آپ کا اہم رول رہا ہے حتی کہ 'جامعۃ الفلاح' جیسا خوبصورت نام آپ کا ہی تجویز کردہ ہے۔ یہی نہیں بلکہ جامعہ کے تعارف کے لیے پورے ملک میں مخصوص حضرات کو خطوط لکھے۔ مقامی حضرات نے بھرپور تعاون دیا۔ حسن البناء منزل جو سب سے قدیم دارالاقامہ ہے وہ آپ ہی کے دور نظامت میں تعمیر ہوا۔

تحریر و تصنیف

یوں تو آپ کی کوئی مستقل مطبوعہ تصنیف نہیں ہے لیکن مطبوعہ مضامین اچھے خاصے ہیں۔ اخیر عمر میں ''فکر آخرت'' کے نام سے آپ نے ایک کتاب تیار کی تھی جس کی طباعت کا سہرا ڈاکٹر سکندر علی اصلاحی جنھوں نے ادارہ تذکیر القرآن سرائے میر سے شائع کیا۔ مزید آپ کے بقیہ مضامین کو از سر نو مرتب کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ آپ کے مقالات (۱) اتباع سنت کی حقیقت وہمہ گیری (۲) توشۂ آخرت بھی ادارہ تذکیر القرآن سے شائع ہوئے۔

خطابت

آپ ایک اچھے خطیب بھی تھے، اس طرح بہترین انداز سے سمجھاتے اور دلائل دیتے کہ مخاطب قائل ہوئے بغیر نہیں رہتا۔

حلم و بردباری

آپ کے اندر علم و بردباری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، نہ کسی سے الجھتے اور نہ حد سے زیادہ غصہ کرتے اور اگر کبھی کسی سے کوئی تکلیف بھی پہنچ جاتی تو اس کا احساس بھی نہ ہونے دیتے۔ بہت سنگین مسئلہ بھی آپ کو درپیش ہوتا پھر بھی بڑے اطمینان وسکون کی حالت میں دکھائی دیتے۔

نفاست

اس معاملہ میں آپ نے اعلیٰ ذوق پایا تھا۔ لباس بھی بہترین استعمال کرتے، رکھ رکھاؤ میں اپنی مثال آپ تھے، الغرض آپ بڑے ہی نفیس واقع ہوئے تھے۔

کفایت شعاری

جتنی آمدنی ہوتی اسی میں اپنا خرچ چلانے کی کوشش کرتے، چنانچہ جماعتی زندگی میں بھی کفاف پر گذارا کیا اور مدرسہ کی زندگی میں بھی کفاف سے زیادہ شاید ہی کبھی ملا ہو پھر بھی آپ نے اطمینان وسکون کی زندگی گذاری۔

کفالت

جوغریب طلبہ اور رشتے دار تھے ان کی آپ کفالت بھی فرماتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ تادمِ مرگ یہ سلسلہ جاری تھا۔ کمال یہ کہ کسی کو جلدی پتہ بھی نہیں چلنے دیتے تھے۔ جسے بھی حاجت مند محسوس کرتے اس کی تکمیل کی فکر میں خاموشی سے لگ جاتے۔ اساتذہ وطلبہ کسی کو کبھی قرض کی ضرورت ہوتی تو وہ آپ کے پاس پہنچ جاتے۔

رواداری

دوست و دشمن ہر ایک سے رابطہ رکھتے اور ہر ایک کا خیال کرتے، جبکہ انتہا پسندی سے کوسوں دور تھے۔ اگرچہ ذاتی زندگی میں حنفی مسلک پر زیادہ عمل پیرا تھے لیکن مختلف فیہ مسائل میں عموماً اعتدال وتوازن کی راہ اپناتے۔

حلیہ

قد لمبا، رنگ گندمی، وضع قطع عالمانہ، ڈیل ڈول درمیانہ، شکل وصورت سے نورانیت ٹپکتی محسوس ہوتی۔

اولادیں

تین بچے اور ایک بچی۔ (۱) ڈاکٹر ابوالخیر صاحب جو بیناپارہ طبیہ کالج میں لکچرر تھے اور پریکٹس بھی کی۔ (۲) جناب ابوالویس صاحب جو تجارت کرتے ہیں اور علاقے کے اچھے تاجر سمجھے جاتے ہیں۔ (۳) جناب ابوالفیض صاحب یہ بھی تجارت کرتے ہیں۔ (۴) بچی کا نام فاخرہ خانم ہے۔ الحمدللہ سبھی خوش وخرم اور کثیر العیال ہی ہیں۔

ذوق

فن تعمیر سے آپ کو خصوصی دلچسپی تھی، جہاں بھی تاریخی مقامات دیکھنے جاتے ایک ایک چیز باریکی سے دیکھتے اور اس کا ریکارڈ رکھتے، اکثر سنایا بھی کرتے، مختلف فن تعمیرات کے فنی محاسن کے فرق کا بھی بڑی اچھی طرح تجزیہ کرتے تھے۔

آخری لمحات

آپ کی بائیں آنکھ تو بہت پہلے ہی ضائع ہو چکی تھی مگر کچھ سالوں سے دائیں آنکھ 'سمل بائی' نامی مرض کا شکار ہوگئی تھی، مختلف دواؤں اور تدابیر کے ذریعہ آپ کام چلا رہے تھے لیکن کچھ دنوں سے آپ محسوس کررہے تھے کہ روشنی دن بدن کم ہوتی جارہی ہے اور اسی دوران چہرے پر فالج کا ہلکا حملہ بھی ہوگیا، انگریزی دوا راس نہ آئی۔ اور سبھی کو سوگوار چھوڑ کر ۳رمئی ۱۹۹۸ء کو داعی اجل کو لبیک کہا

اناللہ وانا الیہ راجعون۔

تدفین

۴رمئی ۱۹۹۸ء کو بعد نماز ظہر بیت العلوم سرائے میر کے احاطہ میں نماز جنازہ ہوئی۔ مولانا نظام الدین صاحب اصلاحی نے نماز جنازہ پڑھائی۔ لوگوں کا کافی ہجوم تھا اور لوگوں نے آپ کا آخری دیدار کیا۔ آپ سرائے میر کے قبرستان میں سپرد خاک کیے گئے۔

اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت نصیب فرمائے اور اہل خانہ کو صبر کی دولت سے نوازے۔

سورج تھا زندگی کی رمق چھوڑ کے گیا
وہ ڈوب بھی گیا تو شفق چھوڑ کے گیا

☆☆☆

شہر اعظم گڑھ کی تاسیس

راجہ اعظم خاں بن راجہ بکرماجیت (مینہہ نگر) نے ۱۰۷۶ھ (۱۶۶۵ء) میں اس شہر کی بنیاد رکھی اور ایک زمانہ تک یہ علاقہ، اعظم خاں کی نسل وذریت کے زیر اقتدار رہا۔ بعد میں ان کو نوابان اودھ سے نبرد آزما ہونا پڑا اور نوابی اودھ نے اعظم گڑھ کو چکلہ قرار دے کر یہاں اپنا حاکم رکھا۔ ۱۸۰۱ء کو نواب سعادت علی خاں اور برطانوی گورنر جنرل لارڈ ولزلی کے مابین ایک معاہدہ ہوا جس کی رو سے اعظم گڑھ مع اپنے پرگنہ جات کے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ضلع گورکھپور میں شامل کردیا گیا اور ۱۸۲۰ء میں اس کا مغربی حصہ جونپور میں اور مشرقی حصہ غازی پور میں چلا گیا۔ اس کے بعد ۱۸ردسمبر ۱۸۳۲ء میں اعظم گڑھ مستقل ضلع قرار پایا۔ (قاضی اطہر مبارکپوری)

مولانا ابوبکر اصلاحی مرحوم

نظام الدین اصلاحی ☆

مولانا مرحوم کی پیدائش اعظم گڑھ ضلع کے ایک گاؤں بیناپارہ میں ۱۹۲۲ء میں ہوئی، آپ کی ابتدائی تعلیم گاؤں ہی میں ہوئی، اس کے بعد مدرسۃ الاصلاح میں داخل ہوئے جو ان کے گاؤں سے کم وبیش ۲ میل کے فاصلے پر واقع ہے، مولانا کے اساتذہ میں مولانا امین احسن اصلاحیؒ، مولانا اختر احسن اصلاحیؒ، مولانا شبلی متکلم ندویؒ، مولانا عبدالصمد ندویؒ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

فراغت کے بعد مرحوم مختلف علمی کاموں میں مصروف رہے، تقسیم ہند سے بہت پہلے جماعت اسلامی میں شامل ہوگئے تھے، ۱۹۴۶ء میں پہلی مرتبہ مدرسۃ الاصلاح میں بغرض مدرس بلائے گئے، یہ وقت وہ تھا جب مدرسۃ الاصلاح کے کہنہ مشق اور سینئر اساتذہ بیک وقت علاحدہ کردئے گئے اور اس فیصلہ سے متاثر ہوکر مولانا شبلی متکلم مرحوم بھی مدرسہ سے مستعفی ہوگئے کیونکہ مذکورہ اساتذہ مولانا شبلی متکلم صاحب کے خاص رفقاء کار تھے اور مولانا ہی اس وقت مدرسہ کے مہتمم تھے، ان کو اعتماد میں لیے بغیر جب ان کے رفقاء کار کو علاحدہ کردیا گیا تو وہ خود بھی احتجاجاً مستعفی ہوگئے، اس طرح یک بہ یک اونچے اساتذہ کی جگہیں خالی ہوگئیں، مدرسہ کے ناظم مولانا بدرالدین صاحب اصلاحی نے مولانا مودودیؒ سے درخواست کی کہ وہ مدرسہ کے لیے افراد فراہم کریں، چنانچہ باہمی بات چیت سے جن لوگوں کو مولانا مودودیؒ نے مدرسۃ الاصلاح میں بھیجا وہ ہیں مولانا ابواللیث صاحب آکولہ سے مولانا صدرالدین پٹھان کوٹ سے، مولانا جلیل احسن صاحب بریلی سے اور مولانا ابوبکر صاحب بستی سے ان لوگوں نے مدرسہ کو سنبھالا مولانا اختر احسن صاحب مرحوم نے بہت کوشش کی کہ مولانا ابواللیث صاحب مدرسہ کی صدارت قبول کرلیں لیکن مولانا تیار نہ ہوئے، چنانچہ مولانا اختر احسن صاحب صدر بنادئے گئے۔ مولانا ابوبکر صاحب مرحوم سالوں مدرسہ پر تدریسی خدمات انجام دیتے رہے کچھ دنوں صدر بھی رہے، ساتھ ہی جماعت اسلامی نے مولانا کو اعزازی ناظم ضلع بھی بنادیا تھا اور راقم الحروف کو ان کا معاون بنایا گیا بعد میں جماعت کے مطالبہ اور ذمہ

☆ شیخ التفسیر کلیۃ البنات، جامعۃ الفلاح، اعظم گڑھ

داران مدرسہ کی باہمی رضامندی سے فارغ ناظم اضلاع بنادیا گیا اور مدرسہ سے علاحدہ ہوگئے، کچھ سالوں کے بعد مولانا مرزاپور، بنارس، غازی پور، اعظم گڑھ کے ناظم علاقہ بھی رہے، یہ کہنا مبالغہ سے خالی نہ ہوگا کہ مشرقی یوپی میں تحریک اسلامی کو پھیلانے میں مولانا ابوبکر صاحب اصلاحی مرحوم اور مولانا ملک حبیب اللہ صاحب مرحوم امیر حلقہ مشرقی یوپی کی خدمات بہت اہم ہے، اللہ تعالیٰ ان کی مساعی کو قبول فرمائے اور انہیں جنت الفردوس میں مقام عالی عطا فرمائے۔

۱۹۶۰ء میں مدرسۃ الاصلاح میں فضا پرسکون نہ رہی اور جماعت اسلامی سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو انھیں لوگوں نے سبکدوش کردیا جنھوں نے انھیں بلایا تھا، اب ضرورت محسوس ہوئی کہ اپنی ضرورت کی تکمیل کے لیے ایک دارالعلوم کا انتظام کیا جائے، مولانا ابوبکر صاحب، مولانا ملک حبیب اللہ اور بشمول راقم ایک نشست میں جس میں مولانا مجیب اللہ صاحب ندوی بھی شریک رہے، ایک درسگاہ جامعۃ الرشاد کے نام سے کھولنے کا فیصلہ کیا گیا، مولانا مجیب اللہ صاحب ندوی اس وقت جماعت اسلامی کے رکن تھے، ادارہ چل پڑا اور چونکہ مولانا مجیب اللہ صاحب اس وقت دارالمصنّفین اعظم گڑھ میں فارغ مصنف کی حیثیت سے کام کررہے تھے اور شہر اعظم گڑھ میں ہی قیام پذیر تھے، اس لیے ان کو اس درسگاہ کا ذمہ دار بنایا گیا اور بغرض سہولت اس درسگاہ کو شہر میں بلکہ ان کے محلّہ میں ہی قائم کیا گیا، پہلے یہ مسجد میں شروع کیا گیا پھر ایک دوسری مسجد بھی درس وتدریس کے لیے منتخب کی گئی اور کرایہ پر بھی مکان لیا گیا مگر جلد ہی مولانا مجیب اللہ صاحب جماعت اسلامی سے دور ہونے لگے اور آہستہ آہستہ پھر رکنیت سے ہی مستعفی ہوگئے، اب مذکورہ دونوں ذمہ داران اور دیگر رفقاء نے یہ محسوس کیا کہ اب ہم اس درسگاہ کو آئندہ اپنی مرضی سے چلا نہ سکیں گے، اس لیے اس سے ارکان جماعت بے تعلق ہوگئے اور بلریا گنج کے ایک پرائمری اردو مکتب کی طرف رخ کیا گیا، مولانا عبدالحسیب صاحب اصلاحی رکن جماعت جامعۃ الرشاد سے منتقل کرکے اسی مکتب میں بھیج دئے گئے، پھر دھیرے دھیرے تحریک سے متعلق لوگ مسند تدریس پر فائز کیے جاتے رہے، مولانا ابوبکر صاحب اور امیر حلقہ مولانا حبیب اللہ صاحب برابر اس کی دیکھ ریکھ کرتے رہے، قصبہ کے لوگوں کا بھرپور تعاون رہا اور آہستہ آہستہ یہ پرائمری مکتب وہ جامعۃ الفلاح بنا جو دنیا کے سامنے موجود ہے اور جو کچھ ہے اسے لوگ جانتے ہیں، مولانا ابوبکر صاحب بھی بعد میں اسی جامعہ میں منتقل ہوگئے اور مختلف مناصب پر فائز رہے، مولانا مرحوم جتنے مناصب پر فائز ہوئے اتنے مناصب پر کوئی فائز نہ ہوسکا۔ مولانا جامعۃ الفلاح میں ناظم، نائب ناظم، صدر مدرس، نگرانِ اعلیٰ اور نگراں سبھی ذمہ داریوں پر فائز رہے، ناظم اور صدر مدرس تو بار بار بنائے گئے، ہر ذمہ داری کو خوش اسلوبی اور دل جمعی کے ساتھ انجام دیا۔ مولانا نے ایسا نرم اور فاضلانہ اخلاق پایا تھا کہ کبھی جذبے میں نہ آتے اور نہ ہی کسی کام میں

کسر شان محسوس کرتے، اسی چیز نے ان کو ہر دل عزیز بنا دیا تھا، مولانا خاندانی اعتبار سے تو خان تھے اور مشہور ہے کہ خان بہت جذباتی ہوتے ہیں مگر مولانا اس کے برعکس تھے، اتنے منکسر المزاج، بے لوث اور مخلص تھے کہ اگر ان کو مدرسہ کے عظیم تر منصب پر فائز ہونے کے بعد حقیر تر منصب پر لگا دیا جاتا تو کسی کو محسوس بھی نہیں ہوتا اور بعد میں پتا چلتا کہ مولانا اس حقیر منصب پر بھی بڑے اطمینان اور سکون قلب کے ساتھ کام کر رہے ہیں، چنانچہ جب کبھی کوئی منصب خالی ہوتا اور کوئی کام کرنے کو تیار نہ ہوتا تو مولانا پیرانہ سالی کے باوجود گاڑی کھینچنا شروع کر دیتے اور بعد میں کوئی مناسب نظم ہو جاتا تو خاموشی کے ساتھ اس سے الگ ہو جاتے، جامعۃ الفلاح کے کلیۃ البنات میں آخر تک خادم رہے اور ساتھ ہی نائب ناظم بھی رہے اور جب مدرسہ سے بوجہ ضعف جسمانی وضعف بصارت الگ ہوئے تو نائب ناظم تھے اور یہاں کی انتظامیہ کے دائمی ممبر شروع سے رہے اور آخر کار ۳؍مئی ۱۹۹۸ء کو آخری شب میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ جامعۃ الفلاح کے ننھے پودے کو سینچنے اور قد آور درخت بنانے میں بہت سے احباب نے اپنی زندگیاں لگائیں مگر مولانا کی قربانیاں بہت اہم اور نمایاں ہیں، مولانا کے گھر کی مالی حالت اچھی نہیں بلکہ بہت اچھی تھی اور ہے، مولانا جامعۃ الفلاح کی ملازمت کے ہرگز محتاج نہیں تھے مگر صرف اس ادارے سے عشق نے مرحوم کو یہاں باندھ رکھا تھا، مولانا کی اولاد میں تین لڑکے اور ایک لڑکی ہے، لڑکوں کے نام عمر کی ترتیب کے ساتھ یہ ہیں؛ ڈاکٹر ابوالخیر، مولانا ابوالویس اصلاحی اور ابوالفیض اور لڑکی کا نام فاخرہ ہے۔ الحمدللہ تمام اولاد باحیات ہیں، خوش وخرم ہیں مولانا کے پوتے پوتیاں نواسے نواسیاں بہت ہیں۔ مولانا کے بڑے لڑکے ایک میڈیکل کالج میں لکچرر ہیں اور دونوں چھوٹے لڑکے جنرل اسٹور چلاتے ہیں اور خوب کامیاب ہیں، ابوالویس اصلاحی صاحب تو پورے ضلع میں ایک کامیاب تاجر اور منکسر المزاج فرد کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ مولانا مجھ سے کہا کرتے تھے کہ لڑکوں کی تعلیم صرف دینی ہونی چاہیے اور ذریعہ معاش صرف تجارت ہونی چاہیے، یہ بات بار بار مجھ سے فرماتے رہتے تھے۔

مولانا کے شاگردوں کی تعداد بے شمار ہے اور خاص بات یہ ہے کہ شاگرد لڑکیاں اس سے بھی زیادہ ہیں، مولانا کے انتقال پر مدرسہ کا بند ہو جانا فطری امر تھا، مدرسہ بند رہا اور تمام اساتذہ وطلبہ بسوں میں سوار ہو کر سرائمیر گئے اور مولانا کی میت کو کندھا دیا۔ سرائے میر کے مغرب جانب قبرستان میں ۳۰-۳ بجے کے قریب سپرد خاک کیے گئے۔ مدرسہ بیت العلوم کے احاطے میں نماز جنازہ ہوئی۔ راقم الحروف نے نماز جنازہ پڑھائی، قرب وجوار سے کثیر تعداد نے جنازے میں شرکت کی اور آخری دیدار کیا پھر سوگوار واپس آ گئے۔ یہی انجام ہر ایک کا ہوگا؛ کل نفس ذائقۃ الموت ثم الینا ترجعون۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت نصیب فرمائے اور اہل خانہ کو صبر جمیل عطا کرے۔ آمین ☆

مولانا داؤد اکبر اصلاحیؒ

ڈاکٹر محمد عارف اعظمی عمری☆

مولانا داؤد اکبر اصلاحیؒ قرآن مجید کے محبّ وشیدائی، فکر فراہی کے اداشناس اور مدرسۃ الاصلاح سرائے میر، جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارکپور، مولانا آزاد تعلیمی مرکز اسرہٹہ جونپور اور جامعۃ الفلاح بلریا گنج میں قرآن مجید اور عربی ادب کے استاد تھے، ان کا وطن ضلع اعظم گڑھ کی ایک مردم خیز بستی ''بمھور'' ہے، جو شہر اعظم گڑھ اور مشہور صنعتی قصبہ مبارکپور کے درمیان واقع ہے۔

بمھور میں متعدد باکمال اہل علم پیدا ہوئے اور انگریزوں کے عہد میں یہ قریہ تحریک آزادی کا ایک اہم مرکز تھا، یہاں کے قدیم علماء میں ایک بزرگ مولانا اشرف علی صاحب تھے، جو اپنے عہد میں بڑے رعب ودبدبہ کے مالک تھے، انہوں نے فرنگی محل جاکر تعلیم حاصل کی تھی مگر اس بستی میں عام علمی مزاج وماحول علامہ شبلی نعمانیؒ کے ایک شاگرد اور ان کے ہم نام مولوی شبلی متکلم ندویؒ نے بنایا، جنہوں نے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں علامہ شبلی نعمانیؒ سے کسب فیض کیا، استاد وشاگرد کے نام کی یکسانی کے سبب یہ شبلی متعلم کہلاتے تھے مگر جب تعلیم سے فارغ ہو کر فلسفہ اور علم کلام کے استاذ مقرر ہوئے تو متعلم کے بجائے متکلم ان کے نام کا جز بن گیا۔

مولانا شبلی متکلم ندویؒ نے علامہ شبلی نعمانیؒ کی وصیت کے مطابق اپنی عمر کا بیشتر حصہ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کی علمی خدمت کے لیے وقف کر دیا اور اپنے گاؤں کے متعدد طلبہ کو مدرسہ میں داخل کر کے ان کو زیور علم سے آراستہ کیا جن میں سرفہرست مولانا امین احسن اصلاحی مرحوم مصنف ''تدبر قرآن'' ہیں، اسی قافلۂ علمی کے ایک فرد مولانا داؤد اکبر اصلاحی بھی تھے۔

مولانا داؤد اکبر اصلاحیؒ کا سن پیدائش متعین طور پر معلوم نہیں ہے، غالب گمان یہ ہے ۱۸ء و ۲۰ء کے آس پاس ان کی ولادت ہوئی ہوگی، ان کے والد حافظ محمد حسن مرحوم قرآن مجید کے عمدہ حافظ اور بڑے متقی انسان تھے، قرآن مجید کی تلاوت سے ان کو اس درجہ لگاؤ تھا کہ راستہ چلتے ہوئے

☆ مہاراشٹر

بھی وہ بہ آواز بلند تلاوت کرتے تھے۔ وہ مسلکاً اہل حدیث تھے اور مولانا داؤد اکبر صاحب مدرسۃ الاصلاح کی طالب علمی کے زمانہ میں رفع یدین اور آمین بالجہر نہیں کرتے تھے، اس پر حافظ صاحب کے بعض دوستوں کو اشکال ہوا اور انہوں نے ان سے اس کی شکایت کی مگر حافظ صاحب نے صاحبزادے کے اس عمل پر کوئی نکیر نہیں کی، بلکہ یہ کہا کہ وہ خود عالم بن رہے ہیں اس لیے وہ زیادہ بہتر سمجھتے ہوں گے۔

حافظ محمد حسن مرحوم کا ایک واقعہ بڑا موثر ہے جس سے ان کی دینی استقامت اور اسلاف کے اسوۂ عمل کو پیش نظر رکھنے کا عمدہ سبق ملتا ہے، مولانا داؤد اکبر اصلاحی مرحوم بیان کرتے تھے کہ میرے والد مرض الموت میں گرفتار ہوئے تو اس وقت میری عمر بہت زیادہ نہ تھی، چنانچہ میں ان کی چارپائی پکڑ کر بیٹھ گیا اور رونے لگا اس وقت ان پر غشی کی کیفیت طاری تھی، جب ذرا ہوش آیا اور مجھ کو اس حال میں دیکھا تو یہ کہا کہ تم روتے ہو آخر خیال کرو کہ وہ لوگ کیسے تھے جنہوں نے رسول ﷺ کی جدائی پر صبر کیا۔

حافظ محمد حسن صاحب نے نہایت کم عمری میں مولانا داؤد اکبر اصلاحی کو مدرسۃ الاصلاح بغرض حصول تعلیم بھیج دیا اور چونکہ مولانا شبلی متکلم، مولانا داؤد اکبر کے خاندانی چچا تھے اس لیے ان کو ان سے خاص انس بھی تھا غرض مدرسۃ الاصلاح ہی میں انہوں نے ابتدا تا انتہا تعلیم مکمل کی۔

مدرسۃ الاصلاح میں ایک اور طالب علم ان کے ہم نام داخل تھے جس کے سبب سے مغالطہ ہو جایا کرتا تھا، چنانچہ مولانا شبلی متکلم نے ان دونوں میں فرق وامتیاز کے لیے ان کے نام کے آگے اکبر کا اضافہ کر دیا جو مدۃ العمر ان کے نام کا جز بن گیا۔

مولانا داؤد اکبر اصلاحیؒ ۱۹۳۶ء کے آس پاس تعلیم سے فارغ ہوئے ان کے اساتذہ میں مولانا شبلی متکلم ندوی، مولانا محمد سعید صاحب ندوی، مولانا امین احسن اصلاحی اور مولانا اختر احسن اصلاحی تھے، تاہم ان کو زیادہ تعلق مولانا شبلی متکلمؒ اور مولانا امین احسن اصلاحی سے تھا، مقدم الذکر سے اس وجہ سے کہ وہ ان کے چچا اور محسن تھے اور مولانا امین احسن اصلاحی مرحوم سے ان کا تعلق مضمون قرآن مجید کی مناسبت سے تھا اور پھر وہ ان کے ہم وطن بھی تھے۔

مولانا داؤد اکبر اصلاحی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد علی الفور مدرسۃ الاصلاح میں استاد مقرر کر لیے گئے، وہ عہد مدرسۃ الاصلاح کی تعلیمی تاریخ کا زریں دور تھا مگر ظاہری بے سروسامانی کا یہ عالم تھا کہ ان کا تقرر پانچ روپیہ ماہوار پر ہوا تھا اور یہ تنخواہ بھی آٹھ آٹھ ماہ تک اساتذہ کو نہیں مل پاتی

تھی۔ مولانا داؤد اکبر اصلاحی اس عہد کا ذکر بڑے پر جوش اور محبت آمیز لہجہ میں کرتے تھے اور کہتے تھے کہ سارے ہی اساتذہ کے ساتھ یہی کیفیت تھی اور لطف یہ کہ مدرسہ کے منشی جی جب ہم میں سے کسی کو تنخواہ کی رقم پیش کرتے تو ہر شخص یہی کہتا ہے کہ میرا کام چل رہا ہے کوئی صاحب زیادہ پریشان حال ہوں ان کو یہ رقم دے دیں۔

۱۹۳۶ء میں مدرسۃ الاصلاح کے احاطہ میں دائرہ حمیدیہ کا قیام عمل میں آیا اور اس کی جانب سے ماہنامہ ''الاصلاح'' نکلنا شروع ہوا جس کا خاص مقصد فکر فراہی کی ترویج واشاعت اور اس کے نہج پر قرآن مجید پر غور وفکر کرنے والی ایک جماعت کا تیار کرنا تھا، مولانا امین احسن اصلاحی مرحوم اس قافلہ کے میر کارواں تھے اور اس علمی تحریک میں جن بزرگوں نے نمایاں حصہ لیا ان میں مولانا داؤد اکبر اصلاحی مرحوم بھی شامل تھے، چنانچہ ۱۹۳۷ء سے الاصلاح میں ان کے مضامین نکلنے شروع ہو گئے جو فکر فراہی کے طرز وادا پر خالص قرآنی تحقیقات پر مشتمل ہوتے تھے۔

مولانا داؤد اکبر اصلاحی کو قرآن مجید سے والہانہ تعلق تھا وہ گو حافظ قرآن مجید نہیں تھے مگر تراویح میں بالعموم حافظ کو لقمہ دے دیتے تھے، مولانا حمید الدین فراہیؒ کے طریقہ تفسیر سے ان کو اس درجہ تعلق تھا کہ اسی انداز پر قرآن مجید میں غور وفکر کرتے اور اس طریقہ تفسیر پر کوئی اعتراض کیا جاتا تو ان کو ناگواری ہوتی۔ ۱۹۴۲ء میں جب مولانا امین احسن اصلاحی مدرسۃ الاصلاح سے علاحدہ ہو کر پٹھان کوٹ چلے گئے تو مدرسہ کے منتہی طلبہ کو قرآن مجید پڑھانے کے لیے ان ہی کا انتخاب عمل میں آیا۔

مدرسۃ الاصلاح میں مولانا داؤد اکبر اصلاحی نے تعلیم وتدریس کی خدمت ایک عرصہ تک انجام دی۔ پھر ایسے حالات پیدا ہو گئے کہ بہت سے ایسے لوگ جنہوں نے اس درسگاہ سے عمر بھر کا پیمان وفا باندھا تھا ان کو مجبوراً اس سے علاحدہ ہونا پڑا جن میں مولانا داؤد اکبر اصلاحی بھی شامل تھے۔ مدرسۃ الاصلاح سے علاحدگی کے بعد وہ اپنے گاؤں کے قریب قصبہ مبارک پور کی مشہور دینی درسگاہ جامعہ عربیہ احیاء العلوم میں مدرس مقرر ہو گئے اور تقریباً بارہ برس تک اس سے وابستہ رہے، اسی زمانہ میں مولانا قاضی اطہر مبارکپوریؒ نے ان کے قرآنی مقالات کا مجموعہ ''مشکلات القرآن'' لاہور سے طبع کرایا۔ پھر چند برس جامعۃ الرشاد اعظم گڑھ سے منسلک رہے، اسی اثناء میں مولانا ابوبکر اصلاحی مرحوم سابق ناظم جامعۃ الفلاح کی تحریض پر کچھ دنوں کے لیے پڑگہ (مہاراشٹر) بھی چلے گئے، جہاں ان کے مدرسۃ الاصلاح کے شاگردوں کی ایک خاصی تعداد موجود تھی۔ بالآخر دوبارہ مادر علمی مدرسۃ الاصلاح میں اساتذہ کی ضرورت محسوس ہوئی اور وہ اپنے استاد مولانا شبلی متکلم ندوی کی معیت

میں پھر وہاں پہنچ گئے۔

یہ عجیب ستم ظریفی ہے کہ مولانا شبلی متکلم ندوی اور ان کے رفقاء ۱۹۷۰ء میں دوبارہ مدرسۃ الاصلاح سے علاحدہ ہونے پر مجبور ہوئے۔ جس واقعہ کے بعد مولانا داؤد اکبر اصلاحی کے اعزہ نے ان کو تعلیم وتدریس سے مکمل طور پر کنارہ کشی اختیار کرکے گھر پر مقیم رہنے کا مشورہ دیا اور وہ بھی اس کے لیے آمادہ ہوگئے مگر عمر بھر تعلیم وتدریس سے جو وابستگی تھی اس کی تشفی کا سامان بمہور جیسے افتادہ قریہ میں کیسے ممکن ہوسکتا تھا بہرحال کچھ ہی دنوں بعد مولانا نجم الدین اصلاحی مرتب مکتوبات شیخ الاسلامؒ کی دعوت پر مولانا آزاد تعلیمی مرکز اسرہٹہ جونپور سے جزوی تعلق منظور کرلیا، اسی دوران ۱۹۷۲ء میں وہ اپنی اہلیہ کے ساتھ حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے۔ ۱۹۸۱ء میں جامعۃ الفلاح بلریا گنج کے استاذ تفسیر مولانا جلیل احسن ندویؒ کا انتقال ہوا تو وہاں قرآن مجید کی تعلیم کا مسئلہ پیدا ہوا، اس وقت جامعۃ الفلاح کے ناظم مولانا ابواللیث اصلاحی ندویؒ تھے جو ان دنوں اپنے وطن چاند پٹی میں اقامت گزیں تھے، انہوں نے مولانا جلیل احسن ندوی کی جگہ پر کرنے کے لیے مولانا داؤد اکبر اصلاحی کو دعوت دی جس کو انہوں نے منظور کرلیا۔

جامعۃ الفلاح پر مولانا داؤد اکبر اصلاحی بہت کم وقت دے سکے، سال ڈیڑھ سال کا وقت مشکل سے گزرا تھا کہ ایک روز جامعہ سے گھر جاتے ہوئے راستہ ہی میں ان پر دماغی فالج کا حملہ ہوا پھر کچھ وقفہ کے بعد دوبارہ اس کا شدید حملہ ہوا اور چند روز صاحب فراش رہ کر ۴ر فروری ۱۹۸۳ء کو اس دارفانی سے کوچ کرگئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ان کے بچپن کے رفیق مولانا اظہار الدین اصلاحی مرحوم نے نماز جنازہ پڑھائی اور اپنے آبائی قبرستان میں آسودۂ خاک ہوئے۔ پسماندگان میں اہلیہ محترمہ اور ایک صاحبزادے مولانا محمد اشہد سکریٹری متکلم ایجوکیشنل سوسائٹی بمہور اور ایک صاحبزادی محترمہ خورشیدہ بیگم چھوڑے جو کہ راقم الحروف کی والدہ ماجدہ ہیں۔ ۱۹۹۶ء میں ان کی اہلیہ کا بھی انتقال ہوگیا۔

تغمد الله برحمته وأدخلهما فی فسيح جنانه

اخلاق و عادات

مولانا داؤد اکبر اصلاحیؒ نہایت سادہ اور متواضع زندگی بسر کرتے تھے، فقط دو جوڑے کپڑے مارکین کے ان کے ہوتے تھے، جو گھر میں سلے جاتے اور وہ خود اپنے ہاتھ سے دھل کر ان کو پہنتے تھے، کبھی کسی سے کسی قسم کی خدمت لینا گوارا نہیں کرتے اور اسی کی تعلیم اپنے عزیزوں اور

خوردوں کو بھی دیتے تھے۔

غیرت واستغناء ان کی طبیعت ثانیہ تھی، وہ کہا کرتے تھے کہ وہ آدمی کیا جس کی مالی حالت کا اظہار اس کے ظاہری لباس و پوشاک سے ہو، استغناء اور بے نیازی کا یہ حال تھا کہ جس زمانہ میں چک بندی ہوئی اس وقت بالعموم لوگوں کو یہ فکر لاحق ہوتی ہے کہ ان کو مناسب مقام پر کھیت ملے مگر انہوں نے کبھی بھی اس جگہ جانا پسند نہیں کیا جہاں چک بندی کے افسران مقیم تھے، ایک مرتبہ خود ایک افسر نے حیرت سے کہا کہ یہ کون صاحب ہیں جو روزانہ ادھر سے گزرتے تو ہیں مگر کبھی میرے یہاں نہیں آئے، گاؤں کے لوگوں نے بتایا کہ وہ آپ کے پاس آنے اور سفارش کرنے کا مزاج نہیں رکھتے، چنانچہ اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے لوگوں سے کہا کہ ان سے کہہ دیجئے کہ بس ایک مرتبہ آکر صرف یہ اشارہ کردیں کہ ان کو کہاں کھیت مطلوب ہے، میں وہی کھیت ان کے نام کردوں گا، لوگوں نے یہ اطلاع ان تک پہنچائی مگر وہ اس کے لیے بھی آمادہ نہیں ہوئے، چنانچہ اس افسر نے ایک نہایت عمدہ کھیت ان کے نام کیا جواب بھی ان کے ورثہ کی تحویل میں ہے۔ ان کو اپنے اعزہ واقربا سے بڑی محبت تھی، وہ صلہ رحمی کا پورا حق ادا کرتے تھے، ان کے والد کا اصل وطن موضع آنوک تھا جہاں سے بچپن میں وہ اپنے نانیہال بمہور آگئے تھے اور یہیں رہ بس گئے، مولانا داؤد اکبر اصلاحی گاہے بہ گاہے آنوک اور اس سے متصل ان مواضعات میں جہاں ان کے دادھیالی رشتہ کے لوگ رہتے تھے تشریف لے جاتے تھے اور ان سے ملاقاتیں کرتے تھے۔

وہ بزرگوں کا احترام اور خوردوں پر شفقت ومحبت کی اسلامی تعلیم کا عمدہ نمونہ تھے، کبھی کسی کا نام بگاڑ کر لینا پسند نہیں کرتے تھے، اگر کوئی ایسے عرف سے مشہور ہوتا جس میں کسی حد تک بھی ذم کا پہلو ہوتا تو کبھی اس کا یہ نام نہ پکارتے۔

مولانا داؤد اکبر اصلاحیؒ کو مولانا حمید الدین فراہیؒ سے غیر معمولی عقیدت ومحبت تھی گو انہوں نے ان کو طالب علمی کے زمانہ میں صرف دیکھا تھا ان سے استفادہ کا موقع ان کو نہیں ملا تھا، محبت کا یہ عالم تھا کہ ان کے خلاف کوئی بات سننا گوارا نہیں کرتے تھے، اسی طرح مدرسۃ الاصلاح سے ان کو جذباتی تعلق تھا، اس کا ذکر جب چھڑ جاتا تو بیان کیے چلے جاتے، مدرسہ کے بہت سے واقعات بیان کرتے اور خاص طور پر وہ بات تفصیل سے ذکر کرتے جس میں کوئی عبرت یا نصیحت کا سبق ہو۔ ایک مرتبہ کہنے لگے کہ ایک زمانہ میں دارالاقامہ کا نگراں تھا، ایک صاحب تشریف لائے اور انہوں نے دو جوڑے کپڑے دئے کہ ان کو کسی غریب طالب علم کو دے دیں، کہنے لگے کہ اس وقت

مدرسۃ الاصلاح میں غیرت واستغناء کا جو ماحول تھا اس کے سبب سے میں سخت آزمائش میں پڑ گیا، کافی ہمت کر کے کئی روز کے بعد ایک طالب علم کو جو بعض اساتذہ کے کپڑے بالعموم دھل دیا کرتا تھا اپنے کمرہ میں بلایا اور اس کو وہ کپڑے پیش کیے، وہ طالب علم فرط غیرت سے رونے لگا اور اس نے کہا کہ مولانا میں اپنے اساتذہ کی خدمت پر بنائے ضرورت نہیں بلکہ بر بنائے محبت کرتا ہوں، مولانا فرماتے تھے کہ میں نے اس طالب علم سے معافی مانگی، کچھ دنوں بعد وہ صاحب جنہوں نے کپڑے دئے تھے، تشریف لائے تو انہوں نے ان کو کپڑے واپس کر دئے اور کہا کہ ہمارے مدرسہ میں اس کا کوئی مستحق نہیں ہے۔

اسی زمانہ کا ایک اور دلچسپ واقعہ وہ اکثر سناتے تھے کہ اپنی نگرانی کے زمانہ میں میں نے یہ ماحول بنایا تھا کہ کوئی طالب علم بیڑی، سگریٹ وغیرہ کا استعمال نہ کرے۔ کچھ دنوں بعد ان کو یہ اطلاع ملی کہ پورا دارالاقامہ اس لعنت سے پاک ہے، البتہ ایک طالب علم اس میں مبتلا ہے، تحقیق حال کی تو معلوم ہوا کہ وہ دارالاقامہ کے باہر جا کر ایک درخت پر چڑھتا ہے اور اس پر بیٹھ کر بیڑی پیتا ہے۔ اس سے ان کو اندازہ ہو گیا کہ اس کی عادت پختہ ہو چکی ہے، اس لیے انہوں نے اس سے صرف نظر کیا۔

اپنے اساتذہ میں ان کو متعدد حیثیتوں سے مولانا شبلی متکلم سے بے پناہ عقیدت ومحبت تھی، مدرسۃ الاصلاح پر ان کی جو دل آزاری ہوئی اس کا ذکر جب کبھی چھڑ جاتا تو بے قرار ہو جاتے اور فرط جوش وغضب سے ان کا بدن کانپنے لگتا۔

مولانا داؤد اکبر اصلاحیؒ کے کئی لڑکے بچپن میں فوت ہو گئے مگر وہ رضائے الٰہی کے سامنے سر بسجود رہے، ان حالات میں ان کی نیک بخت اہلیہ نے ان کی تیمارداری کے سارے فرائض خود انجام دئے اور مولانا کی تعلیمی یکسوئی پر حرف نہیں آنے دیا، ایک بچے کی وفات کی اطلاع کے بعد وہ مدرسۃ الاصلاح سے گھر آئے اور اس کی تجہیز وتکفین میں شامل ہوئے۔

مولانا داؤد اکبر اصلاحیؒ عام طور پر پیدل چلنے کے عادی تھے، وہ قدموں کو اس طرح رکھتے کہ ان سے چاپ کی آواز سنائی نہیں دیتی تھی مگر وہ بہت تیز رفتاری سے چلتے تھے، میلوں کا سفر پا پیادہ طے کرتے، کبھی ان سے سواری کے لیے اصرار کیا جاتا تو اس پر بھی بیٹھ جاتے تھے، ایک مرتبہ کہنے لگے کہ بعض بزرگ ننگے پاؤں اور سخت دھوپ میں چلنے کی عادت ڈالتے تھے تا کہ جہاد کی عملی مشق رہے، اس لیے محنت کی عادت ڈالنی چاہیے۔

ان کی طبیعت میں سادگی ضرور تھی مگر خشکی نہیں تھی، بعض اوقات بڑی ظریفانہ باتیں کرتے، ان کو روایتی تصوف سے کوئی مناسبت نہیں تھی، تاہم وہ مولانا وصی اللہ فتح پوری کے مداح و معترف تھے اور مولانا فتح پوریؒ بھی ان سے بڑی محبت رکھتے تھے، گاہے بہ گاہے ان دونوں بزرگوں کی ملاقاتیں بھی ہوا کرتی تھی، اسی طرح ۱۹۳۶ء میں علامہ شبلی نعمانیؒ اور مولانا حمید الدین فراہیؒ کی تکفیر کی مہم ایک مخصوص حلقہ نے چلائی جس کی تحقیق حال کے لیے مولانا سید حسین احمد مدنیؒ نے مدرسۃ الاصلاح کا سفر کیا اور اس کی مدافعت کے لیے سینہ سپر ہوئے، مولانا داؤد اکبر اصلاحی حضرت مدنیؒ کے اس طرز عمل سے بے حد متاثر تھے۔

مولانا داؤد اکبر اصلاحیؒ مسلکی رواداری کے نہ صرف قائل بلکہ اس کے علم بردار بھی تھے اور اسی سبب سے ان کی موجودگی تک ان کی بستی میں کوئی قابل ذکر مسلکی تنازعہ نہیں ہوا اور اگر کچھ صورت حال ایسی پیدا ہو جاتی تو وہ ہر مسلک کی رعایت کرتے ہوئے حکیمانہ فیصلہ کرتے اور سب کو راضی ومطمئن رکھتے۔ مولانا داؤد اکبر اصلاحیؒ شجاعت کے وصف سے بھی متصف تھے، ایک دفعہ ان کے ایام شباب میں ان کے گاؤں اور اس کے قرب وجوار کے غیر مسلم مواضعات کے درمیان تنازعہ ہوا اور ایسا محسوس ہونے لگا کہ وہ لوگ گاؤں پر حملہ آور ہو جائیں گے اس وقت یہ بھی عمامہ باندھ کر گاؤں کے نوجوانوں کے ساتھ مستعد ہو گئے۔

ملی خدمات

مولانا داؤد اکبر اصلاحیؒ نے سماجی اور ملّی خدمات بھی انجام دیں۔ وہ مدۃ العمر اپنی بستی میں نماز جمعہ کے امام رہے، ان سے پہلے ان کے استاد مولانا امین احسن اصلاحی مرحوم اس خدمت کو انجام دیتے تھے، ان کے پاکستان چلے جانے کے بعد مولانا داؤد اکبر اصلاحیؒ نے نہایت خوبی کے ساتھ اس خلا کو پر کیا، وہ عوام الناس کے مسائل کو بھی صلح وآشتی سے سلجھاتے تھے اور ان کی ذات سب کے لیے یکساں طور پر معزز اور محترم تھی۔

انہوں نے اپنے دوستوں کی مدد سے آبادی میں ایک بیت المال قائم کیا، زکوۃ وصدقات کی رقمیں اور عشر کا غلہ ایک جگہ اکٹھا کرواتے اور گاؤں کے مستحقین تک اس کو پہنچانے کا نظم کرتے اور باہر کے مسافر، سفراء اور حاجت مندوں کی اس سے اعانت کرتے، اس اہم کام میں ان کے رفیق خاص مولانا محمد انیس اصلاحیؒ مرحوم رہتے، مدرسۃ الاصلاح میں معلم ہونے اور اپنا مطب کرنے کی وجہ سے ہمہ وقت گاؤں میں موجود رہتے تھے۔

مسلمانوں کی معاشرتی اصلاح کے لیے فکر مند رہتے ، انفرادی طور پر اس کے لیے لگے رہتے اور جب کبھی کوئی اجتماعیت قائم ہوتی تو پورے خلوص اور لگن کے ساتھ اس کا تعاون کرتے ، مختلف قریات کا دورہ کرتے اور اکثر جمعہ کے دن کا انتخاب کرتے تا کہ آبادی کے زیادہ تر لوگوں سے مخاطب ہونے کا موقع مل سکے، اس میں بھی اس بات کا اہتمام کرتے کہ اگر اس بستی میں اردو میں خطبہ ہوتا ہے تب تو وہ اردو میں خطبہ دیتے اور یہی ان کا اپنے وطن میں معمول تھا اور اگر اس کے بجائے کہیں عربی میں خطبہ پر اصرار ہوتا تو اپنی تقریر جمعہ سے قبل یا جمعہ کے بعد کرتے۔

ایک مرتبہ علاقہ کے کچھ دردمندوں نے اصلاح معاشرہ کی تحریک چلائی تو جی جان سے اس کے ساتھ ہو گئے اور اس تحریک کے اغراض و مقاصد کے تعارف کے لیے گاؤں گاؤں پیدل جاتے اور وعظ کہتے اور اس نوعیت کے پروگرام میں ان کے مصاحب خاص ڈاکٹر محمد اسلام بمھوری (رکن جماعت اسلامی) ہوا کرتے تھے، آج اسی تحریک کی بدولت اعظم گڑھ کے گرد و نواح میں دن دن کی بارات کا رواج عام ہوا، ورنہ اس سے پہلے بارات شام کو جا کر دوسرے دن لوٹتی تھی اور میزبان کو کم از کم تین وقت ضیافت کا بوجھ اٹھانا پڑتا تھا، اس کے علاوہ بھی بہت سی اصلاحات ہوئیں۔

علمی خدمات

مولانا داؤد اکبر اصلاحیؒ مدۃ العمر علم و تعلیم سے وابستہ رہے ، مختلف مدارس عربیہ میں تدریسی خدمات کا ذکر پہلے آ چکا ہے، اس کے علاوہ جس دوران وہ اپنی بستی میں مقیم رہے، وہاں بھی انہوں نے گاؤں کے طلبہ کو پڑھانے کا سلسلہ برقرار رکھا اور ان کا طریقۂ تدریس بہت دلچسپ انداز کا ہوا کرتا تھا، وہ اپنے کھیت پر جاتے اور وہیں طلبہ کو بھی بلا لیتے تھے اور کھیتی باڑی کے کاموں کی مشغولیت کے ساتھ طلبہ کو پڑھاتے بھی رہتے تھے۔

بمھور میں ابتداءً کوئی با قاعدہ مکتب نہیں تھا، مولانا شبلی متکلم ندوی کی تحریک پر ۱۹۴۵ء میں ایک مکتب کی بنیاد ڈالی گئی اور کچھ دنوں طلبہ مختلف لوگوں کے بیٹھک میں قرآن مجید و دینیات کی تعلیم حاصل کرتے رہے، ۱۹۵۲ء میں مولانا امین احسن اصلاحیؒ اپنے والد کی وفات کے بعد بمھور تشریف لائے تو اسی موقع پر مکتب کی ایک عمارت کی بنیاد ان سے رکھوائی گئی جس کا نام ''مدرسۃ الاسلام'' رکھا گیا، مولانا داؤد اکبر اصلاحیؒ اول روز سے اس مکتب سے وابستہ رہے اور اس کی بنیاد و تاسیس میں انہوں نے اور ان کے یار غار مولانا محمد انیس اصلاحی مرحوم نے نمایاں حصہ لیا۔

تعلیم و تدریس کے ساتھ ان کے اندر لکھنے پڑھنے کا ذوق بھی شروع ہی سے تھا، ان کی

مضمون نگاری کا آغاز ''الاصلاح'' اور ''ترجمان القرآن'' جیسے موقر رسالوں سے ہوا، الاصلاح میں ان کے متعدد مضامین شائع ہوئے جو فکر فراہی کے آئینہ دار اور طبع زاد ہیں۔

ادارہ علوم القرآن علی گڑھ نے اپنے مجموعہ مضامین ''قرآنی مقالات'' مطبوعہ ۱۹۹۱ء میں الاصلاح کے تمام مقالوں کو حواشی اور مراجع کی صراحت کے ساتھ شائع کر کے ایک اہم خدمت انجام دی ہے۔ اس میں مولانا داؤد اکبر اصلاحیؒ کے درج ذیل مضامین شامل ہیں۔

۱-والنجم اذا ھوی (الاصلاح فروری ۱۹۳۹ء) ۲-لا اقسم بھذا البلد (مئی ۱۹۳۶ء)

۳-والعادیات ضبحاً (مارچ و اپریل ۱۹۳۹ء) ۴-مومن قرآن کے آئینہ میں (اگست ۱۹۳۹ء)

۵-تقویٰ (فروری و مارچ ۱۹۳۷ء) ۶-خلوص (اکتوبر ۱۹۳۷ء)

اس کے علاوہ ان کے متعدد مضامین ترجمان القرآن (حیدر آباد) معارف اعظم گڑھ) برہان (دہلی) ندیم (گیا) اور صدق و فاران میں بھی شائع ہوئے، راقم الحروف کی معلومات کی حد تک ان کی تفصیل حسب ذیل ہے:

۱- تفسیر آیت ''ما کان لنبی ان یکون لہ اسری'' (ترجمان القرآن ج۹ عدد۴ ماہ شوال ۱۳۵۵ھ مطابق دسمبر ۱۹۳۶ء وجلد/۱۰، عدد/۶، وجلد/۱۱، عدد/۱، ماہ جمادی الاخری و رجب ۱۳۵۶ھ مطابق اگست ستمبر/۱۹۳۷ء) اس مضمون میں انہوں نے جمہور مفسرین کے برخلاف ایک نئی رائے پیش کی ہے۔ ترجمان القرآن کے مدیر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے جمہور کے موقف کی تائید کرتے ہوئے اس کے حاشیہ میں اور الگ سے بھی ایک نوٹ لکھا اور اسی سلسلہ کا مولانا مودودیؒ کا ایک خط بنام مولانا داؤد اکبر اصلاحیؒ مجلّہ حیات نو نے مولانا داؤد اکبر کے انتقال کے بعد ماہ اگست ۸۳ء کے شمارہ میں شائع کیا ہے جس کے اخیر میں مولانا مودودیؒ نے یہ تحریر فرمایا ہے کہ ''اس مسئلہ میں اگر آپ دوبارہ کچھ تحریر فرمائیں گے تو خوشی کے ساتھ شائع کیا جائے گا اور اس پر اگر ضرورت ہوئی تو میں بھی زیادہ تفصیل کے ساتھ کچھ عرض کر سکوں گا۔'' (حیات نو شمارہ اگست ۸۳ء ص ۲۹)

۲- اقسام قرآن (ترجمان القرآن ماہ ذی الحجہ ۱۳۵۵ھ/فروری ۱۹۳۷ء، ج/۹، عدد/۶) اس مضمون میں قسم کے موضوع پر مشتمل سورہ بروج کی ابتدائی آیات کی تفسیر و توجیہ مولانا فراہیؒ کے نقطۂ نظر سے کی گئی ہے۔

۳- شکر (ترجمان القرآن ماہ رمضان المبارک ۱۳۵۶ھ/نومبر ۱۹۳۷ء ج۱۱، عدد۳) اس مضمون میں انہوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ شکر اسلامی زندگی کے لیے باعث حیات اور دینی و دنیاوی

ترقیوں کی اساس ہے۔

۴- لفظ فتنہ اور قرآن مجید (معارف ج ۵۹ عدد ۴-۵ ماہ اپریل ومئی ۱۹۴۷ء) اس مضمون میں قرآن مجید کے استعمالات کی روشنی میں لفظ فتنہ کے معانی کی وضاحت کی گئی ہے۔

۵- حضرت موسیٰؑ کے واقعۂ ایذا رسائی اور براءت کی تحقیق (ماہنامہ برہان ج ۷ شمارہ ۳، شوال ۱۳۶۵ھ/ستمبر ۱۹۴۶ء) اس مضمون میں سورہ احزاب کی آیت ''یاایھا الذین آمنوا لاتکونوا کالذین آذوا موسیٰ فبراہ اللہ مما قالوا وکان عنداللہ وجیھاً'' کی تفسیر وتوضیح کی گئی ہے اور اس میں مولانا داؤد اکبر اصلاحیؒ نے مفسرین کے اس عام قول کی تردید کی ہے کہ حضرت موسیٰؑ کو کوئی جسمانی عارضہ لاحق تھا جس کی برأت کا ذکر اس آیت میں ہے۔ بلکہ انہوں نے نظام سورہ اور سیاق کلام سے یہ ثابت کیا ہے کہ اس میں قوم موسیٰؑ کے منافقین کی شرارتوں کا ذکر کرکے عہد نبوی کے منافقین کو سرزنش اور تنبیہ کی گئی ہے۔

۶- قصیدہ قفانبک کی شرح قرآن مجید کی روشنی میں (ماہنامہ ندیم گیا ۱۹۴۷ء) یہ مضمون کئی شماروں میں بالاقساط شائع ہوا ہے اور اس میں کلام جاہلی کے اسلوب بیان کی مماثلت دکھاتے ہوئے بعض قرآنی الفاظ کا مفہوم کلام عرب کی روشنی میں متعین کیا گیا ہے۔

۷- دینونت کبریٰ (مجلّہ نشاۃ نو مولانا آزاد تعلیمی مرکز اسرہٹہ جونپور) اس مضمون میں سورہ نبا کی تفسیر کی گئی ہے۔

مولانا داؤد اکبر اصلاحی کے بعض مضامین صدق (لکھنؤ) اور فاران (بجنور) میں بھی شائع ہوئے مگر اس کی تفصیل راقم الحروف کو دستیاب نہیں ہوسکی اور پھر اس کی تلاش وتعیین اس لیے بھی دشوار ہے کہ ان رسالوں میں ان کے بعض مضامین ان کے نام سے نہیں چھپے ہیں۔

۱۳۶۶ھ/۱۹۴۷ء میں ان کے منتخب قرآنی مضامین کا ایک مجموعہ ''مشکلات القرآن'' کے نام سے دانش گاہ پنجاب مزنگ لاہور سے شائع ہوا، جس کے محرک مولانا قاضی اطہر مبارکپوریؒ تھے جو ان دونوں اسی ادارہ سے وابستہ تھے۔ اس مجموعہ میں الاصلاح، ترجمان القرآن اور برہان کے مضامین کے علاوہ درج ذیل مضامین کا اضافہ ہے۔

۱-ذبح بقرہ اور قتل نفس کے واقعہ کی تحقیق	۲-سورہ اعراف کی ایک آیت اور اس کی تاویل
۳-سورہ صافات کی قسمیں	۴-ق والقرآن المجید کے متعلق سوال اور اسکا جواب
۵-سورہ طور کی قسمیں	۶-سورہ قمر کی ایک آیت کے متعلق سوال اور اسکا جواب

ان کی دوسری کتاب ''قرآن مجید کا چیلنج'' ۱۹۷۲ء میں دائرۃ المصنّفین ہلال بکڈپو مبارکپور سے شائع ہوئی، جس کو ان کے ایک عزیز اور ہم وطن مولانا نجم الدین احیائی مرحوم نے اپنے مفید مقدمہ کے ساتھ شائع کرایا۔ اس کتاب میں انہوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ قرآن مجید کا اعجاز محض عربی زبان اور اس کے اسلوب ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ اس کا اصل اعجازی پہلو اس کی معنویت میں پنہاں ہے اور اس کی بنا پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ قرآن مجید کا اعجاز محض کسی مخصوص خطہ اور دور تک محدود نہیں ہے بلکہ یہ پورے عالم کے لیے اور ہر زمانہ کے لیے ہے۔

مولانا داؤد اکبر اصلاحی نے مولانا نجم الدین احیائی مرحوم کی خواہش اور اصرار پر سعودی عرب کی جانب سے منعقد بین الاقوامی مقابلۂ سیرت کے لیے بھی ایک مضمون لکھا تھا، اس کا مقدمہ نہایت جامع اور اہم ہے جس میں انہوں نے اس طرف توجہ دلائی ہے کہ بالعموم سیرت نگار مناقب و فضائل کے ذکر میں انبیاء کے درمیان تقابل کر بیٹھتے ہیں جس سے یک گونہ تفریق بین الرسل کی بو آتی ہے، انہوں نے اس مقدمہ میں یہ ثابت کیا ہے کہ تمام انبیاء کی دعوت اور ان کا مشن ایک تھا، ان کی شریعتوں میں ضرور جزوی فرق رہا مگر دین سب کا ایک تھا اس لیے سیرت نگاری میں اس پہلو کو خاص طور پر مدنظر رکھنے کی ضرورت ہے۔

ان کا یہ مضمون غالباً رابطہ عالم اسلامی کے دفتر سے ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی کو حاصل ہوا، اور اس وقت وہ ماہنامہ فکر ونظر اسلام آباد کے مدیر تھے، چنانچہ انہوں نے اس مضمون کو ''مطالعۂ سیرت ......سلسلۂ انبیاء کے تناظر میں'' کے عنوان سے فکر ونظر کے شمارہ ۱۰۰-۲۱ بابت ماہ شعبان ۱۴۰۴ھ/مئی ۱۹۸۴ء میں شائع کیا۔

قرآنی تحقیقات کی دو مثالیں

مولانا داؤد اکبر اصلاحیؒ نے مدۃ العمر مولانا حمید الدین فراہیؒ کے فکر ومنہج کے مطابق قرآن مجید کے معانی ومطالب پر غور وتدبر کیا اور اس بحر ناپیدا کنار میں غواصی کر کے نہایت قیمتی موتی برآمد کیے، چنانچہ ان کی بعض قرآنی تحقیقات فکر فراہیؒ کے وقیع سرمایہ میں نہایت اہم اور قابل قدر اضافہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ نمونہ کے طور پر صرف دو مثالیں پیش کی جاتی ہیں جن سے ان کے قرآنی تبحر اور فکر فراہی سے ان کی گہری مناسبت اور واقفیت کا اندازہ ہوسکے گا۔

۱- آیت اثخان کی منفرد تاویل

مکہ مکرمہ میں رسول اللہ ﷺ اور آپ کے جاں نثار صحابہؓ مسلسل تیرہ برس تک مشرکین کے

ظلم وستم کے شکار رہے۔ ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں ان کو ایک اطمینان کی جگہ میسر آئی، مگر یہاں بھی ابتدا میں ان کو یہودیوں کی سازشوں اور ان کے مکروفریب اور مشرکین مکہ کے خطرات کا ہمہ وقت سامنا تھا بالآخر غزوہ بدر کا معرکہ پیش آیا جس نے باطل کی کمر توڑ کر رکھ دی اور حق کا بول بالا ہوا، اسی لیے قرآن مجید نے اس غزوہ کو یوم الفرقان کے نام سے موسوم کیا ہے، قرآن مجید میں اس غزوہ کا مفصل ذکر سورہ انفال میں ہے جس میں غزوہ کی تمام تفصیلات کے ساتھ جنگ میں مسلمانوں کی غیبی مدد اور ملائکہ کے نزول کا ذکر بھی ہے۔ اس سورہ میں مالِ غنیمت کے احکام بھی ذکر کیے گئے ہیں اور قیدو بند اور فدیہ وغیرہ کا بھی ذکر آیا ہے، اس ضمن میں درج ذیل دو آیتیں بھی آئی ہیں۔ "ما کان لنبی أن یکون له اسری حتی یثخن فی الارض تریدون عرض الدنیا والله یرید الآخرة والله عزیز حکیم. لولا کتاب من الله سبق لمسکم فیما اخذتم عذاب عظیم" ان دونوں آیتوں کی تفسیر میں جمہور مفسرین متفق اللفظ ہیں کہ ان میں اہل ایمان مخاطب ہیں اور اس کا شان نزول وہ یہ بتاتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے غزوہ بدر میں کفار کی طاقت پوری طرح کچلنے سے قبل قیدی پکڑ لیے اور مدینہ پہنچ کر کے ان اسیران بدر کی بابت صحابہ کرامؓ سے مشورہ کیا کہ ان کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے، حضرت عمرؓ نے رائے دی کہ سب قتل کر دیے جائیں اور حضرت ابوبکرؓ نے یہ مشورہ دیا کہ ان سے فدیہ لے کر ان کو چھوڑ دیا جائے، چنانچہ اسی مشورہ پر عمل ہوا۔ اسی موقع پر یہ دونوں آیتیں نازل ہوئیں جن میں فدیہ لینے پر مسلمانوں کو سرزنش کی گئی، بعض روایتوں میں یہ بھی آیا ہے کہ ان آیتوں کے نزول کے بعد آنحضرت ﷺ اور حضرت ابوبکرؓ رو پڑے اور حضور اکرم ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا کہ مجھ کو عذاب اس درخت سے بھی قریب تر دکھایا گیا اور اگر وہ آجاتا تو بجز حضرت عمرؓ کے کوئی بچ نہیں سکتا تھا۔

مولانا داؤد اکبر اصلاحی کو یہ اولیت حاصل ہے کہ انھوں نے نہایت پرزور دلائل کی بنیاد پر جمہور کی اس عام اور مروج تفسیر سے اختلاف کیا۔ ان کا کہنا ہے کہ ان دونوں آیتوں میں مخاطب اہل ایمان نہیں بلکہ یہود ہیں جو غزوۂ بدر کی شکست کے بعد مسلمانوں پر یہ الزام تراشی کرتے تھے کہ یہ نبی رحمت کا داعی بنتا ہے مگر اس نے بدر میں خون بہایا اور قیدیوں سے فدیہ لیا۔ چنانچہ ان دونوں آیتوں میں انہیں کو مخاطب کر کے ان کے غلط پروپیگنڈہ کا جواب دیا گیا۔ وہ لکھتے ہیں: ''ہمارے نزدیک یہ آیات چند در چند سوالات کے جواب میں واقع ہیں۔''

مولانا داؤد اکبر اصلاحی کے نزدیک ان آیتوں میں ظاہراً خطاب تو کفار سے ہے مگر اصل

ڈانٹ یہودیوں پر ہے، جو اس قسم کی افترا پردازیاں پھیلانے کا آغاز کرتے تھے، انہوں نے جمہور کی تفسیر سے اپنے اختلاف کی وجہ بھی بیان کی ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

''اگر عتاب قتل نہ کرنے پر ہوا جیسا کہ سلف میں سے بعض بزرگوں کا خیال ہے تو اس کے یہ معنیٰ ہیں کہ مذہب اسلام جس کے متعلق یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ وہ سارے عالم کے لیے رحمت بن کر آیا ہے کچھ غلط سا ہے اور مخالفین کا یہ نظریہ قوی ہے کہ جب تک اسلام مکہ میں کسمپرسی کے عالم میں تھا، اس وقت تو وہ دبا رہا لیکن مدینہ میں آتے ہی جب ذرا اسے طاقت حاصل ہوئی تو اس نے ظلم وستم کا بازار گرم کر دیا۔ بالخصوص بدر کی لڑائی میں تو اسلام کی کتاب میں اسیران بدر کے لیے رہائی کی صورت ہی نہ تھی۔''

مولانا داؤد اکبر اصلاحیؒ نے ان روایتوں سے بھی تعرض کیا ہے جن کو جمہور اپنے موقف کی تائید میں پیش کرتے ہیں۔ ان کی تحقیق کے مطابق روایت کا وہ حصہ جس میں آنحضرت ﷺ اور حضرت ابوبکرؓ کے رو پڑنے اور مثالی عذاب کا ذکر ہے از روئے روایت مستند نہیں ہے۔ چنانچہ انہوں نے اس سلسلہ میں علامہ ابن حزم کی تصریح نقل کی ہے۔ نیز محدثین کے اصول نقل و عقل کی قدرے وضاحت کرتے ہوئے انھوں نے ان روایات کو عقلاً بھی غیر مستند ثابت کیا ہے۔

مولانا داؤد اکبر اصلاحیؒ نے محض اپنے قائم کردہ اشکال کی بنا پر یہ تفسیر اختیار نہیں کی ہے بلکہ انہوں نے دونوں آیتوں کے الفاظ کی لغوی تحقیق پیش کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ آیتوں کے الفاظ بھی ان کی توجیہ کی تائید کرتے ہیں، چنانچہ انہوں نے اپنی تحقیق کی اساس درج ذیل چار کلمات کو بنایا ہے۔

(۱) حتی یثخن (۲) تریدون عرض الدنیا (۳) کتاب (۴) فیما اخذتم

حتی یثخن میں لفظ حتی کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ یہ لفظ اس آیت میں ترقی کے مفہوم پر مشتمل ہے اور اس کی نظیر بھی انہوں نے کلام عرب سے پیش کی ہے۔

تریدون عرض الدنیا کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ اس میں بظاہر کفار سے خطاب ہے مگر در پردہ یہود مراد ہیں اس لیے کہ دنیا میں جتنی قومیں بستی ہیں ان میں سب سے زیادہ دنیا پرست یہود قوم ہیں۔

لفظ کتاب کا مفہوم انہوں نے اس موقع پر سنت اللہ یا قانون الٰہی کو بتایا ہے اور اس کی نظیر

بھی قرآن مجید سے پیش کی ہے۔

اخذتم کا مفہوم عام طور پر مفسرین نے فدیہ لینا بتایا ہے مگر وہ اس کو اس آیت میں اختیار کرنے پر مشتمل بتاتے ہیں اور لسان العرب سے اس مفہوم کی تائید بھی نقل کرتے ہیں۔

اس تحقیق کی روشنی میں مولانا داؤد اکبر اصلاحیؒ نے ان دونوں آیتوں کا مفہوم یہ بتایا ہے کہ کوئی نبی اس بات کا روادار نہیں ہوتا کہ قیدی بنائے، خوں ریزی تو دور کی بات ہے، یہ تو تم یہودیوں کی سرشت ہے کہ حب مال کے لیے غارت گری کرتے ہو، اللہ اور اس کے رسول کے پیش نظر محض آخرت ہوتی ہے، اگر نوشتہ تقدیر پہلے سے لکھا ہوا نہ ہوتا تو تمہاری اس حرکت پر تم کو بڑا عذاب آلیتا پھر آگے اہل ایمان کو تسلی دی گئی ہے کہ تم ان کے پروپیگنڈوں سے متاثر مت ہو بلکہ خوشی خوشی مال غنیمت کو استعمال کرو۔

مولانا داؤد اکبر اصلاحی کی یہ نادر تحقیق پہلی مرتبہ ماہنامہ ترجمان القرآن (حیدرآباد، ج ۹، دسمبر ۱۹۳۶ء) میں شائع ہوئی۔ چونکہ یہ بالکل ایک نئی اور انوکھی رائے تھی اور مدرسۃ الاصلاح کے ایک جواں سال استاد کی کاوش تھی، اس لیے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے اس مضمون پر اپنا اختلافی نوٹ بھی تحریر کیا جس میں جمہور کے موقف کی حمایت کی مگر مولانا داؤد اکبر اصلاحی نے یہ رائے نہایت محکم دلائل کی بنیاد پر قائم کی تھی، چنانچہ انہوں نے دوبارہ اپنے دلائل کو مرتب کر کے ترجمان القرآن میں اشاعت کے لیے بھیجا جو جلد۱۰ عدد۶، اگست ۱۹۳۷ء میں شائع ہوا۔ تاہم مولانا مودودیؒ اپنے موقف ہی پر مصر رہے۔ اول تو مولانا مودودیؒ نے جمہور کی تفسیر میں کسی قباحت سے انکار کیا۔ چنانچہ مولانا داؤد اکبر اصلاحی کو مخاطب کر کے لکھا کہ:

”قبل اس کے کہ آپ اس مفہوم کو چھوڑ کر کوئی دخل مقدر فرض کریں آپ کو یہ ثابت کرنا چاہیے کہ اس متبادر مفہوم میں فی الواقع کوئی قباحت ہے، آپ جو قباحت بیان کرتے ہیں ہم کو اس کے قباحت ہونے میں کلام ہے۔“

دوسرے انہوں نے اگر قباحت کو کسی حد تک تسلیم بھی کیا ہے تو اس کو یہ کہہ کر رد کرنے کی کوشش کی ہے:

”یہ تمام شبہات جو فاضل مضمون نگار نے بیان کیے ہیں انیسویں صدی عیسوی میں پیدا ہوئے ہیں چھٹی صدی عیسوی کے کسی یہودی کے دل میں پیدا نہیں ہوسکتے تھے۔“

مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ جمہور کی اس پر جوش حمایت کے باوجود مولانا مودودیؒ نے عتاب کے عموم سے رسول اکرم ﷺ کی ذات گرامی کو الگ کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ لکھتے ہیں:

”اس سلسلہ میں ایک اور بات سمجھ لیجیے کہ نبی ﷺ کو جس بات پر تنبیہ کی گئی ہے وہ صرف پہلے فقرے میں بیان ہوئی ہے یعنی آپ کو صرف اس بات پر متنبہ کیا گیا ہے کہ اے نبی ہم نے اثخان فی الارض کی شرط جو لگائی تھی اس کو تم نے پورا نہیں کیا اور اس کو کیے بغیر قیدی پکڑ بھی لیے اور ان سے فدیہ بھی قبول کر لیا۔ اس کے بعد دوسرے فقرے میں عام مجاہدین کو چشم نمائی کی گئی ہے کہ تم ہماری ہدایت کے خلاف غنیمت پر کیوں جھک پڑے حالانکہ تم کو سمجھا دیا تھا کہ تمہاری جنگ دنیا کے لیے نہیں بلکہ آخرت کے لیے ہے۔ اس فقرہ میں صیغہ جمع کے ساتھ خطاب کیا گیا ہے، لہٰذا اس کے مخاطب نبی ﷺ نہیں بلکہ مسلمان ہیں اور یہ شبہ کرنے کی گنجائش نہیں رہتی کہ اس سے حضور ﷺ پر دنیا طلبی کا الزام آتا ہے۔“

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے اس توجیہ کے ذریعہ بظاہر آنحضرت ﷺ کی ذات گرامی کو دنیا طلبی کے الزام سے بری قرار دینے کی کوشش کی ہے مگر محل غور یہ بات ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق اور تمام شرکائے بدر اس تاویل کے مطابق کس مقام پر کھڑے نظر آتے ہیں، شاید مولانا کی نظر اس طرف نہیں گئی۔

مولانا مودودیؒ کو دو باتوں کی بنا پر اپنے موقف پر شدت سے اصرار تھا۔ (۱) سلسلہ کلام میں تبدیلی خطاب کی گنجائش نہیں ہے۔ (۲) اثخان سے پہلے قیدی بنانا اور فدیہ لینا منشاء الٰہی کے خلاف ہے۔

مولانا امین احسن اصلاحیؒ مصنف 'تدبر قرآن' نے نہ صرف یہ کہ مولانا داؤد اکبر اصلاحیؒ کے اس نقطۂ نظر کی مکمل تائید کی ہے بلکہ مولانا مودودیؒ کے ان دونوں شبہات کو رفع کر دیا ہے۔ تبدیلی خطاب کے ضمن میں وہ لکھتے ہیں:

”قرآن میں خطاب کا انداز جیسا کہ ہم بار بار واضح بھی کر چکے ہیں بالکل اسی طرح کا ہوتا ہے جو ایک اعلیٰ خطیب تقریر میں اختیار کرتا ہے، جتنی پارٹیاں سامنے ہوتی ہیں بیک وقت سب کی طرف رخ بدل بدل کر ان کے ذہن کے لحاظ سے بات کہتا چلا جاتا ہے، خود بات ہی واضح کر دیتی ہے کہ مخاطب کون ہے اور اس

کے کس شبہ یا اعتراض کا جواب دیا گیا ہے۔ یہاں بھی یہی صورت ہے۔''

مولانا مودودیؒ کا دوسرا اشکال یہ تھا اثخان کی شرط بدر میں پوری نہیں ہوئی تھی اس لیے عتاب کا جواز موجود ہے، اس پر مولانا امین احسن اصلاحیؒ کا تبصرہ بہت برمحل ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''جہاں تک خوں ریزی کا تعلق ہے اس کے اعتبار سے بھی بدر میں کوئی کسر نہیں رہ گئی تھی، قریش کے ستر آدمی جن میں بڑے بڑے سردار بھی تھے مارے گئے۔ کم و بیش اتنے ہی قید ہوئے، باقی فوج بھاگ کھڑی ہوئی تو آخر لڑائی کس سے جاری رکھی جاتی۔''

مولانا امین احسن اصلاحیؒ نے مولانا داؤد اکبر اصلاحیؒ کے دلائل میں بعض اہم اضافے بھی کیے ہیں جن میں یہ دلیل خاص طور پر اہمیت کی حامل ہے۔ لکھتے ہیں:

''ماکان : ماکان کا اسلوب بیان الزام اور رفع الزام دونوں کے لیے آسکتا ہے اور قرآن میں دونوں ہی قسم کے مواقع میں یہ اسلوب استعمال ہوا ہے ...... بعینہ یہی اسلوب بیان آل عمران ۱۶۱ میں 'ماکان لنبی ان یغل و من یغلل یات بما غل یوم القیامة' میں ہے ظاہر ہے کہ یہ الزام کے لیے نہیں بلکہ رفع الزام اور نبی کی تنزیہ شان کے لیے ہے۔ ٹھیک اسی اسلوب میں زیر بحث میں قریش کی تردید کی گئی ہے۔'' (تفسیر تدبر قرآن: ج ۳/ص ۵۱۱، تاج کمپنی لاہور)

۲-**واذ یعدکم الله احدی الطائفتین** کی تاویل

غزوۂ بدر کے ذکر میں جملہ مؤرخین اور سیرت نگار اس بات پر متفق ہیں کہ رسول اللہ ابتداءً قریش کے کاروان تجارت پر حملہ کرنے کے لیے نکلے تھے مگر دو چار منزل چل کر یہ معلوم ہوا کہ قریش کی فوجیں آرہی ہیں، چنانچہ بدر کے مقام پر مسلمانوں کا ان سے مقابلہ ہوا۔ تمام سیرت نگاروں میں صرف علامہ شبلی نعمانی اس رائے سے متفق نہیں ہیں۔ انہوں نے اپنی مایہ ناز تصنیف 'سیرۃ النبیؐ' میں اس کی تردید کرتے ہوئے قرآن مجید کے انداز بیان اور احادیث صحیحہ کی روشنی میں یہ ثابت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو مدینہ منورہ میں ہی لشکر قریش کی اطلاع مل چکی تھی جو اصلاً مدینہ منورہ پر حملہ کی غرض سے آرہا تھا اور آنحضرت ﷺ مدینہ منورہ سے اسی کے دفاع کے لیے نکلے تھے مگر اس ضمن میں سورہ انفال کی درج ذیل آیت جس میں قافلہ قریش اور جنگی لشکر دونوں میں سے کسی ایک کے ہاتھ لگنے کا ذکر ہے، عام سیرت نگاروں کے موقف کو تقویت پہنچاتی ہے۔ ارشادی باری ہے:

واذ یعدکم الله احدی الطائفتین انها لکم وتودّون أن غیر ذات الشوکة تکون لکم ویرید الله ان یحق الحق بکلماته ویقطع دابر الکافرین (انفال:۷)	اور یاد کرو جبکہ اللہ تم سے دو گروہوں میں سے ایک کا وعدہ کررہا تھا کہ وہ تمہارے ہاتھ لگے گا اور تم یہ چاہ رہے تھے کہ غیر مسلح گروہ تمہارے ہاتھ آئے اور اللہ چاہتا تھا کہ وہ اپنے کلمات سے حق کا بول بالا کردے اور کافروں کی جڑ کاٹے۔

علامہ شبلی نے اس آیت کی تفسیر میں نہایت لطیف نقطہ یہ تحریر فرمایا ہے کہ:

''قرآن مجید کی آیت مذکورہ بالا میں کفار کے دو فریق کا خدا نے بیان کیا ہے، ایک قافلہ تجارت دوسرا صاحب شوکت یعنی کفار قریش جو مکہ سے لڑنے کے لیے آرہے تھے۔ آیت میں تصریح ہے کہ مسلمانوں کی ایک جماعت ایسی تھی جو چاہتی تھی کہ کاروانِ تجارت پر حملہ کیا جائے۔ خدا نے ان لوگوں پر ناراضگی ظاہر فرمایا:

وتودّون أن غیر ذات الشوکة تکون لکم ویرید الله أن یحق الحق بکلماته ویقطع دابر الکافرین.	اور تم یہ چاہ رہے تھے کہ غیر مسلح گروہ تمہارے ہاتھ آئے اور اللہ چاہتا تھا کہ وہ اپنے کلمات سے حق کا بول بالا کردے اور کافروں کی جڑ کاٹے۔

''ایک طرف وہ لوگ ہیں جو قافلہ تجارت پر حملہ کرنا چاہتے ہیں اور دوسری طرف خدا ہے جو چاہتا ہے کہ حق کو قائم کردے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے۔ اب سوال یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ ان دونوں میں سے کس کے ساتھ ہیں؟ عام روایتوں کے مطابق اس سوال کا کیا جواب ہوگا میں اس تصور سے کانپ اٹھتا ہوں۔''

فکر فراہی کے ترجمان مولانا امین احسن اصلاحیؒ نے بھی اپنی تفسیر ''تدبر قرآن'' میں اسی نقطہ نظر کی تائید کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نکلنا ابتدا ہی سے اللہ تعالیٰ کے حکم کے تحت ایک مقصد حق کے لیے تھا اور وہ مقصد حق یہ تھا کہ دین کا بول بالا ہو اور کفر کی جڑ کٹے، ظاہر ہے کہ کفر کی جڑ کٹ سکتی تھی تو قریش سے جڑ کٹ سکتی تھی نہ کہ اس کے

کسی تجارتی قافلہ کے لوٹ لینے سے۔‘‘

مگر علامہ شبلیؒ اور مولانا امین احسن اصلاحیؒ دونوں ہی بزرگوں کو آیت (واذیعدکم اللہ احدی الطائفتین ......) اور یاد کرو جب اللہ تم سے وعدہ کررہا تھا دو گروہوں میں سے ایک گروہ کا۔کی تاویل و توجیہ میں اضطراب کا کیوں سامنا کرنا پڑا۔مولانا داؤدا کبر اصلاحیؒ نے اس بحث میں ایک اہم اضافہ کرکے ان کے موقف کو غیر معمولی تقویت بہم پہنچائی ہے اور عام سیرت نگاروں کی ایک اہم بنیاد متزلزل کردی ہے۔وہ لکھتے ہیں:

’’ہمارے خیال میں وعدہ خداوندی متعین طور سے لشکر کے ہاتھ لگنے کا تھا اور حسب وعدہ وہی ہاتھ لگا۔‘‘

اس کی ایک اہم دلیل انہوں نے یہ دی کہ دونوں گروہوں میں سے متعین طور سے شوکت والے گروہ کے ہاتھ لگنے کا وعدہ نہ ہوتا تو لوگوں کو ان کے قافلہ تجارت کے لوٹنے کی خواہش پر ان لفظوں میں ملامت نہ کی گئی ہوتی۔’وتودون أن غیر ذات الشوکۃ تکون لکم.....‘ پھر انہوں نے فکر فراہیؒ کے طرز پر لغوی تحقیق کرکے یہ ثابت کیا ہے کہ اس آیت میں لفظ احدی اکائی کے بجائے وصفی معنی میں ہے۔وہ لکھتے ہیں:

’’احدی الطائفتین میں احدی احد کا مؤنث ہے اور لفظ احد اور احدی دونوں جہاں گنتی کے لیے استعمال ہوتے ہیں وہیں وصفی معنی کے طور پر بےنظیر اور نمایاں کے مفہوم میں بھی آتے ہیں۔آیت واذیعدکم اللہ احدی الطائفتین میں یہ لفظ بطور وصف نمایاں کے مفہوم میں ہے اور نحوی ترکیب کے اعتبار سے صفت ہے اور اس کی اضافت موصوف کی جانب ہے۔معنی اس کے یہ ہوں گے ’’یاد کرو جب کہ دونون گروہوں میں سے نمایاں گروہ سے وعدہ الٰہی ہو رہا تھا کہ وہ تمہارے ہاتھ لگے گا۔‘‘

بعض اور مقامات پر بھی یہ لفظ اسی طرح استعمال ہوا ہے۔مثلاً:

وأقسموا بالله جهدا أيمانهم لئن جاء هم نذير ليكونن اهدى من احدى الأمم (فاطر:۴۲)	اور وہ کاٹی کاٹی قسمیں کھاتے ہیں کہ اگر ان کے پاس کوئی ڈرانے والا آیا ہوتا تو وہ راہ یاب ہونے میں نمایاں گروہوں (یہود، نصاریٰ، صابی) سے بڑھ کر ہوں گے۔

دوسرے لفظوں میں اس کا مفہوم یہ ہے کہ مشرکین عرب اپنے کو امی یعنی بے کتاب و رسول والا کہتے تھے، مومنین سے بحث و مباحثہ میں کبھی اس طرح کی بات کہہ ڈالتے کہ ہمارے پاس نہ تو کوئی آسمانی کتاب ہی آئی اور نہ رسول ہی آیا ورنہ راہ یابی میں ہم سبھی سے لانگ جاتے، یہود و نصاریٰ اور صابی جن کی مذہبیت اور دینداری مانی ہوئی ہے ان سے بھی دو ہاتھ آگے نکل جاتے۔دیکھئے سورہ فاطر کی آیت ’’لیکونن اھدی من احدی الأمم‘‘ میں بھی احدی بطور وصف کے نمایاں کے مفہوم میں ہے۔اکائی کی گنتی کے مفہوم میں نہیں ہے۔

مذکورہ بالا دو مثالوں سے بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مولانا داؤدا کبر اصلاحیؒ کی قرآن مجید پر کیسی گہری نظر تھی وہ مولانا حمیدالدین فراہیؒ کے قرآنی مکتب فکر کے ایک ترجمان تھے،ان کے تمام قرآنی مقالات اسی منہج تفسیر کے آئینہ دار ہیں اور بلا مبالغہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کی تحریریں ’’فکر فراہی‘‘ کے وقیع سرمایہ میں اضافہ کا درجہ رکھتی ہیں۔

☆☆☆

أيها الاخوة الأعزة:
أسأل الله لكم رزق مريم
وقصر آسيا و تقوى عائشة
و قلب خديجة و رفقة فاطمة
وجمال يوسف ومال قارون
وحكمة لقمان و ملك سليمان
وصبر أيوب وعدالة عمر
و صدق أبى بكر و حياء عثمان
وشجاعة على وشفاعة محمد ﷺ
(أنيس أحمد المدنى)

مولانا داؤد اکبر بھوری

مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی ☆

مدرسۃ الاصلاح ایک علمی درسگاہ کی حیثیت سے کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے، اس ادارہ کی بنیاد تو مولانا محمد شفیع نے رکھی لیکن اس کی فکری اساس مولانا حمیدالدین فراہی کے علم وعمل کی مرہونِ منت ہے۔ مولانا فراہیؒ جو خود علم قرآن کے نامور محقق کی حیثیت سے معروف ہیں، انھوں نے جب مدرسۃ الاصلاح کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا تو اپنے ذوق وفکر کے مطابق یہاں قرآن کی تعلیم وتدریس پر بطور خاص زور دیا اور مدرسہ کے باصلاحیت اور ذہین فضلاء کی ایک جماعت کو خود باضابطہ قرآن حکیم کی تعلیم دی۔ جنھوں نے مولانا فراہی کی وفات کے بعد اپنے استاذ محترم کے فکری خطوط کے مطابق خود بھی قرآن فہمی میں اختصاص پیدا کیا اور اپنے پیچھے قرآنی علوم سے دلچسپی رکھنے والوں کی ایک کھیپ چھوڑی۔ انھیں میں ایک امتیازی شان کے حامل مولانا داؤد اکبر بھوری اصلاحی مرحوم بھی ہیں۔

مولانا داؤد اکبر ضلع اعظم گڑھ کے ایک معروف موضع 'بھور' میں ۱۹۱۵ء مطابق ۱۳۳۴ھ کے حدود میں پیدا ہوئے، مولانا کے والد ماجد کا نام محمد حسن تھا۔ جو قرآن مجید کے جید حافظ تھے اور قرآن کی تلاوت سے انھیں اس قدر شغف تھا کہ راستہ چلتے بھی بہ آواز بلند تلاوت کرتے جاتے تھے، حافظ محمد حسن مرحوم کا آبائی وطن آنوک ضلع اعظم گڑھ تھا۔ جہاں سے وہ بچپن ہی میں ترک سکونت کرکے بھور اپنے نانیہال میں رہنے لگے تھے جو بعد میں ان کا اور ان کی اولاد کا وطن ہوگیا۔

مولانا کی ابتدائی تعلیم گھر اور گاؤں میں ہوئی، کچھ شدبد ہوجانے کے بعد تقریباً نو برس کی عمر میں مدرسۃ الاصلاح میں داخل ہوئے۔ جہاں ان کے خاندانی چچا مولانا شبلی متکلم بحیثیت مدرس اعلیٰ تدریسی خدمت انجام دے رہے تھے، سن داخلہ تقریباً ۱۹۲۴ء مطابق ۱۳۴۳ھ ہے۔ مولانا

☆استاذ حدیث، دارالعلوم دیوبند

موصوف نے مکتب اور عربی درجات کی مکمل تعلیم اسی ایک مدرسہ میں حاصل کرکے ۱۹۳۵ء مطابق ۱۳۵۴ھ میں فارغ التحصیل ہوگئے۔ یہاں انھوں نے جن اساتذہ سے کسب فیض کیا ان میں چند مشہور شخصیتیں یہ ہیں:

مولانا محمد شبلی متکلم بھوری، مولانا اختر احسن اصلاحی، مولانا محمد سعید ندوی، مولانا نجم الدین اصلاحی، مولانا عبدالرحمٰن نگرامی اور مولانا امین احسن اصلاحی رحمہم اللہ۔ مولانا داؤد اکبر مرحوم نے گیارہ سالہ یہ طالب علمی کا زمانہ بڑی سادگی اور کفایت شعاری کے ساتھ گزارا۔ اس طویل مدت میں صرف دس بارہ مرتبہ ہی بازار گئے۔ تعلیم وتحصیل میں انہماک اور مزاج کی یک سوئی نے انھیں کسی اور طرف متوجہ ہونے کی فرصت ہی نہیں دی۔

مولانا مرحوم نے جس دلچسپی، انہماک اور یکسوئی کے ساتھ تعلیم حاصل کی تھی، اسی کے ساتھ قدرت کی طرف سے ذہن رسا اور قلب اخاذ ملا تھا۔ جس کے لازمی نتیجہ کے طور پر ان کی علمی استعداد نہایت پختہ اور معلومات کا ذخیرہ بہت وسیع تھا۔ ظاہر ہے مدرسۃ الاصلاح اپنے اس جوہر قابل کا سب سے اولین حقدار تھا، اس لیے ۱۹۳۶ء مطابق ۱۳۵۵ھ میں یک سالہ وقفہ کے بعد آپ پھر اپنی مادر علمی کی آغوش میں پہنچ گئے۔ البتہ پہلے ایک متعلم کی حیثیت سے وہاں قیام تھا اور اب معلم ومدرس تھے۔ تقریباً چھ سال تدریسی خدمات انجام دیکر ۱۹۴۲ء مطابق ۱۳۶۱ھ میں یہاں سے علاحدہ ہوگئے۔ مدرسۃ الاصلاح سے الگ ہوجانے کے بعد جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور آگئے اور تقریباً سات آٹھ برس یہاں ادب وتفسیر کا درس دیا۔ یہاں سے پھر دوبارہ ۱۹۴۹ء مطابق ۱۳۶۹ھ میں مدرسۃ الاصلاح آگئے اور قرآن مقدس کے استاذ کی حیثیت سے مسند تدریس وتحقیق کو زینت بخشی۔ یہ سلسلہ عرصۂ دراز تک جاری رہا۔ ۱۹۷۰ء مطابق ۱۳۹۰ھ میں دوبارہ پھر 'مدرسۃ الاصلاح' کو خیر باد کہا۔ اس مرتبہ اعظم گڑھ کے بجائے انھوں نے اپنی علمی سرگرمیوں کا مرکز ضلع جونپور کے ایک تعلیمی ادارہ 'مولانا آزاد تعلیمی مرکز اسرہٹہ' کو بنایا، جو شاہ گنج سجھوت میں چند میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ مولانا مرحوم نے یہاں ۱۹۷۷ء مطابق ۱۳۹۸ھ تک تدریسی خدمات انجام دی۔ پھر یہاں سے سبکدوش ہوکر وطن آگئے اور چند سال گھر پر ہی مقیم رہے۔ اس دوران شہر اعظم گڑھ کی مشہور درسگاہ 'جامعۃ الرشاد' کی طرف سے مولانا کو تدریس کی پیشکش ہوئی، جسے قبول نہیں کیا۔

اسی زمانہ میں جب جامعۃ الفلاح بلریا گنج کے استاذ تفسیر مولانا جلیل احسن ندوی فاضل دیوبند کا سانحہ ارتحال پیش آیا تو جامعہ کے اس وقت کے ناظم نے بحیثیت استاذ تفسیر جامعۃ الفلاح

میں آنے کی دعوت دی تو جامعہ کی ضرورت اور قرآن کی خدمت کے پیش نظر یہ دعوت قبول کر لی اور ۱۹۸۱ء مطابق ۱۴۰۲ھ سے وہاں درس قرآن کا زریں سلسلہ جاری کر دیا۔

مگر مولانا موصوف کو یہاں تدریس کا موقع اور مقامات کی بہ نسبت کم ملا، ابھی مشکل سے سال ڈیڑھ سال کا زمانہ گزرا تھا کہ جامعۃ الفلاح سے گھر جاتے ہوئے راستہ ہی میں ان پر دماغی فالج کا حملہ ہوا۔ کچھ وقفہ کے بعد دوبارہ شدید حملہ ہوا جس صدمہ سے بالکل نڈھال ہو گئے اور چند یوم بستر علالت پر گزار کر ۴؍فروری ۱۹۸۳ء مطابق ۱۴۰۴ھ کو کتاب الٰہی کا یہ خادم اللہ کی رحمت و رضوان کی آغوش میں پہنچ گیا۔

نماز جنازہ ان کے قدیم ساتھی اور رفیق درس مولانا اظہار الدین اصلاحی نے پڑھائی اور تدفین آبائی قبرستان بمھور میں عمل میں آئی۔ مولانا مرحوم کے پسماندگان میں ایک بیٹے مولوی اشہد ہیں اور ایک بیٹی تھیں جو ہمارے محبّ قدیم مولانا محمد مستقیم اعظمی فاضل دیوبند، حال صدر جمعیۃ علماء صوبہ مہاراشٹر سے منسوب تھیں، تقریباً ڈھائی تین سال ہو رہے ہیں کہ وہ بھی اپنے ابا جان کے پاس پہنچ گئیں۔

مولانا داؤد اکبر نے اپنی عمر عزیز کا بیشتر حصہ کلام الٰہی کے پڑھنے پڑھانے اور اس کے تفسیری نکات کے فہم و تفہیم میں گزارا۔ مولانا مرحوم قرآن حکیم کے بلند پایہ عالم تھے، ان کا مطالعہ قرآن بڑا وسیع و عمیق تھا، آیات کے ترجمے نہایت عمدہ اور ادبی اسلوب میں کرتے تھے، قرآن عزیز کے مشکل مقامات اور اہم اسالیب کی توضیح و تشریح کے لیے ڈیڑھ درجن سے زائد علمی و تحقیقی مقالات و مضامین تحریر کیے جو معیاری و اہم مجلّات میں شائع ہوئے اور اوساط علمیہ میں تحسین اور پسندیدگی کی نگاہوں سے دیکھے گئے۔ ان کے علاوہ 'مشکلات القرآن' اور 'قرآن مجید کا چیلنج' کے نام سے دو کتابیں بھی تصنیف کیں جو اپنے صفحات کے اعتبار سے گو مختصر ہیں مگر اپنے علمی و تحقیقی مواد کے لحاظ سے بہت سی ضخیم کتابوں پر بھاری ہیں۔ مولانا مرحوم کی یہ دونوں کتابیں عرصہ سے نایاب تھیں، مقام شکر ہے کہ ان کے لائق و فائق نواسے ڈاکٹر محمد عارف عمری ولد مولانا محمد مستقیم اعظمی نے ان دونون کتابوں کے ساتھ 'ماہنامہ الاصلاح سرائے میر' میں شائع قرآن مجید سے متعلق مقالات نیز ان کے متروکہ قابل انتفاع مسودات کو یکجا کر کے 'مولانا داؤد اکبر کے قرآنی مقالات' کے نام سے ۲۰۰۷ء میں شائع کر دیا ہے، ان خالص علمی و تحقیقی مضامین قیمہ کی اشاعت پر وہ علمی حلقوں کی جانب سے بجا طور پر مستحق شکریہ ہیں۔

مولانا اگرچہ رسمی طور پر سلسلۂ سلوک سے وابستہ نہیں تھے مگر ان کی پوری زندگی اسلامی تصوف کا مرقع تھی، وہ بالکل سادہ مزاج تھے، لباس معمولی اور اپنے ہاتھ سے ڈھل کر پہنتے تھے۔ جمعہ کی تیاری جمعرات ہی سے شروع کر دیتے تھے، وہ پاک طینت، خوش اخلاق، قناعت پسند اور تسلیم و رضا کے خوگر تھے۔ بزرگوں کا اعزاز و اکرام اور خردوں کے ساتھ شفقت و عنایت ان کی عادت ثانیہ تھی۔

اپنی مفوضہ ذمہ داریوں کا ہمیشہ پاس و لحاظ رکھتے تھے، اہل حقوق کے حق کی ادائیگی میں ہمیشہ چاک و چوبند رہے عملاً حنفی تھے مگر روادار ایسے کہ سب لوگ ان سے خوش اور راضی تھے۔ غرض مولانا اسلامی طرز حیات کے نمونہ تھے۔ ایسے نمونے اب کم سے کم تر ہوتے جا رہے ہیں۔

کہیں سے آب بقائے دوام لا ساقی

(انجمن طلبہ مدرسۃ الاصلاح کا سالانہ مجلّہ شمارہ ۹، ۱۹۹۶ء مرحوم اصلاحی شخصیات نمبر)

☆☆☆

قیام ۲۰۰۶ء
بانی: ساجد نیاز
.ncool.jpg not found.
محسنہ پبلک اسکول
انگلش میڈیم (سی. بی. ایس. ای. بورڈ)
پتہ: بلریا گنج، اعظم گڑھ، یوپی پن کوڈ: ۲۷۶۱۲۱
منیجر: ساجد نیاز موبائل نمبر: ۹۹۳۶۹۳۹۲۹۸
MOHSINA PUBLIC SCHOOL
English Medium, C.B.S.E. Board
Bilariyaganj, Azamgarh (U.P.) 276121
Founder & Manager: **Sajid Niyaz**

مولانا نور محمد فلاحیؒ

آفتاب عالم فلاحی☆

نام :نور محمد

نسب :نور محمد بن عبدالجبار ابن تفضّل حسین بن شجاعت علی خان

والد کا نام :حاجی عبدالجبار صاحب

والدہ کا نام :زہرہ خاتون

تاریخ پیدائش :۱۰رستمبر۱۹۵۲ء

وطن :زمین رسول پور، اعظم گڑھ، یوپی

نانیہال :نتھوپٹی، چاند پٹی، اعظم گڑھ

مستقل سکونت :زمین رسول پور

عارضی سکونت :بلریا گنج، اعظم گڑھ

تعلیم :ابتدائی تعلیم مدرسۃ النجاح، زمین رسول پور

ثانوی تعلیم اور عالمیت وفضیلت جامعۃ الفلاح، بلریا گنج، اعظم گڑھ

تاریخ داخلہ جامعۃ الفلاح ۱۸/۱/۱۹۶۷م، فراغت ۱۶/۱۲/۱۹۷۰ء

ادیب، ادیب ماہر، ادیب کامل جامعہ اردو علی گڑھ

بی ایڈ (دورہ تدریبیہ) جامعۃ الملک سعود

شادی :۱۹۷۳ء

تدریسی سفر :مدرسۃ النجاح، زمین رسول پور

جامعۃ الفلاح بلریا گنج، اعظم گڑھ (۱۹۷۵ء-۱۹۹۵ء)

تحریکی سفر :تاحیات جماعت اسلامی کے رکن رہے۔ مقامی جماعت رسول پور

☆پرنسپل مسعود ڈگری کالج، منگراواں، اعظم گڑھ

کی فکری رہنمائی برابر کرتے رہے۔

تصنیفی سفر :'حیات نو' جامعۃ الفلاح کے مدیر مسئول رہے، لیل ونہار ایک عرصہ تک آپ ہی کے قلم سے آتا رہا۔

ذمہ داریاں :امیر مقامی جماعت اسلامی ہند، زمین رسول پور

'حیات نو' جامعۃ الفلاح کے مدیر مسئول

انجمن طلبہ قدیم کے سکریٹری

ممبر مجلس تعلیمی مدرسۃ النجاح، زمین رسول پور (از ۱۹۷۵ء تا وفات)

ممبر مجلس تعلیمی مدرسہ جگدیش پور (از تشکیل تا وفات)

جامعۃ الفلاح کے نگران اعلیٰ

ناظم اعلیٰ جامعۃ الفلاح کی معاونت

سفر عمرہ :۱۹۹۰ء

تاریخ وفات :۱۰رفروری ۲۰۰۰ء (نماز جنازہ جناب مولانا محمد طاہر مدنی صاحب نے پڑھائی)

(پڑھائی) اہم اساتذہ: مولانا جلیل احسن ندوی مرحوم، مولانا شبیر احمد اصلاحی، مولانا عبدالحسیب اصلاحی، مولانا صغیر احسن اصلاحی، مولانا شہباز احمد اصلاحی، مولانا ابوبکر اصلاحی، ماسٹر افضال احمد مشہدی۔

وہ شخصیات جن سے متاثر ہوئے :مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا صدرالدین اصلاحی، مولانا محمد یوسف اصلاحی،

مولانا ابواللیث اصلاحی، مولانا شہباز اصلاحی

اولاد :لڑکے: ۱-آفتاب عالم، ۲-رضوان احمد، ۳-فیضان احمد

لڑکیاں: ۱-بشریٰ بانو، ۲-بشریٰ بانو

(ایک لڑکی بشری اپنے بچپن ہی میں اللہ کو پیاری ہوگئی تھی)

غذا :سرکہ، موٹی روٹی، چٹنی اور شہد۔ (آفتاب عالم)

اہم صفات

محبت اور ملنساری: مرحوم کی یاد کے ساتھ ان کا مسکراتا ہوا، چہرہ نگاہوں کے

سامنے آجاتا ہے۔ وہ تمام لوگوں سے محبت اور خندہ پیشانی سے ملتے تھے اور بڑے ملنسار واقع ہوئے تھے، ان کے روابط بڑے وسیع تھے،، سب کا خیال رکھتے تھے اور تعلقات کو برابر قائم رکھنے کا اہتمام کرتے تھے۔ کوئی سخت بات کہہ دے تو مسکراتے رہتے تھے۔ درحقیقت وہ محبت اور اپنائیت کی بیش قیمت سوغات برابر تقسیم کرتے رہتے تھے، اسی وجہ سے ان کے چاہنے والوں کا دائرہ بڑا وسیع ہے۔

تواضع اور انکساری : تواضع مومن کی پہچان ہے اور اللہ کے رسول نے یہ بشارت دی ہے کہ جو اللہ کے لیے تواضع اختیار کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کو بلند کر دیتا ہے۔ مرحوم کے اندر یہ صفت بدرجہ اتم موجود تھی، انتہائی خاکساری اور انکساری کا پیکر تھے۔ تکبر اور تعلّی سے کوسوں دور تھے۔ اپنے سے چھوٹوں کے ساتھ بھی خاکسارانہ رویہ اپناتے تھے۔ علم وفضل کا گھمنڈ ان کو کبھی نہیں ہوا۔ زیردرس مضامین کے سلسلے میں کوئی اشکال ہوتو بلا تکلف اپنے خوردوں سے بھی رجوع کر لیتے تھے۔ ایک اچھے مدرس کی یہ امتیازی شان ہے کیونکہ غرور علمی شخصیت کے لیے تباہ کن مرض ہے۔

مشفقانہ تربیت : مرحوم ایک کامیاب مربی تھے۔ طلبہ کے ساتھ بڑا گہرا اور قریبی ربط رکھتے اور بڑی شفقت ومحبت کے ساتھ ان کی تربیت کرتے تھے۔ طلبہ اپنے آپ کو ان سے بہت قریب محسوس کرتے تھے اور بلا تکلف اپنے مسائل ان کے سامنے رکھتے تھے۔ طلبہ کے ساتھ گہری دلچسپی اور ان کے ساتھ مشفقانہ برتاؤں کی وجہ سے وہ طلبہ میں بہت مقبول تھے۔ وہ اپنے درس کی تیاری باقاعدہ کرتے تھے۔ طلبہ کو ہر ممکن طریقہ سے فائدہ پہنچانے کے لیے کوشاں رہتے تھے۔ مطالعہ کا اچھا ذوق تھا۔ ان کی ذاتی لائبریری میں کتابوں کا اچھا کلکشن ہے جس سے طلبہ بھی استفادہ کرتے تھے۔

جذبہ خدمت : مرحوم کے اندر خدمت کا جذبہ بہت نمایاں تھا۔ وہ مخدوم نہیں بلکہ خادم بن کر رہتے تھے اور ارباب مدارس کی عادت مخدومیت سے اللہ تعالیٰ نے انھیں محفوظ رکھا تھا۔ محلّہ اور گاؤں کے لوگوں کی مختلف خدمات ہنسی خوشی انجام دیتے تھے اور سب کے دکھ درد میں شریک ہوتے تھے۔ اسی وجہ سے گاؤں کے لوگ بھی ان کو بہت چاہتے تھے اور کسی شخصیت کے لیے اصل کسوٹی قریبی ماحول ہوتا ہے کیونکہ ''دور کے ڈھول تو سہانے ہوتے ہی ہیں۔''

مرحوم نے جامعہ کی بھی مختلف خدمات کی انجام دہی بہت حسن وخوبی کے ساتھ کی۔ تدریس کے علاوہ جامعہ کے حلقہ تعارف کی توسیع اور مالیات کی فراہمی میں بھرپور حصہ لیتے تھے اور اس کی خاطر ملک کے مختلف مقامات پر سفر کرتے رہتے تھے۔ ان پر بیماری کا شدید حملہ ایک ایسے ہی سفر کے دوران ہوا اور بالآخر ایک طویل علالت کے بعد وہ سب کو سوگوار چھوڑ کر اس دنیا سے کوچ

کر گئے۔ ان کی خدمات کو کبھی بھلایا نہیں جا سکتا۔ ان کا جذبہ خدمت سب کے لیے مہمیز کا سبب بنتا رہے گا۔

تحریکی کارکن : مرحوم جماعت اسلامی ہند کے سرگرم رکن تھے اور بڑی لگن کے ساتھ تحریک کی خدمت انجام دیتے رہے۔ خاص طور سے نوجوانوں میں تحریک کو متعارف کرانے اور اس کے لیے ہمدردی کا جذبہ پیدا کرنے میں ان کا بڑا حصہ ہے۔ وہ اپنی گاؤں کی جماعت کے امیر بھی رہے۔ ان کی امارت میں جماعت کے کام میں توسیع اور استحکام پیدا ہوا۔ ان کی وفات کی وجہ سے مقامی سطح پر جماعت میں ایک خلا پیدا ہو گیا ہے اور کام متاثر ہوا ہے۔ (محمد طاہر مدنی)

☆☆☆

سبق کی ابتداء فن تدریس کی خوبیوں میں سے ایک اہم خوبی ہے۔ یہ ایک اچھے استاد کی خوبی ہے کہ کلاس میں داخل ہوتے ہی طلبہ کو اپنی پرکشش ابتداء کے ذریعہ مکمل طور پر متوجہ کر لے اور سبق اس قدر دلچسپ بنا کر پیش کرے کہ طلبہ ہمہ تن گوش رہیں۔

انہیں خوبیوں کے متصف استاد محترم جناب مناظر الحسن صاحب مرحوم تھے۔ آپ کی ایک ڈانٹ پر پورے کلاس میں سناٹا چھا جاتا اور ایک ہی جملہ میں پورا کلاس کشت زعفران نظر آتا۔

ماسٹر مرحوم کی گھنٹی کے بعد صرف یا انشاء کی گھنٹی ہوا کرتی تھی۔ طلبہ سبقت کے معاملہ میں اپنی کاپیاں جمع کرتے تاکہ میری کاپی پہلے چیک ہو جائے، ایک ہنگامہ سا ہو جاتا۔ ماسٹر صاحب اکثر نظر انداز کر دیتے اور کبھی کاپیاں اٹھا کر پھینک دیتے، جس سے اس بات کا اظہار مقصود ہوتا کہ ہنگامہ نہ ہو۔

درجہ میں داخل ہوتے ہی چاک و ڈسٹر ہاتھ میں لیا اور بورڈ پر لکھنا شروع کر دیا۔ دوران تدریس طلبہ کی یکسوئی وغفلت کی جانچ بھی بڑی خوبی سے کرتے، دوران نوٹس بول پڑتے: گورکھپور کے جنگلوں میں مختلف قسم کی (لڑکیاں) لکڑیاں پائی جاتی ہیں۔ اور ہر ایک طالب علم کی کاپی مانگ دیکھنا شروع کر دیتے کہ کس نے کیا لکھا ہے اور کہاں تک لکھا ہے اور لکھ رہا ہے یا صرف قلم چلا رہا ہے۔ (عبدالرحمٰن خالد)

لب ہر غنچہ پر نوحہ ہے اس کا

انیس احمد مدنی ☆

جامعہ کے مخلص اور بے لوث خادم جناب مولانا نور محمد صاحب فلاحی کے انتقال کی خبر سنتے ہی جامعہ میں ہر طرف سناٹا چھا گیا۔ تعطیل کا اعلان کر دیا گیا اور جملہ اساتذہ و کارکنان اور طلبہ بسوں کے ذریعہ مولانا کے وطن رسول پور پہنچے اور آپ کی نماز جنازہ میں شرکت فرمائی۔ آپ کی نماز جنازہ صدر جامعہ مولانا طاہر مدنی صاحب نے پڑھائی اور وہیں آپ کے آبائی قبرستان میں آپ کو سپرد خاک کر دیا گیا۔ استاد محترم مولانا نور محمد صاحب فلاحی جامعۃ الفلاح کے ان فارغین میں سے ایک تھے جن کی مخلصانہ کوششوں نے جامعہ کو ترقی کی راہ پر گامزن کیا اور جن کی نیک نامی نے جامعہ کو نیک نام بنایا اور خدا ترسی نے تقوی و خدا ترسی کی لہر چلائی۔ فراغت کے بعد کچھ دنوں تک آپ نے چھندوارہ حیدرآباد اور مدرسۃ النجاح رسول پور میں تدریسی فرائض انجام دئے اور پھر جامعہ سے منسلک ہو گئے۔

آپ کا طرز تدریس استخراجی تھا، انداز بیان دلنشیں اور زبان انتہائی سلیس تھی اور سب سے اہم خوبی طلبہ کے تئیں وہ مشفقانہ و پدرانہ جذبات تھے جس سے طلبہ آپ سے بہت جلد مانوس ہو جاتے اور آپ کے ارشادات کی تعمیل میں جان چھڑکتے۔ مبالغہ نہ ہوگا اگر یہ کہا جائے کہ آپ اپنے طلبہ کو وہ پیار دیتے جو بہتوں کو اپنے گھر میں نصیب نہ ہوتا۔ یہی وجہ تھی کہ ابنائے قدیم جامعہ آتے ہی آپ سے ملاقات کی شدید خواہش کا اظہار کرتے۔

مولانا مرحوم کا ہر طالب علم سے لگاؤ اور قلبی تعلق تھا اور آپ کے ہر لگاؤ کی بنیاد اخلاص پر قائم تھی، اس لیے وہ لگاؤ والوں سے ملاقات کرنے ان کے گھر ضرور جاتے۔ وہ ہمارے گھر اکثر و بیشتر آتے اور دیر تک بیٹھ کر میری والدہ (جن کی عمر اسی سال ہے) سے باتیں کرتے رہتے۔ میں جب عربی درجات میں پہنچا تو مولانا میری والدہ کو میری تعلیمی دلچسپی کی روداد سناتے۔

☆ استاذ حدیث وتقابل ادیان، جامعۃ الفلاح، اعظم گڑھ

میری والدہ ان سے کہتیں کہ میرے بیٹے کو مدینہ بھیج دیجئے۔ مولانا پورے وثوق سے کہتے کہ ان شاء اللہ ضرور جائیں گے۔ یہ کہتے وقت مولانا کے چہرے پر اخلاص کا ایسا نور چمکتا ہوا محسوس ہوتا تھا کہ اس کی روشنی میں مجھے بھی دیار نبوی میں اپنے طالب علم ہونے کی سعادت مندی کا احساس ہونے لگتا اور آخر کار اس اخلاص آرزو نے مجھے اس سعادت سے بہرہ مند بھی کر دیا۔ اس واقعہ سے آپ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ مولانا کو اپنے طالب علموں کی علمی و روحانی ترقی کی کتنی فکر رہتی تھی۔

موصوف بڑے ہی ملنسار اور کریمانہ اخلاق کے حامل تھے۔ اپنی زبان و بیان سے کسی کو اذیت نہ پہنچاتے اور اگر یہ کہا جائے کہ آپ "المسلم من سلم المسلمون من لسانه ويده" کے مکمل مصداق تھے تو بے جا نہ ہوگا۔ جامعہ کی تعمیر و ترقی کے لیے آپ کی لگن قابل دید تھی۔ اس کی ہمہ جہتی ترقی اور اس کے فنڈ کی فراہمی میں آپ کے رول کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ جامعہ کی تاریخ جب بھی مرتب کی جائے گی تو اس کے جاں نثاروں اور پروانوں میں آپ کا تذکرہ ضرور شامل رہے گا، ان شاء اللہ۔ جامعہ کے تئیں آپ کے اخلاص کی ایک روشن دلیل انجمن طلبہ قدیم کے پلیٹ فارم سے اس کی تعمیر و ترقی کے لیے ہر ممکن کوشش کرنا ہے۔ مرحوم برابر اس پلیٹ فارم سے جامعہ کو علمی ترقی کے بام عروج تک پہنچانے کے لیے کوشاں رہے۔

مولانا کا رنگ گندمی تھا۔ بھرا ہوا جسم اور میانہ قد تھا۔ بات ٹھہر ٹھہر کر کرتے جیسے فکر کی میزان میں ہر بات کو تول تول کر لب اظہار تک لاتے ہوں۔ غذا اور لباس میں سادگی نمایاں تھی۔ کالر والی قمیص اور بغیر کالر والا کرتا اور تنگ موری پائجامہ اور کپڑے کی ٹوپی عام لباس تھا۔ کبھی کبھی اون والی رامپوری ٹوپی کا بھی استعمال کرتے۔ سردیوں میں زیادہ تر گرم چادر اوڑھے رہتے۔ موسم کے لحاظ سے شیروانی بھی استعمال کرتے۔ خط انتہائی نفیس اور عمدہ تھا۔ مولانا کو تصنیف و تالیف سے بھی دلچسپی تھی۔ تاعمر حیات نو کے مدیر مسئول رہے اور اسے ظاہری اور معنوی ہر اعتبار سے خوب سے خوب تر بنانے کی کوشش میں لگے رہے۔ جامعہ کے لیل و نہار کا کالم ایک عرصہ تک آپ کے ہی قلم کا مرہون منت رہا۔ آغاز شباب ہی سے جماعت اسلامی سے منسلک ہو گئے اور تاعمر استقامت کے جوہر دکھاتے رہے۔ رسول پور کی مقامی جماعت کی تشکیل اور اس کے ارتقاء میں آپ کا اہم رول تھا۔

اللہ رب العزت مرحوم کی مغفرت فرمائے اور آپ کی بشری لغزشوں سے درگذر فرمائے اور جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین یارب العالمین

☆☆☆

مولانا نور محمد فلاحیؒ

ایک پھول، تھا جو سارے گلستاں میں انتخاب

عبدالبر اثری فلاحی☆

جامعۃ الفلاح کے بے لوث خادم، انجمن طلبہ قدیم جامعۃ الفلاح کی جان، حیات نو کے بے بدل مدیر مسئول، طلبہ کے مسیحا، اساتذہ میں ہر دل عزیز، لوگوں کے امین وغم گسار اور میرے محسن و مربی مولانا نور محمد فلاحی صاحب ۱۰ر فروری ۲۰۰۰ء کو اللہ کو پیارے ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون لیکن دل و دماغ کو یقین نہیں آرہا کہ ایسا ہو گیا کیوں کہ مولانا طبعاً ابھی عمر کے اس مرحلے کو نہیں پہنچے تھے کہ دست قضا اچک لے۔ محض ۴۸ سال عمر تھی خصوصاً جنھوں نے مولانا کو شروع سے دیکھا ہے وہ جانتے ہیں کہ مولانا انتہائی صحت مند تھے، بسا اوقات طلبہ اپنی نفسیات کے لحاظ سے حسرت کرتے کہ مولانا کو کوئی عارضہ لاحق نہیں ہوتا تاکہ ہمیں مولانا کے کچھ خالی پیریڈ تفریح کے لیے مل جائیں لیکن اچانک ۱۹۹۶ء میں بیماری کا ایسا شدید حملہ ہوا کہ اس سے جاں بر نہ ہو سکے۔ بمبئی، دہلی وغیرہ کے اہم اسپتالوں میں زیر علاج رہے لیکن وقتی افاقے سے بات آگے نہیں بڑھی۔ عموماً ڈاکٹروں کی تشخیص یہ رہتی کہ دماغ کی کوئی نس سوکھ رہی ہے۔ علاج سے کچھ افاقہ محسوس ہوتا لیکن پھر مرض لوٹ آتا اور یہی سلسلہ آخری وقت تک چلتا رہا حتی کہ آخری لمحات میں مرض نے اور شدت اختیار کر لی تھی اور قوت گویائی جاتی رہی تھی۔ ایسی شدید آزمائش شاید اللہ اپنے بندے کو گناہوں سے دھل کر اپنے پاس بلانا چاہتا تھا تاکہ اپنے حضور پہنچنے پر ''فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی'' کا مژدہ سنائے۔

آپ زمین رسول پور اعظم گڑھ کے رہنے والے تھے۔ ۱۰ر ستمبر ۱۹۵۲ء کو پیدا ہوئے تھے والد کا نام عبدالجبار اور والدہ کا نام زہرہ خاتون ہے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم گاؤں کے مکتب ''مدرسۃ النجاح'' میں حاصل کی تھی جسے گاؤں کی بزرگ شخصیت جناب شمس الحق صاحب نے

☆ ناظم اعلیٰ (چیف ایگزیکیٹو آفیسر)، فیروس ایجوکیشنل فاؤنڈیشن، ممبئی

۱۹۵۵ء میں قائم کیا تھا۔ آپ شروع ہی سے ہونہار طالب علموں میں تھے۔ چنانچہ ایک موقع سے مولانا ابوبکر صاحب اصلاحیؒ جو اس وقت اس علاقہ کے جماعت اسلامی کے ذمہ دار تھے اور مکتب کے پروگرام میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے شریک تھے، نے آپ کو آپ کی امتیازی کامیابی اور بہترین کارکردگی پر اپنا قلم بطور انعام دیا تھا۔ آپ کے ابتدائی اساتذہ میں ماسٹر وکیل احمد صاحب کا نام خاص طور سے ملتا ہے۔ اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے آپ نے جامعۃ الفلاح کا رخ کیا اور اس کے لیے کافی زحمتیں اٹھائیں۔ جامعۃ الفلاح آپ کے گاؤں سے تقریباً آٹھ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے، اس وقت آمدورفت کی سہولیات نہیں تھیں۔ روزانہ سائیکل سے آپ آتے جاتے۔ بسا اوقات پیدل ہی یہ فاصلہ طے کرنا پڑتا۔ ایک دفعہ تو ایسا ہوا کہ فصل تیار تھی لیکن کاٹنے کے لیے مزدور نہیں مل رہے تھے تو آپ کے والد صاحب سیدھے جامعۃ الفلاح پہنچے اور کہا ''اب تمھیں نہیں پڑھنا ہے، چلو گھر چلو کھیتی کا کام کون دیکھے گا'' آپ انتہائی ملول اور دل گرفتہ ہوئے۔ آپ کو پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ چنانچہ مولانا عبدالحسیب صاحب اصلاحی نے ان کے والد صاحب کو سمجھایا کہ ''اگر نور محمد آپ کے گھر اور کھیتی باڑی کا کام بھی کرے اور اسے پورا کرنے کے بعد پڑھنے بھی آیا کرے تو کیا حرج ہے'' بہرحال ان کے والد صاحب کو یہ بات سمجھ میں آگئی اور انھوں نے تعلیم نہیں چھڑوائی۔ مولانا عبدالحسیب صاحب اصلاحی نے خود مولانا نور محمد صاحب کو بھی دلاسہ دیا اور ہر طرح کے تعاون کی یقین دہانی کرائی۔ اس طرح آپ کو گھر اور کھیتی باڑی کا کام بھی دیکھنا اور کرنا پڑتا تھا۔ آنے جانے کی زحمت بھی اٹھانی پڑی تھی اور اسی کے ساتھ تعلیمی سرگرمیاں بھی انجام دینی پڑتی تھیں۔

بہرحال آپ نے صبر و ہمت کے ساتھ تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا اور ۱۹۷۰ء میں جامعۃ الفلاح سے سند فضیلت حاصل کی اور فرسٹ ڈویژن سے کامیاب رہے تھے۔ بعد میں آپ نے جامعہ اردو علی گڑھ سے ادیب اور ادیب ماہر کا امتحان بھی پاس کیا۔ ۲۷/۸/۱۴۰۶ھ تا ۱۷/۱۰/۱۴۰۶ھ مرکزی دارالعلوم جامعہ سلفیہ بنارس میں جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کی جانب سے منعقد ''دورہ تدریبیہ'' (لتعلیم اللغۃ العربیۃ والثقافۃ الاسلامیۃ) میں شریک ہوئے اور امتیازی نمبرات سے کامیابی حاصل کی۔ آپ کو بیرون ملک بھی تعلیمی استفادہ کا موقع ملا۔ چنانچہ جامعۃ الملک سعود الریاض سے ٹیچرس ٹریننگ کورس بھی مکمل کیا تھا جو بالخصوص عجمیوں (لغیر الناطقین بھا) کو عربی سکھانے کی ٹریننگ پر مشتمل تھا اور ۲۴ر ستمبر ۱۹۸۸ء تا ۲۱ر جنوری ۱۹۸۹ء تک چلا تھا۔ جامعۃ الفلاح سے فراغت کے بعد اساتذہ و جامعہ کے ذمہ داران کی ایماء پر تدریسی خدمت انجام دینے کے لیے چھندواڑہ مدھیہ پردیش

تشریف لے گئے لیکن جلد ہی مادر علمی نے اپنے اس سپوت کو اپنی خدمت کے لیے چن لیا اور یکم جنوری ۱۹۷۲ء سے تاحیات اسی سے وابستہ رہے اور مختلف النوع خدمات انجام دیتے رہے۔ حالانکہ اس دوران آپ کو اندرون ملک اور بیرون ملک ہر جگہ سے احباب نے مختلف کاموں کے لیے مختلف پیشکشیں کیں لیکن ہمیشہ آپ نے مادر علمی جامعۃ الفلاح کو ترجیح دیا اور اس کا دامن چھوڑنا کبھی گوارہ نہیں کیا۔ یوں تو آپ بحیثیت استاد تھے لیکن جو بھی خدمت چاہی جاتی کبھی آپ اس سے دریغ نہیں کرتے۔ خواہ وہ جامعہ کے انتظامی امور ہوں یا جامعہ کی سفارت ہو، ہر کام کے لیے ہمہ آن تیار رہتے۔ اندرون ملک اور بیرون ملک نہ جانے اس سلسلے میں آپ نے کتنے سفر کیے اور کتنی زحمتیں اٹھائیں۔ جامعہ پر جب بھی براوقت آتا بے چین ہو جاتے۔ بعض سنگین مواقع پر تو خود میں نے گھنٹوں آنسو بہاتے دیکھا ہے۔ مولانا کے اس خلوص کو ہر ایک محسوس کرتا تھا۔ چنانچہ باہم گفتگو کے دوران ایک موقع سے جامعہ کے ایک قدیم استاد نے ایک دوسرے استاد سے دریافت کیا کہ ''جامعہ میں سب سے مخلص استاد کون ہے؟'' تو ان کا برجستہ جواب تھا کہ ''مولانا نور محمد صاحب فلاحی''۔

آپ نے جامعہ میں ابتدائی درجات سے تدریسی خدمات کا آغاز کیا تھا لیکن جلد ہی شعبہ اعلیٰ میں منتقل کر دیے گئے تھے۔ عربی ادب و انشاء آپ کا خصوصی مضمون تھا۔ گرچہ قرآن مجید وغیرہ بھی آپ کے زیر درس رہا ''کلیلہ ودمنہ'' اس مہارت سے آپ پڑھاتے تھے کہ اس کی نظیر مشکل ہی سے مل سکے گی۔ طلبہ کو جب تک اطمینان نہ ہوتا آپ درس ہرگز آگے نہیں بڑھاتے تھے۔ فاضل اوقات میں کبھی درس دینا چاہتے تھے تو طلبہ فوراً تیار ہو جاتے، طلبہ آپ کے حسن سلوک سے اس قدر متاثر ہوتے تھے کہ آپ کا گرویدہ ہوئے بغیر نہ رہ پاتے۔ قابل رشک حد تک آپ طلبہ کے درمیان محبوب اور چہیتے تھے۔ خواہ ذہین اور محنتی طلبہ ہوں یا کمزور اور شرارتی طلبہ ہر ایک آپ کا یکساں احترام کرتا۔ آپ کو یہ محبوبیت اور ہر دل عزیزی یوں ہی نہیں حاصل تھی۔ بلکہ جہاں طلبہ آپ کے خلوص اور محنت سے متاثر ہوتے وہیں آپ کی شفقت اور طلبہ کی ضروریات کا خیال اور امداد و تعاون بھی اپنا رنگ دکھاتا۔

☆☆☆

مولانا مفتی عبدالرؤف منصف مبارک پوری

مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی☆

مولانا عبدالرؤف منصف بن محمد یوسف بن امین الدین بن شکر اللہ مبارک پوری اپنے ہم عصر علمائے مبارک پور میں اپنی گوناگوں صلاحیتوں کی بنا پر ایک خاص مقام و مرتبہ کے مالک تھے۔

مولانا کی تاریخ ولادت کا علم نہیں ہو سکا۔ جامعہ عربیہ احیاء العلوم کے اساتذہ کے ناموں سے جن سے آپ نے عربی تعلیم کی ابتداء کی تھی یہ اندازہ ہوتا ہے کہ چودھویں صدی کی چوتھی دہائی کے حدود میں آپ کی پیدائش ہوئی ہوگی۔ واللہ اعلم بالصواب

مولانا منصف مرحوم کی علمی نشو و نما جامعہ عربیہ احیاء العلوم میں ہوئی۔ جامعہ ہی کی علمی و دینی فضاؤں میں آپ پروان چڑھے، ابتدائی عربی سے متوسطات تک کی ساری کتابیں یہیں پڑھی، تعلیم کا یہی زمانہ درحقیقت استعداد سازی کا ہوتا ہے۔ اس وقت جامعہ کے اساتذہ میں مولانا مفتی محمد یٰسین صاحب، مولانا بشیر احمد صاحب اور مولانا عبدالجبار معروفی صاحب وغیرہ جیسے ماہر فنون علماء مسند تدریس پر متمکن تھے۔ مولانا منصف نے انھیں باکمال اساتذہ سے کسب فیض کیا۔

پھر اعلیٰ تعلیم کے لیے دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ پہنچے اور داخلہ لے کر پڑھنا شروع کر دیا، ابھی ندوہ میں قیام کو چند ماہ ہی گذرے تھے کہ شدید علالت میں مبتلا ہو گئے۔ ناچار لکھنؤ سے رخت سفر باندھ کر گھر واپس آ گئے، بیماری کے اس عرصہ میں تعلیمی سلسلہ موقوف رہا، مہینوں کے بعد جب مرض نے پیچھا چھوڑا اور آپ پورے طور پر صحت یاب ہو گئے تو تعلیمی سلسلہ کو آگے بڑھانے کے لیے کسی قریبی مدرسہ میں داخلہ لینے کے بجائے سہارن پور کے لیے سامانِ سفر درست کیا اور دارالعلوم دیوبند پہنچ کر وہیں داخلہ لیا۔ اس وقت آپ کے خاص وطن کے قاری انوار الحق مرحوم اور قرب وجوار کے کچھ دیگر شناسا طلبہ بھی زیر تعلیم تھے۔ اس لیے اس نئی جگہ میں اجنبیت محسوس نہیں ہوئی اور پوری

☆استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند

دلجمعی کے ساتھ پڑھنا شروع کردیا تا آنکہ ۱۳۶۹ھ مطابق ۱۹۴۹ء کے حدود میں دورۂ حدیث پڑھ کر دارالعلوم دیوبند سے سند فضیلت حاصل کی۔ کتب حدیث کے اساتذہ میں حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی، حضرت شیخ الادب مولانا اعزاز علی امروہوی، حضرت مولانا علامہ محمد ابراہیم بلیاوی، حضرت مولانا سید فخرالحسن مرادآبادی بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

تعلیم وتحصیل سے فراغت کے بعد اپنے اساتذہ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے خود بھی یہی مشغلہ اپنے لیے منتخب کیا، یوں تو مولانا مرحوم نے متعدد مدارس میں مسند تدریس کو زینت بخشی لیکن فیض العلوم بڑہن گنج ضلع گورکھپور اور جامعۃ الفلاح بلریا گنج ضلع اعظم گڑھ میں اور مدرسوں کی بہ نسبت قیام زیادہ رہا۔ آخرالذکر ادارے میں آپ کے تدریسی زندگی کے ایام سب سے زیادہ گزرے ہیں اور سچ پوچھئے تو اسی کے زمانۂ قیام میں مولانا منصف مرحوم کے کمالات کے جوہر نمایاں ہوئے۔

جامعۃ الفلاح میں بالعموم ان کے زیر درس قدوری، نورالانوار، ہدایہ اولین، بدایۃ المجتہد، سراجی، سنن ابوداؤد وغیرہ کتب حدیث وفقہ رہیں۔ تدریس کے ساتھ آپ سے فتویٰ نویسی کا کام بھی متعلق تھا، اس مدت میں ہزاروں فتوے تحریر کیے، افتاء کا کام گھر پر بھی مستقل طور پر جاری تھا۔

قصبہ مبارک پور کے نوجوان فضلاء اور انکی علمی صلاحیتوں کو منظّم کرنے اور علم و دانش کی لڑی میں پرونے کی غرض سے ایک انجمن نادیۃ الفضلاء کے نام سے مبارک پور میں قائم کی، جس کے خود مولانا مرحوم سرپرست تھے۔ اس تنظیم کی جانب سے ایک دو ماہی مجلّہ 'ندائے فضلاء' کے نام سے نکلتا تھا جو اپنے تحقیقی ومعیاری مضامین کی بنا پر اس علاقے میں بہت مقبول تھا، اس مجلّہ میں مولانا منصف کے منظوم کلام بھی شائع ہوتے تھے۔

مولانا مرحوم عالم دین اور مفتی ہونے کے ساتھ ایک خوش گوشاعر بھی تھے۔ ایک زمانہ میں آپ کے اشعار رسائل وجرائد میں چھپا کرتے تھے، آخر میں مشق سخن کی طرف توجہ بہت کم ہوگئی تھی۔

مولانا مرحوم جامعۃ الفلاح کے آخری دور تدریس میں مدرسہ میں قیام کے بجائے خانگی ضرورت کے تحت شام کو روزانہ گھر چلے آیا کرتے تھے، یہ سلسلہ ایک عرصہ تک جاری رہا۔ آخر میں پیرانہ سالی کی وجہ سے تدریسی سلسلہ کو ختم کردیا تھا اور جامعۃ الفلاح بلریا گنج سے مستعفی ہوکر گھر ہی پر مستقل طور سے رہنے لگے تھے۔

مرحوم کی تعلیم وتربیت علمائے حق کے آغوش میں ہوئی تھی، اس لیے زندگی بھر حق کی

ترجمانی کی۔ ان کی اس حق گوئی و بے باکی کے مقابل دولت وثروت، عہدہ اور منصب جو بھی آیا غبارِ راہ کی طرح فضاؤں میں تحلیل ہوگیا، مولانا بڑے نڈر اور جری تھے، راست گو تھے اور راست گوئی کو پسند کرتے تھے، اپنے چھوٹوں پر بے حد مہربان تھے، ان کی علمی وفکری تعمیر وترقی کے منصوبے اور تدبیریں سوچتے رہتے تھے۔

ان کی عمر کا کارواں جس رفتار سے اپنی منزل کی جانب رواں دواں تھا اسی رفتار سے امراض کا ہجوم بھی بڑھتا رہا۔ دوا علاج سے کبھی افاقہ ہوجاتا تو کبھی امراض کی شدت بڑھ جاتی۔ صحت ومرض کی اس آنکھ مچولی سے بالآخر آپ بالکل نڈھال ہوگئے اور اسی ضعف ناتوانی کی حالت میں ۶/جمادی الاخریٰ ۱۴۳۱ھ مطابق ۲۱/مئی ۲۰۱۰ء یوم جمعہ کو روح جسد خاکی کو چھوڑ کر اپنی آخری منزل کو روانہ ہوگئی۔ دوسرے دن صبح نو بجے نماز جنازہ ادا کی گئی اور اس علم وفن، عقل وفہم اور جہد وعمل کے مجموعہ کو ہمیشہ کے لیے دفن کردیا گیا۔

مولانا مرحوم نے کوئی مستقل تصنیف تو نہیں چھوڑی لیکن ان کے فتاوے اگر جمع کرکے شائع کیے جائیں تو وہ کئی ضخیم جلدوں کو حاوی ہوں گے، اس طرح ان کی غزلوں، نعتوں اور نظموں کو تلاش کرکے اگر مرتب کردیا جائے تو ایک اچھا خاصا دیوان بن جائے گا۔

☆☆☆

یتیم کے ساتھ خیرخواہی

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم:

ان السلام اسم من أسماء الله تعالىٰ وضعه الله فى الأرض، فأفشوا السلام بينكم.

آپ ﷺ نے فرمایا: سلام اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے ایک (صفاتی) نام ہے جسے اللہ تعالیٰ نے زمین پر رکھا ہے، لہٰذا آپس میں سلام کو عام کرو۔

ماسٹر عبدالحکیم صاحب مرحوم

ماسٹر سید عبداللہ صاحب☆

۱۸-۱۰-۲۰۱۲ء

محترم جناب اڈیٹر صاحب

مجلّہ ’حیات نو‘ سہ ماہی
بلریا گنج، اعظم گڑھ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

جامعۃ الفلاح کے جشن طلائی کے موقع پر ’حیات نو‘ کا ’’اساتذہ نمبر‘‘ شائع کرنا نہایت ہی مبارک خیال اور سعید موقع ہے۔ راقم السطور نے بھی اس موقع کو غنیمت جانتے ہوئے جناب (ماسٹر) عبدالحکیم صاحب مرحوم سے اپنی عقیدت کے اظہار کا موقع پالیا۔ میری کچھ معلومات نجی اور کچھ سماعی ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ میری معلومات تاریخی اعتبار سے غلط ہوں مگر میں موصوف کی زندگی کے ان پہلوؤں کو اجاگر کرنا چاہتا ہوں جن سے خود مجھ کو عقیدت تھی۔ میرا یہ مضمون موصوف کے لیے میرا عقیدت نامہ ہے، اسے نہ تو تاریخی دستاویز تصور کیا جائے اور نہ ہی مستند بیان۔

امید ہے کہ آپ میری اس نامکمل کوشش کو اپنے مؤقر جریدہ میں جگہ دے کر مشکور کریں گے۔

والسلام

عبداللہ

۱۸-۱۰-۲۰۱۲ء

☆ انگلش ٹیچر جامعۃ الفلاح، اعظم گڑھ

سرائے میران کا آبائی قصبہ تھا، انھوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ اعظم گڑھ، سرائے میر، علی گڑھ اور بلریا گنج میں گذارا۔ غالباً ۱۹۱۳ء میں پیدا ہوئے تھے۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد شبلی کالج میں بحیثیت استاذ مقرر ہوئے، بی ایڈ ڈپارٹمنٹ سے ۱۹۷۷ء میں ریٹائر ہوئے اور اسی سال گرمیوں کی تعطیل کے بعد ذمہ داروں کے اصرار پر جامعۃ الفلاح میں بحیثیت استاذ خدمات انجام دینے لگے۔ ۱۹۸۱ء میں جامعہ کی خدمت سے مستعفی ہوئے مگر چند ہی مہینوں کے بعد ذمہ داروں کے اصرار پر دوبارہ جامعہ تشریف لائے اور ۱۹۸۳ء میں خرابی صحت کی وجہ سے جامعہ کے طلبہ کو مزید فیض یاب نہ کر سکے اور اپنے آبائی قصبہ سرائے میر چلے گئے۔ ۱۹۶۴ء میں موصوف کو جامعۃ الفلاح کی انتظامیہ کا دائمی رکن چنا گیا تھا۔ ۱۹۸۰ء میں پتھری کے آپریشن کے بعد ان کی صحت ان کا ساتھ نہیں دے رہی تھی لہٰذا ۱۹۸۸ء میں جامعہ کی رکنیت سے الگ ہوگئے۔ موصوف جماعت اسلامی کے رکن اور مولانا محمد احمد صاحب پرتاپ گڈھی مرحوم کے مرید تھے۔ یکم رمضان المبارک ۱۴۱۸ء مطابق ۳۱ دسمبر ۱۹۹۷ء کو موصوف کا انتقال ہوا۔

رنگ سانولی، قد لمبا، درمیانہ بدن اور ایک مشت دو انگشت کی داڑھی تھی۔ چشمہ لگاتے تھے، کرتا، پاجائجامہ، شیروانی، ٹوپی اور پمپ شو پہنا کرتے تھے۔ چہرے پر کبھی کبھی خفیف سی مسکراہٹ بھی نظر آجاتی تھی۔ عام طور سے سنجیدہ اور خیالات میں کھوئے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔ آواز کسی قدر دھیمی تھی۔ ماتھے پر اور آنکھوں میں علم کی چمک محسوس ہوتی تھی۔

موصوف فن تعلیم وتربیت کے استاذ تھے ہی، علم جغرافیہ اور علم سیاسیات پر ان کو عبور حاصل تھا۔ انگریزی بان وقواعد پر قابل رشک مہارت تھی۔ علم نجوم سے ان کو گہری دلچسپی تھی۔ کہا کرتے تھے کہ نظام فلکی قدرت کی صناعی کا بہترین تماشہ ہے۔ اس کے حسن کے آگے شاعر کے تصورات بھی گھٹنے ٹیک دیں گے۔ قرآن کے مطالعہ کے بے حد شائق تھے۔ کثرت مطالعہ کی وجہ سے اللہ نے اتنی صلاحیت دی کہ درس قرآن بھی دیا کرتے تھے۔ درس قرآن دیتے وقت آواز نہایت پرسوز ہوجایا کرتی تھی۔ پرمغز اور خوف آخرت سے بھری تقریریں کرتے تھے۔ بہت ساری حدیثیں زبانی یاد تھیں۔ عربی زبان سیکھنے کا شوق اتنا زیادہ تھا کہ اپنے ہی ایک شاگرد سے کلیلہ ودمنہ پڑھا کرتے تھے۔

عبادت کا بہت زیادہ اہتمام کرتے تھے۔ عموماً اذان ہونے سے پہلے وضو کر کے مسجد جانے کے لیے تیار رہا کرتے تھے۔ نوافل وتسبیحات میں لگے رہتے تھے۔ تہجد کا اہتمام بڑی پابندی سے کرتے تھے۔ اس زمانہ میں میرے علم کے مطابق صرف دو ہی تہجد گذار تھے ایک تو موصوف

اور دوسرے نگراں جنید احمد صاحب مرحوم۔ خوف آخرت کا غلبہ تھا اسی لیے توشۂ آخرت جمع کرتے رہتے تھے۔

اگر چہ موصوف کا رجحان تصوف کی طرف بہت زیادہ تھا مگر دعوتی کام خاص طور سے غیر مسلموں میں بہت لگن اور حکمت کے ساتھ کیا کرتے تھے۔ سرائے میر سے اعظم گڑھ سفر کے دوران ان کے ہاتھوں میں ہندی کے دعوتی کتابچے ہوا کرتے تھے۔ اگر کوئی غیر مسلم نوجوان مل جاتا تو کہتے کہ ذرا اسے پڑھ کر سنائیے مجھے ہندی کم آتی ہے۔ اس طرح کتابچے پڑھاتے پڑھاتے کئی نوجوان متاثر ہوئے اور مشرف بہ اسلام ہوئے۔ ان میں قابل ذکر شخصیت جناب ضیاء الرحمٰن بلریا گنج کی ہے۔ ان کی ہدایت یابی میں جناب حکیم محمد ایوب صاحب مرحوم اور موصوف کا کردار نمایاں رہا تھا۔

موصوف کے ہر کام کا انداز نرالا اور حکمت سے بھرا ہوا ہوتا تھا۔ جامعہ کا ایک مدرس کافی معاشی تنگی میں گذر کر رہا تھا۔ وہ اس کی مدد کرنا چاہتے تھے مگر اس کی غیرت اور حساس فطرت سے بھی وہ واقف تھے۔ ایک دن انھوں نے اس سے کہا کہ 'مطبخ کا کھانا مجھے موافق نہیں محسوس ہو رہا ہے اگر میرے کھانے کا نظم کہیں باہر ہو جاتا تو بہتر تھا۔' اس مدرس نے ان کے کھانے کا نظم اپنے ہی گھر کر دیا۔ ایک ہفتہ بعد انھوں نے اسے ایک لفافہ تھمایا جس میں کم از کم تین ماہ کی فیس خوراک کے بقدر رقم رہی ہوگی۔

وہ خدمت کا کوئی موقع ہاتھ سے نکلنے نہیں دیتے تھے۔ اسی فطرت کے تحت انھوں نے بورڈنگ کے طلبہ کی نگرانی اور تربیت کا کام قبول کر لیا تھا۔ وہ طلبہ سے نہایت نرمی اور شفقت کے ساتھ پیش آتے تھے۔ ان کی نگرانی کے دوران دو اساتذہ نے طلبہ کے ساتھ سختی کی اور ان کو چھڑی سے پیٹا۔ لڑکوں کے جسم پر چھڑی کے نشانات دیکھ کر انھیں سخت صدمہ ہوا۔ وہ طلبہ کو جسمانی سزا دینے کے بالکل قائل نہیں تھے۔ چنانچہ انھوں نے شائستہ احتجاج کے ذریعہ اپنے رنج کا اظہار کیا۔ جسمانی سزا سے متعلق جدید اور قدیم خیالات میں ہلکا سا نظری اختلاف ہوا جس میں موصوف کو مخالفت اور کسی قدر خفت کا سامنا کرنا پڑا جسے انھوں نے نہایت ہی خندہ پیشانی اور شرافت کے ساتھ برداشت کر لیا۔ ان کے صبر کا مشاہدہ دوبار ہوا، ایک مذکورہ موقع پر اور دوسرا جب وہ پتھری کے شدید درد میں مبتلا تھے۔

ان کا تدریس کا انداز بھی نرالا تھا۔ دوران درس تدریجی معلومات فراہم کرتے تھے۔ گہرے علمی نکات اپنے درس کے آخری مرحلہ میں زیر بحث لاتے تھے۔ اس کا فائدہ یہ ہوتا تھا کہ طلبہ

دوران درس کسی طرح کی اکتاہٹ محسوس کیے بغیر ان کی باتوں کو بغور سنتے تھے۔ کمزور طلبہ کو کبھی نظر انداز نہیں کرتے تھے۔ اپنے مشوروں کے ذریعہ ان کی حوصلہ افزائی کرتے رہتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ کسی بھی درس کا صد فی صد نتیجہ حاصل نہیں کیا جا سکتا، دوسری حکمتوں کو بھی آزمانا چاہیے۔ ان کے مطابق استاذ اس چڑیا کی مانند ہوتا ہے جو جگہ جگہ سے دانہ چگ کر اپنے منھ میں ملائم اور قابل ہضم بنا کر اپنے بچوں کے منھ میں ڈالتی ہے۔ انھیں ماسٹر صاحب کہلوانا پسند نہیں تھا۔ شبلی کالج میں اکثر لوگ انھیں 'مولوی صاحب' کہتے تھے۔

متعدد مسجدوں کی تعمیر کے دوران قبلہ کی سمت نکالنے کے کام کو انجام دینے کے لیے ان کی خدمات حاصل کی جاتیں۔ بلریا گنج کی عید گاہ کا قبلہ رخ موصوف کے ذریعہ ہی نکالا ہوا ہے۔ اکثر مسجدوں میں انھیں کا تیار کردہ کتابچہ 'حکیم الاوقات' اوقات الصلوٰۃ کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

جب دنیا میں کسی چیز کو استقلال نصیب نہیں ہے تو انھیں کیسے حاصل ہوتا؟ موصوف اس دنیا میں موجود تو نہیں ہیں مگر لوگوں میں یہ احساس اب بھی باقی ہے کہ وہ علم و عمل کے گنج رواں تھے۔

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

☆☆☆

یتیم کے ساتھ خیر خواہی

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم:

خير بيت فى المسلمين بيتٌ فيه يتيم يحسن اليه، وشر بيت فى المسلمين بيت فيه يتيم يساء اليه. أنا و كافل اليتيم فى الجنة كهاتين (يشير باصبعيه).

آپ ﷺ نے فرمایا: مسلمانوں کا بہترین گھر وہ ہے جس میں کوئی یتیم ہو جس کے ساتھ خیر خواہی کا معاملہ ہوتا ہو، اور بدترین گھر وہ ہے جس میں کوئی یتیم ہو اور اس کے ساتھ بدسلوکی کی جاتی ہو۔ میں اور یتیم کی کفالت کرنے والا جنت میں اس طرح ہوں گے۔ (آپ ﷺ نے اپنی دونوں انگلیوں کو ملاتے ہوئے اشارہ کیا)

تذکرہ مناظر الاحسن

(والد ماجد)

مجاہد الاحسن☆

جامعہ کے تاسیسی اساتذہ میں سے ایک نام مناظر الاحسن صاحب کا بھی ہے۔ مغل شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر کے شاہی فرمان کے مطابق آپ کا خاندان ۹۹۹ھ میں گورکھپور کے اس مقام پر آباد ہوا جہاں کبھی مغلیہ افواج کے لئے راپتی کے کنارے ایک چھوٹا سا چھاؤنی نما قلعہ ہوا کرتا تھا۔ اسی فوجی چھاؤنی اور اردو بازار کے درمیان کے اس علاقے کو اب سوداگر محلّہ کہا جاتا ہے۔ مناظر الاحسن صاحب کا سلسلہ نسب اپنے والد کی جانب سے حضرت ابوبکر صدیقؓ اور والدہ کی طرف سے حضور اکرم ﷺ کے چچا حضرت عباسؓ سے ملتا ہے۔ (حوالہ راقم الحروف کی تصنیف ''مکہ معظّمہ سے معظم آباد تک'')

آپ کے والد ناظر الحسن صاحب (پیدائش ۱۳۰۰ھ) کا نام بھی آپ ہی کے مانند تاریخی تھا۔ آپ کے والد صاحب موصوف نے طبیہ کالج لکھنؤ سے طب کی تعلیم حاصل کی جو کہ ایک خاندانی پیشہ تھا مگر اپنے والد کی ہدایت پر آراضیات کی دیکھ بھال میں ضروری علم حاصل کرنے کی نیت سے مختاری کا امتحان بھی پاس کیا جو وکالت سے کمتر درجہ کی ڈگری ہے۔ اس وجہ سے محکمہ رجسٹریشن میں سب رجسٹرار کے عہدہ پر فائز ہوئے اس طرح ناظر الحسن صاحب اپنے خاندان کے پہلے گزیٹڈ افسر بنے مگر یہ نوکری بعد میں چھوڑ دی اور طب کے خاندانی پیشہ میں آگئے۔ ناظر الحسن صاحب کی شادی قصبہ سرائے (سٹھیاؤں) اعظم گڑھ کے علی حسن عباسی صاحب کی صاحبزادی بسم اللّٰہی بیگم سے ہوئی جن سے تین صاحبزادے مناظر الاحسن، مظاہر الاحسن اور محامد الاحسن صاحبان پیدا ہوئے۔ ۱۳۴۸ھ میں عین فجر کی نماز کے وقت سجدہ کی حالت میں ناظر الحسن صاحب کا انتقال سوداگر محلّہ کی مسجد میں ہوا، اس وقت آپ کے بڑے صاحبزادے مناظر الاحسن صاحب کی عمر ۲۰ سال سے بھی کم تھی۔

اپنے والد کی طرح مناظر الاحسن صاحب کا بھی تاریخی نام تھا۔ نام سے سن پیدائش ۱۳۴۱

☆رامپور

ھ یعنی ۱۹۲۳ء نکلتا ہے۔ آپ کی شادی خاندان کی ہی ایک بزرگ ہستی صبغت اللہ صاحب کی صاحبزادی فریدہ صاحبہ (میری والدہ) سے ہوئی جن پر اپنے والد مرحوم کی دینی و روحانی رہنمائی کا اثر بہت نمایاں تھا۔ مرحومہ نے نوافل وظائف اور دعاؤں کے خصوصی اہتمام کے لئے راتوں کا بہت بڑا حصہ مخصوص کر رکھا تھا۔ ان کی شادی کے بارے میں میری نانی جان بتاتی تھیں کہ تمھارے نانا جان نے کہا تھا کہ فریدہ کی شادی کے لئے تین لڑکوں کے نام ذہن میں ہیں مگر فیصلہ نہیں کر پا رہا ہوں اس لئے معاملہ اللہ کے حوالہ کر دیا ہے کل مسجد میں ان تینوں لڑکوں میں سے جو سب سے پہلے مسجد میں نظر آئے گا اسی سے شادی کی نیت کر لوں گا۔ اگلے دن سب سے پہلے میرے والد مناظر الاحسن صاحب ہی مسجد میں داخل ہوئے اور شادی بھی ان ہی سے ہوئی۔

پرائمری سے انٹر تک آپ جارج اسلامیہ کالج گورکھپور کے طالب علم رہے۔ بی اے۔ ایم اے اور بی ایڈ کی تعلیم گورکھپور یونیورسٹی سے حاصل کی۔ کبھی ملازمت کے لئے درخواست ڈالنے کی نوبت نہیں آئی اس وقت ایسے لوگوں کو خود ہی آفر مل جایا کرتا تھا۔ شروع میں ریلوے کی سروس جوائن کی مگر ۱۹۴۸ء میں انصار ہائی اسکول (اب مرتضیٰ حسین میموریل انٹر کالج) گورکھپور اور بعد میں جارج اسلامیہ کالج گورکھپور میں وائس پرنسپل کے فرائض انجام دیتے رہے پھر ۱۹۵۵ء سے ۱۹۶۵ء تک نیشنل انٹر کالج، مونڈاڈیہا بیگ، سمریاواں ضلع بستی میں پرنسپل کا عہدہ سنبھال لیا۔ اسی درمیان جامعۃ الفلاح کے اکابرین نے اپنے نصاب میں دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ عصری تعلیم کو بھی طلباء کے لئے لازمی قرار دیا تو انھیں کسی ایسے مدرس کی تلاش ہوئی جو عصری علوم کا ماہر تو ہو ہی مگر اس کی فکر بھی اسلامی ہو اور وہ عصری مضامین کو اسلامی نظریات کے مطابق طلباء کو ذہن نشین کرا سکے۔ جامعہ کے اس وقت کے ذمہ داروں نے والد محترم جناب مناظر الاحسن صاحب سے رابطہ قائم کیا نتیجہ یہ رہا کہ انھوں نے ۱۹۶۵ء میں انٹر کالج کی پرنسپل شپ کو خیر باد کہا اور جامعہ کے ہو کر رہ گئے پھر معاشیات اور سیاسیات کے ساتھ علم تمدن کے مضامین کی تعلیم دینا شروع کیا۔ یہ کام بذات خود ایک بہت بڑا چیلنج تھا کیونکہ جامعہ کا ذریعہ تعلیم اردو تھا اور اردو میں اعلیٰ درجات تو کجا خود پرائمری درجہ کے نصاب کے لئے بھی اردو میں نصابی کتب موجود نہیں تھیں۔ چونکہ والد محترم پر اسلامی فکر غالب تھی اور خاندانی پس منظر بھی ایسا رکھتے تھے جہاں فارسی اہل زبان کی طرح بولی جاتی تھی۔ انھیں عربی بولنے کی مشق تو نہیں تھی مگر ان کا عربی کا فہم بہت اچھا تھا یعنی ان کی نسل کے لوگ عربی سمجھ لیتے تھے اس لئے آپ پہلے معاشیات علم تمدن اور سیاسیات کے مضامین کے نوٹس تیار کرتے تھے پھر نصاب کے مطابق کلاس لیتے تھے۔

اپنے تدریسی پیشے سے انصاف کرنے کی نیت سے وہ ساری رات نوٹس تیار کرنے میں گزار دیتے تھے بعد میں انھوں نے جامعہ کے نصاب کے مطابق کتابیں تصنیف کرنے کے ارادے سے تیاریاں مکمل کرلی تھیں۔اس سے قبل کہ ان کے نوٹس باقاعدہ کتابوں کی شکل میں طبع ہوتے ۱۹۷۴ء میں ان کا انتقال ہوگیا۔

۱۹۶۷ء میں جب حکومت یوپی نے اردو میڈیم اسکولوں کی منظوری دینا شروع کیا تو دینی تعلیمی کونسل اور انجمن ترقی اردو کی اپیلوں پر دیگر محبان اردو کی طرح نہ صرف اپنی اہلیہ (راقم الحروف کی والدہ فریدہ صاحبہ) کو گورکھپور کے نوزائیدہ اردو میڈیم اسکولوں جیسے بہادرشاہ ظفر میموریل پرائمری اسکول اور علامہ اقبال ماڈل نرسری اسکول میں تدریسی فرائض انجام دینے کی ہدایت دی بلکہ خود بھی اردو میڈیم میں نصابی کتب کی تیاریوں میں تعاون دینے کی نیت سے پہلے ''ہمارا جغرافیہ ضلع گورکھپور'' (مطبوعہ دانش بکڈپو ٹانڈہ فیض آباد) نامی کتاب لکھا جو برسوں تک گورکھپور اور مہاراج گنج کے مشترکہ ضلع کے اردو میڈیم مکاتب کے نصاب میں شامل رہی۔ پھر درجہ ۶، ۷، ۸ کے لئے تاریخ اور علم تمدن کی نصابی کتابیں اردو میں تحریر کیں۔ ابھی ان کے شائع ہونے کے لئے تیاری ہو رہی تھی کہ ۲۱رفروری ۱۹۷۴ء کو ۵۱ سال کی عمر میں آپ کا ایک ناکام آپریشن میں اچانک انتقال ہو گیا۔ یہ غیر مطبوعہ مسودے ابھی بھی راقم الحروف کے پاس گھر میں موجود ہیں جو ان کی کاوشوں کا مبینہ ثبوت ہے۔

آپ کے دور کے اساتذہ اور تلامذہ کا ذکر بھی موجودہ دور کے طلبا کے لئے ضروری معلوم ہوتا ہے۔جن اصحاب سے والد صاحب کے خصوصی مراسم تھے ان میں اس وقت کے ناظم جامعہ ڈاکٹر خلیل احمد صاحب، صدر مدرس مولانا عبدالحسیب اصلاحی صاحب، مولانا جلیل احسن ندوی صاحب، مولانا صغیر احسن اصلاحی صاحب، مولانا شبیر اصلاحی صاحب، مولانا شہباز ندوی صاحب، انگریزی کے استاد ماسٹر افضال مشہدی صاحب، شعبۂ ثانوی کے صدر مدرس ماسٹر عبدالمجید صاحب اور سائنس ٹیچر ماسٹر مسعود صاحب کا نام خصوصیت سے لیا جائے گا۔ غیر تدریسی اصحاب میں جامعہ کے ذمہ دار ڈاکٹر حکیم ایوب صاحب مرحوم سے بھی بہت گہرے تعلقات تھے۔

چونکہ والد صاحب کا نام جامعہ کے تاسیسی اساتذہ میں سے لیا جاتا ہے اس لئے ان کے دور میں ہی جامعہ کے شعبۂ اعلیٰ سے فارغ ہونے والے پہلے بیچ کے طلبا کا نام بھی سرفہرست رہے گا۔ جامعہ کے اس پہلے بیچ میں صرف تین ہی افراد تھے جن کے نام یہ ہیں مولانا ابوالمکارم صاحب

(اصلی نام دلدار حسین) رامپور، مولانا عبدالوحید صاحب بستوی اور مولانا حبیب احمد جمالی صاحب (سدھارتھ نگر)۔ یہ تینوں فارغ ہونے کے بعد مدینہ یونیورسٹی میں اسکالرشپ پر اختصاص کے لئے مدعو ہوئے۔ پہلے بیچ کے بعد کے دور کے طلباء میں والد صاحب سے خصوصی تعلق رکھنے والوں میں نثار ہاشمی صاحب (بڑھنی سدھارتھ نگر)، مشرف حسین صدیقی صاحب (رامپور)، حافظ عرفان صاحب مرحوم (رامپور)، عبدالسلام بستوی صاحب، فریدالدین اختر صاحب (مغربی بنگال)، عبدالمومن صاحب (مغربی بنگال)، مولانا اثیر احسن، مولانا طاہر مدنی صاحب (موجودہ ناظم جامعہ) مولانا مقبول احمد فلاحی صاحب (نائب ناظم جامعہ) اور عبدالرحمٰن خالد صاحب لائبریرین جامعۃ الفلاح امتیازی پوزیشن رکھتے تھے۔

آپ کے مضامین انگریزی رسالہ ''السٹریٹیڈ ویکلی آف انڈیا'' اور اردو رسالوں ''الحسنات'' ''حجاب'' اور ''نور'' میں مستقل طور پر شائع ہوتے رہے۔ اردو ماہ ناموں ''ہما'' اور ''ہدیٰ'' میں نظمیں شائع ہوتی رہی ہیں جو زیادہ تر نعتیں ہوتی تھیں۔

عربی النسل خاندان کے فرد ہونے کی وجہ سے انھیں علم الانساب پر عبور حاصل تھا۔ راقم الحروف کو اس موضوع پر کچھ لکھنے کی تحریک بھی ان ہی سے ملی۔ آپ کی کل نو اولادیں ہوئیں جن میں سے ایک صاحبزادے مجاہد الاحسن اور ایک صاحبزادی عارفہ نسرین موجود ہیں بقیہ سات (۷) بچے بچپن میں ہی فوت ہوگئے تھے۔ مجاہد الاحسن ریاستی انتظامیہ کے اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں، ان کی شادی الٰہ آباد کے پرگنہ چائیل میں موضع عالم چند کے سابق زمیندار سید مظہر حسین نقوی صاحب (سابق ڈپٹی سپرنٹینڈنٹ آف پولس) کی صاحبزادی تسنیم فاطمہ سے ہوئی۔ صاحبزادی عارفہ نسرین کی شادی مظہر صاحب کے ہی صاحبزادے ڈاکٹر سید اشرف حسین (ایم بی بی ایس۔ ایم ڈی) سے ہوئی۔

مجاہد الاحسن
(موبائل۔ 91-9450563322+)
mujahidulahsan@rediffmail.com

☆☆☆

ماسٹر افضال احمد مشہدی

مولانا مطیع اللہ فلاحی مدنی ☆

دبلے پتلے چھریرے بدن اور لمبے قد کے ماسٹر صاحب لمبائی لیے ہوئے پرنور باوجاہت چہرہ، خشخشی داڑھی، سر پر کشتی دار ٹوپی شیروانی اور علی گڑھ پاجامے میں انتہائی پروقار شخصیت کے مالک تھے۔ بولتے تو لگتا پھول جھڑ رہے ہیں، ٹھہر ٹھہر کر ایک ایک جملہ ادا فرماتے گویا کہ پہلے سے ایک ایک لفظ ناپ تول کر سیٹ کیے گئے ہیں تاکہ سننے والے کو بات سمجھنے میں کوئی دقت و پریشانی نہ ہو۔ سنجیدگی، متانت اور وقار آپ کی گفتگو کو اور باوقار بنا دیتی تھی۔ اسی لیے طلبہ و اساتذہ سبھی کے درمیان ہر دل عزیز تھے۔ سب آپ سے محبت کرتے اور آپ کا احترام کرتے تھے، جامعہ آنے کے بعد جب تک جامعۃ الفلاح میں تدریسی خدمت انجام دیتے رہے حکیم محمد ایوب صاحب مرحوم کے گھر پر ہی قیام کیا کرتے تھے، آپ کے خورد ونوش کا نظم بھی وہیں پر تھا۔ حکیم صاحب اپنی مردم شناسی اور مہمان نوازی میں بہت معروف تھے۔ قصبہ بلریا گنج کے ایک نمایاں اور بے مثال آدمی تھے، اسی لیے ان کے یہاں مہمانوں کے آنے جانے کا ایک سلسلہ لگا رہتا تھا۔ ماسٹر صاحب چونکہ پڑھنے لکھنے والے آدمی تھے اس لیے وہ الگ ایک حجرے میں قیام کرتے تھے لیکن کھانا عام طور پر مہمانوں کے ساتھ حکیم صاحب کی معیت میں کھاتے تھے کیونکہ دسترخوان پر احباب کے ساتھ مل کر کھانے کے لطف سے وہ آشنا تھے۔ اس لیے ایسے مواقع کو ضائع کرنا وہ کب گوارا کر سکتے تھے۔ ویسے ماسٹر صاحب بہت ہی خوددار تھے، وہ بھلا حکیم صاحب کی فیاضی، محبت و ایثار کو کیسے نظر انداز کر سکتے تھے، وہ برابر فکرمند رہتے تھے کہ حکیم صاحب کو اس کا صلہ کیا دیا جائے اور کیسے۔ آخر ایک دن حکیم صاحب کے ہاتھ میں دواؤں کے چند پمفلٹ دیکھ کر لپکے وہ سب انگریزی میں تھے، آپ نے ان کو لیا اور قدرے وضاحت فرمائی حکیم صاحب کا بھی کچھ اشتیاق بڑھا اور پھر کیا تھا ماسٹر صاحب کی خوشی کی انتہا نہ رہی گویا اللہ تعالیٰ نے ان کو حکیم صاحب کی خدمت کا ایک موقع فراہم کر دیا اور پھر انھوں نے اپنی انگریزی صلاحیت کا پرخلوص نذرانہ انھیں پیش کیا اور جب تک وہاں رہے ان کے مطب میں آنے والے ان

☆ استاذ جامعۃ الفلاح، اعظم گڑھ

انگریزی پمفلیٹوں کا جو مختلف کمپنیوں سے ان کے پاس آتے تھے ترجمہ ان کو پیش کرتے رہے۔

جس کے نتیجے میں حکیم صاحب نے یونانی اور انگریزی دواؤں کے ایسے کمبینیشن تیار کیے جو بہت سی بیماریوں کے لیے تیر بہ ہدف نسخے ثابت ہوئے اور ہزاروں مریض ان سے شفایاب ہوئے۔ ساتھ ہی ساتھ حکیم صاحب کے بچوں کی انگریزی زبان مضبوط کرانے میں خصوصی توجہ دی جس سے ان کے بچوں کی علمی ترقی میں خاص مدد ملی۔ ماسٹر صاحب جامعۃ الفلاح میں انگریزی کے استاذ تھے اور ایک لمبی مدت تک یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ آپ کے ذمہ اعلی درجات کی انگریزی کی گھنٹیاں رہتی تھیں اور بحسن وخوبی آپ اپنی ذمہ داری ادا کرتے تھے حتی کہ جو طلبہ آپ سے خصوصی توجہ چاہتے تھے آپ اپنے فارغ اوقات میں ان پر توجہ دیتے تھے اور کبھی بھی آپ نے اس سلسلے میں کسی طالب علم کو مایوس نہیں کیا۔

انگریزی زبان پر قدرت رکھنے کے ساتھ ساتھ ماسٹر صاحب کو اردو زبان میں اچھی مہارت حاصل تھی۔ وہ اردو زبان نظم ونثر دونوں اصناف کے قادر الکلام سخنور تھے۔ چنانچہ ان کے مضامین اور نظمیں ماہنامہ ’الحسنات ونور‘ کی زینت بنا کرتے تھے اور گاہے بہ گاہے ’زندگی‘ کے صفحات کو بھی تابندگی بخشتے تھے۔ ماسٹر افضال صاحب مرحوم تحریک اسلامی سے وابستہ تھے، اس لیے ان کی تحریریں اور نظمیں لوگوں کے اندر تحریکی شعور کو بیدار کرنے کا ذریعہ ہوا کرتی تھیں۔ اسی لیے تحریکی اخبار ورسائل ان کی تخلیقات کے منتظر رہتے تھے بلکہ خط وکتابت کے ذریعہ انھیں برابر متوجہ کرتے رہتے تھے۔ جامعہ سے فارغ ہونے والے پہلے بیچ کے لیے انھوں نے جو الوداعی نظم تحریر کی تھی جو جامعہ کے پہلے تین فرزندوں کے نام تھی (مولانا ابوالمکارم فلاحی صاحب رامپور، مولانا عبدالوحید فلاحی اور مولانا حبیب احمد فلاحی صاحب سدھارتھ نگری اور جس کو انھوں نے الوداعی پروگرام کے وقت بذات خود اپنے آخری احساسات وجذبات کے ساتھ سنائی تھی اس کے چند بند یادداشت کی مدد سے قلم بند کر رہا ہوں۔

تم میرے حبیب ہو تم میرے وحید ہو   کمال آرزو ہو تم مکارم سعید ہو
تم ہی ہو اپنی آبرو اسی لیے ہے سرخوشی   کمال جستجو ہو تم دل و نظر کی عید ہو
گماں نصیب آرزو امید بن کے آگئی   اساتذۂ محترم کی عید آج آگئی
غم حبیب کا ثمر ہے خوشنما و خوبتر   لب صغیر پہ دعاء نیم شب کا ہے اثر
دل جلیل کی دعا باریاب ہوگئی   رخ خلیل کی حیا کامیاب ہوگئی

یہ جامعہ کے ساکناں کا کیسا ازدحام ہے   نگہ نگہ ہے گفتگو سکوت بھی کلام ہے

یہ چند اشعار ان کی اس الوداعی نظم سے ہیں جو ایک طویل نظم تھی۔ اس میں اگر کہیں کوئی سہو ہوا ہو تو فلاحی برادران اس کی اصلاح کر سکتے ہیں۔

اس نظم میں ماسٹر صاحب نے جن دلی جذبات کا اظہار کیا ہے اور فلاحیوں سے جیسی توقعات وابستہ کیں ہیں وہ یقیناً حفیظ میرٹھی مرحوم کے اس شعر کا خلاصہ ہیں جس میں انہوں نے فلاحیوں کو مخاطب کر کے کہا ہے:

بن کے رہ جانا کہیں نا تم فلاحی نام کے   تم فلاحی ہو سپاہی لشکر اسلام کے

گویا اول روز سے جامعہ کا مقصد تحریک اسلامی کے لیے ایسے افراد کو تیار کرنا رہا ہے جو کتاب وسنت میں گہری بصیرت و درک کے ساتھ اعلاء کلمۃ اللہ کے جذبے سے سرشار ہو کر تحریک اسلامی کے لیے کمک کا کام کر سکیں۔ ذمہ داران جامعہ، اساتذۂ جامعہ اور خصوصاً فلاحی برادران کو اپنا احتساب کرنا چاہیے کہ مقاصد جامعہ کو بروئے کار لانے میں ہم کس حد تک کامیاب ہیں۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ مرحوم کی خدمات کو شرف قبولیت بخشے اور ان کی فروگذاشتوں سے درگذر فرمائے اور ان کے طلبہ کو ان کے مشن کو آگے بڑھانے کا ذریعہ بنائے نیز ان کے لیے صدقۂ جاریہ بنائے۔ آمین

☆☆☆

صلہ رحمی

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم:

من أحب ان يبسط له في رزقه وأن ينسأ له في أثره فليصل رحمه

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: جو یہ چاہتا ہو کہ اس کے رزق میں کشادگی ہو اور اس کی عمر دراز ہو تو اسے صلہ رحمی کرنا چاہیے۔

ماسٹر ظفر عالم خاں اعظمی - حیات وخدمات

اعجاز احمد قاسمی☆

اس کائنات میں آنے جانے کا سلسلہ ابتداء آفرینش سے جاری ہے۔ یہاں جو بھی آتا ہے وہ جانے ہی کے لیے آتا ہے۔ البتہ بعض ایسے بھی خوش نصیب ہوتے ہیں جو اس دنیا سے جانے کے باوجود اپنے کارناموں کی وجہ سے ایک عرصہ دراز تک یاد رکھے جاتے ہیں۔ ایسے افراد آٹے میں نمک کے برابر ہوتے ہیں، اعظم گڑھ ضلع کی تحصیل سگڑی کے ایک مشہور گاؤں نصیر پور کے رہنے والے ماسٹر ظفر عالم خاں مرحوم ایک ایسے ہی خوش بخت انسان تھے۔ ان کی وفات پر تین سال کا عرصہ گذر چکا ہے لیکن اپنے حسن اخلاق اور کارناموں کی وجہ سے وہ آج بھی ہمارے درمیان چلتے پھرتے محسوس ہوتے ہیں اور امید ہے کہ یہ احساس ایک لمبے عرصے تک قائم رہے گا۔

ولادت

ماسٹر ظفر عالم صاحب مرحوم کی پیدائش نصیر پور گاؤں میں یکم مئی ۱۹۵۷ء میں ہوئی۔ والد صاحب کا نام جناب عبدالصمد خاں اور والدہ کا نام محترمہ سیدالنساء تھا۔ مرحوم نصیر پور کے ایک معروف زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔

تعلیم

انہوں نے ۱۹۷۲ء میں یوپی بورڈ سے ہائی اسکول پاس کیا۔ ۱۹۷۴ء میں یوپی بورڈ سے آئی.ایس.سی. کی ڈگری چاندپور پٹود سے حاصل کی۔ ۱۹۷۷ء میں گورکھپور یونیورسٹی سے انگلش، فلاسفی اور اردو میں بی اے کی سند حاصل کی۔ بچپن ہی سے حصول علم کا شوق کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا اس لیے مزید اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی تشریف لے گئے اور وہاں سے ۱۹۸۳ء میں پولیٹیکل سائنس میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔

مرحوم کو مضمون نگاری اور انشاء پردازی کا ذوق فطری طور پر ملا تھا، چنانچہ دوران طالب

☆استاذ حدیث، جامعۃ الفلاح، اعظم گڑھ

علمی ہی ان کے مضامین اردو، ہندی اور انگریزی زبان میں ملک کے مختلف اخبارات و رسائل میں شائع ہونے لگے تھے۔ اس فطری صلاحیت میں مزید جلا پیدا کرنے کے لیے سردار پٹیل انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی سے ۱۹۸۴ء میں پی جی ڈپلوما ان صحافت کی سند حاصل کی۔

احوال و کوائف

مرحوم کو صحافت میں خصوصی مہارت حاصل تھی اور فطری طور پر صحافتی ذوق بھی وافر مقدار میں ملا تھا۔ اس لیے اسی میدان کو آپ نے منتخب کیا۔ چنانچہ چند سالوں تک دہلی کے مختلف اخبارات سے منسلک رہے۔ اس کے بعد انگریزی ادب کے استاذ کی حیثیت سے ۱۶؍جولائی ۱۹۹۰ء میں ذمہ دارانِ جامعۃ الفلاح نے آپ کی خدمات حاصل کیں۔ تقریباً تین سالوں تک شعبۂ اعلیٰ کے مختلف منتہی درجات میں بحسن وخوبی یہ خدمات انجام دیتے رہے۔ انگریزی ادب کی تدریس کا خاص ملکہ مرحوم کو حاصل تھا۔ درس سے قبل عموماً طلبہ کی طرف سے جدید ترین انگریزی کے الفاظ اور اصطلاحات سے متعلق استفسار کیا جاتا۔ مرحوم بڑے ہی اطمینان سے ان کے معانی و مفاہیم کی وضاحت کرتے اور پھر ان کے مواقع استعمال کی تشریح فرماتے۔ ایسا معلوم ہوتا کہ موصوف پہلے ہی سے ذہنی طور پر تیاری کے ساتھ آئے ہیں لیکن حقیقت میں ایسا نہ ہوتا بلکہ سب کچھ برجستہ ہوا کرتا۔

موصوف کورس کی کتابوں کو نظری طور پر پڑھانے کے ساتھ ساتھ مشق وتمرین اور قواعد کے اجراء پر بطور خاص زور دیا کرتے۔ روزمرہ کے محاوروں کی طرف رہنمائی کرتے، ان کے طریقہائے استعمال کی وضاحت فرماتے۔ موصوف بڑے ہی قوی الحفظ واقع ہوئے تھے۔ چنانچہ قدیم انگریزی ادب وتاریخ کی کتابوں کے پیراگراف کے پیراگراف ان کو محفوظ تھے۔ چنانچہ مختلف مواقع میں استشہاد کے طور پر انہیں پیش کرتے۔ شیکسپیئر کے ڈراموں کے بند کے بند اور گولڈ اسمتھ وغیرہ کی عبارتیں ان کو ازبر تھیں۔ مناسب مواقع میں اس کے جملے بڑی ہی لذت کے ساتھ طلبہ کے ساتھ ساتھ ہم اساتذہ کو بھی سناتے۔

موصوف مطالعہ کے بے حد شوقین تھے۔ کوئی نئی کتاب مل جاتی تو بڑے ہی انہماک سے اس کا مطالعہ کرتے اور پاس بیٹھنے والوں کو اس کا کوئی قیمتی حصہ پڑھ کر سناتے بھی۔ میگزین کا مطالعہ کرتے وقت پسندیدہ مقامات اور جملوں کو نشان زد کرتے جاتے۔

موصوف کی ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ اکتسابی ذہن کے مالک تھے، اساتذہ کے علاوہ طلبہ عزیز سے بھی عربی الفاظ کے تلفظ اور مفہوم سے متعلق بڑے ہی انکسار اور علمی اشتیاق کے ساتھ

استفسار کرتے اور تشفی بخش جواب ملنے کے بعد شکریہ ادا کرنا نہ بھولتے۔

طلبہ کے ساتھ مرحوم کا برتاؤ بڑا ہی مشفقانہ اور ہمدردانہ ہوتا۔ طلبہ کے ساتھ بڑی ہی محبت اور شفقت کے ساتھ پیش آتے۔ ہمیشہ طلبہ کی بہتر تعلیم وتربیت کے لیے فکر مند رہتے اور اس سلسلہ میں ذمہ داران کو تجاویز اور مشوروں سے نوازتے رہتے۔

مرحوم کو انگریزی ادب میں مہارت کے ساتھ اردو ادب پر کافی عبور حاصل تھا۔ دوران گفتگو اگر کسی سے کسی لفظ کے تلفظ میں غلطی ہو جاتی تو بڑی خوبصورتی کے ساتھ اس پر متنبہ فرماتے۔

موصوف اخلاق وکردار کے لحاظ سے بڑے اونچے مقام پر فائز تھے، اس دورِ قحط الرجال میں ایسے افراد خال خال ہی ملتے ہیں۔ اساتذہ کرام بلکہ طلبہ کے ساتھ بھی بڑی خوش اخلاقی سے پیش آتے۔ عموماً سلام اور مصافحہ کرنے میں پہل کرتے، اپنائیت اور مسکراہٹ کے ساتھ ملتے، دورانِ گفتگو ہمیشہ مسکراہٹ سجی رہتی، اللہ تعالیٰ نے ان کو بے پناہ صبر کی قوت عطا کر رکھی تھی۔ جواں سال صاحبزادے کی گمشدگی کے بعد بھی ان کی اس کیفیت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی، مسکراہٹ کا جو انداز پہلے تھا وہ اس حادثہ کے بعد بھی باقی رہا۔ اگرچہ مسکراہٹ کے ساتھ کرب کے کچھ آثار بھی شامل ہو گئے تھے۔

موصوف بڑے مہمان نواز بھی واقع ہوئے تھے، جامن کے درخت اور پھل سے ان کو خصوصی لگاؤ تھا، پھل کے زمانے میں وہ خود تو بڑے شوق سے کھاتے ہی تھے، بڑے اصرار کے ساتھ احباب کو بھی اپنے یہاں مدعو کرتے بلکہ بڑے اہتمام کے ساتھ ان کے گھر بھی بھجواتے۔ بسا اوقات اسٹاف روم میں خود لے کر آتے۔ اساتذہ وقفہ کے دوران خوب محظوظ ہوتے۔ مرحوم کے پاس امرود کا بھی ایک بڑا سا باغ تھا پھل کے موسم میں وہ خود بھی بڑے شوق سے کھاتے اور احباب کی بھی خوب خاطر مدارات کرتے۔ اپنی وفات سے ایک آدھ مہینہ قبل جس محبت سے انہوں نے ہم لوگوں کو امرود کھلایا تھا اس کی یاد آج بھی تروتازہ ہے۔

مرحوم چونکہ ایک بالغ نظر صحافی اور پولٹیکل سائنس میں ایم اے تھے، اس لیے دنیا کے سیاسی حالات پر ان کی نگاہ بڑی گہری تھی۔ وقفہ کے دوران احوال عالم پر عموماً اور عالم اسلام کی صورتحال پر خصوصاً گفتگو فرماتے۔ موجودہ سیاسی حالات کا اس انداز سے تجزیہ کرتے کہ حاضرین ہمہ تن گوش ہو جاتے۔ پاکستان، افغانستان اور عراق کے حالات کا بڑے ہی کرب اور درد کے ساتھ تذکرہ فرماتے۔

افغانستان پر صلیبی حملہ کا تذکرہ کرتے تو اس خیال کا بھی اظہار لازماً کرتے کہ امریکہ اور ناٹو کو بھی ذلیل و رسوا اور ناکام و نامراد افغانستان کے کوہساروں سے اسی طرح نکلنا پڑے گا جس طرح روس کو نکلنا پڑا تھا۔ وہ فرماتے تھے کہ افغان قوم حریت و آزادی کی شیدائی ہے، ان کے اندر بہادری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ اس قوم نے آسانی کے ساتھ کسی کی غلامی قبول نہیں کی ہے۔

پاکستان کی ابتر صورتحال پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے کہ تمام خرابیوں کی بنیاد زمینداری سسٹم کا باقی رہنا اور ان زمیداروں کا مغرب پرست ہونا ہے۔ افغانستان کے معاملے میں ان کی بے ضمیری اور بے حسی کا اس انداز سے تذکرہ کرتے کہ میر صادق اور میر جعفر کی غداریوں کی یاد تازہ ہو جاتی۔

ملکی سطح پر کچھ شدت پسند ہندو تنظیموں کی طرف سے اسلام کے خلاف پھیلائی جانے والی غلط فہمیوں کے ازالے اور اسلام کے صحیح تعارف کے سلسلے میں وہ اکثر اپنی اس رائے کا اظہار فرماتے کہ اسلامی تاریخ کے عدل و انصاف، ایثار و قربانی اور زہد و تقویٰ کے واقعات کا ہندی زبان میں ترجمہ کرکے اگر ہندی اخبارات میں اشاعت کا سلسلہ شروع کیا جائے تو بڑی حد تک غلط فہمیاں دور ہو جائیں گی اور اسلام کے صحیح تعارف میں مدد ملے گی۔

موصوف پوری شان و شوکت کے ساتھ تقریباً تین سال تک انگریزی ادب کی تدریس کا فریضہ انجام دیتے رہے پھر اپنے بعض خصوصی حالات کی وجہ سے ۷/اپریل ۱۹۹۳ء میں مستعفی ہوگئے۔ اس کے بعد ۲۰/اپریل ۲۰۰۹ء میں دوبارہ ان کی خدمات حاصل کی گئیں۔ اپنی اسی پرانی کیفیت کے ساتھ وہ تدریسی فرائض انجام دینے لگے لیکن اس بار ان کی حیات مستعار نے انھیں زیادہ خدمت کرنے کا موقع نہ دیا۔ موصوف ذیابیطس کے ساتھ بلڈ پریشر کے بھی شکار ہوگئے تھے۔ وفات کی شب اچانک شوگر کافی بڑھ گیا ساتھ ہی دل کا دورہ بھی پڑا جو ان کی وفات کا باعث بنا۔ یہ حادثہ ۲۷/نومبر ۲۰۰۹ء بروز جمعہ پیش آیا۔

مرحوم کی نماز جنازہ بعد نماز جمعہ جامع مسجد شہر اعظم گڑھ کے امام و خطیب نے پڑھائی پھر دوبارہ جامعۃ الرشاد کے احاطہ میں مولانا محمد طاہر مدنی نے نماز جنازہ پڑھائی۔ جس میں نصیر پور اور قرب و جوار کی بستیوں سے ایک جم غفیر نے شرکت کی۔ رشاد نگر قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔

اللہ تعالیٰ مرحوم کی قبر کو نور سے بھر دے۔ ان کی حسنات کو قبول فرمائے، ان کی سیئات سے عفو و درگذر فرمائے۔ جنت الفردوس میں اعلیٰ سے اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ آمین

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

کسے دل ڈھونڈھ رہا ہے

مولانا افتخار الحسن ندوی☆

انسانی شرف و فضیلت کے گوناگوں اوصاف جن لوگوں میں زیادہ ہوتے ہیں، عوام اور ان کے لواحقین و متعارفین میں ان کی مقبولیت بھی زیادہ ہوتی ہے۔ سماج کے ہر طبقہ اور ہر دور میں ایسی ہر دلعزیز شخصیات پائی جاتی رہی ہیں جو اپنے محاسن و محامد کی وجہ سے مدت ہائے دراز تک دلوں میں زندہ رہی ہیں لیکن کچھ شخصیات ایسی بھی ہوتی ہیں جن میں کچھ اوصاف اتنے زیادہ نمایاں ہوتے ہیں کہ وہ ان کی شناخت ہی نہیں بلکہ ان کی یادوں کا ایسا رمز و استعارہ بن جاتے ہیں کہ جب بھی یہ اوصاف ذہن میں آتے ہیں ان کی شخصیت ان کا مظہر جمیل بن کر سامنے آجاتی ہے اور جب بھی کبھی ان کی یاد آتی ہے تو یہی اوصاف ان کی شخصیت کا روپ دھار کر نگاہوں میں پھر جاتے ہیں۔

جامعۃ الفلاح کی بزم طرب کو خیر باد کہے کے مدت ہوئی، ماسٹر ظفر عالمؒ وہاں چلے گئے جہاں جانے والا کبھی واپس نہیں آتا لیکن کسی مناسبت سے ان کا کہیں نام آجاتا ہے تو معاً شریفانہ مسکراہٹوں کا ایک پیکر خنداں لیے وہ ذہن کے گوشے گوشے کو اس طرح تجلی گاہِ جمالِ آدمیت بنا دیتے ہیں جیسے وہ بھی ہمارے درمیان موجود ہوں۔ وہ انسانیت کا پیکر تھے اور انسانیت کی تبلیغ ان کی ایسی ذاتی صفت تھی کہ ان سے ملنے والا کوئی مہذب آدمی ان سے ملنے کے بعد جدا ہوتا تو محسوس کرتا کہ انسانیت کے شعور کی جڑیں اس کے دل میں پیوست ہو رہی ہیں۔ زندگی سے نباہ کرنے کے لیے انھوں نے کئی مشغلے اختیار کیے، تجارت بھی کی، نفع بھی کمایا لیکن ان کی انسانیت دوستی نے ان کو ہر ایک سے دل برداشتہ رکھا۔ آخر جامعہ کے سلک تدریس سے منسلک ہو کر شاکر و مطمئن ہوگئے اور ایسے شاکر و مطمئن ہوئے کہ کسی دوسری جانب نگاہ غلط انداز بھی نہیں ڈالی۔ یہاں ان کو اپنی طبیعت کی جولانی دکھانے کا وسیع میدان نظر آیا، اس لیے جامعہ کے ہی ہو رہے۔

☆استاذ حدیث کلیۃ البنات، جامعۃ الفلاح، اعظم گڑھ

ان کے درس میں انسان کی عظمت ومحبت کا پہلو نمایاں ہوتا تھا، سبق کے مشتملات خواہ کسی نوعیت کے ہوں وہ کسی نہ کسی بہانے انسانی اقدار کی آبیاری کا پہلو ضرور نکال لیا کرتے تھے، اس لیے ان کی کلاس سے طالب علم باہر آتا تو فکری ومعنوی ارتقاء کے احساس کی سرخوشی کے ساتھ اخلاقی و روحانی مسرت کی لذتوں سے بھی سرشار ہوتا تھا۔ اس کے چہرے پہ انسانیت کے شعور کے ساتھ ساتھ علم وآگہی کے سرور کی جلوہ نمائی ہوتی تھی۔

وہ کہا کرتے تھے کہ تعلیم انسان کو انسان بنانے کا کام ہے۔ اس لیے جن لوگوں میں انسانیت کی خوبو جتنی زیادہ ہوتی ہے تعلیم ان کو ملک وقوم کے لیے اتنا ہی مفید وکارآمد بناتی ہے، جو لوگ انسانیت سے عاری ہوں یا ایسی فضا وماحول کے پروردہ ہوں جہاں مادہ پرستی کی ہوائیں ہی ذہن ومزاج کی جہات متعین کرتی ہوں تو ایسے لوگوں کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنا، سماج پر ایسے قزاقوں کو مسلط کرنا ہے، جو سماج سے انسانیت کی روح سلب کرلیں، ان کو خوب اندازہ تھا کہ مغربی طاقتیں سماج پر مسلط ایسے ہی قزاق ہیں جن کی وجہ سے آدم کا یہ عشرت کدہ آلام ومصائب کے خارزار جہنم میں تبدیل ہوتا جارہا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ طلبہ میں انسانی شعور کی آبیاری کو اولین اہمیت دیتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ انسانیت ہی مذہب کی اساس ہے، اس لیے مذہب ہی کی طرح ان کو انسانیت سے بھی پیار تھا۔

دنیا میں جب بھی انسانیت کی تذلیل کا کوئی واقعہ پیش آتا، وہ تڑپ اٹھتے اور اس کے تدارک کی اپنی سی کوشش ضرور کرتے۔ انتظار نعیم کی جن نظموں کا آپ نے انگریزی زبان میں ترجمہ کیا ہے، وہ کوئی اتفاقی واقعہ نہیں ہے بلکہ اسی تڑپ کا نتیجہ ہے۔ اگر فارغ اوقات میں خود کو مشغول رکھنے کی بات ہوتی یا انگریزی زبان وادب میں اپنی غیر معمولی صلاحیت ولیاقت کا اظہار مقصود ہوتا تو زمانہ کے ذوق عام اور عالمی ادب معیار کو سامنے رکھتے ہوئے اس سے بلند پایہ متعدد نظمیں ان کے انتخاب میں آسکتی تھیں لیکن ان تمام نظموں کے مقابلے میں ان کے دامن دل کو ان ہی نظموں نے اس لیے کھینچا کہ انسانیت کی تذلیل کے خلاف جہاد وشورش برپا کرنے کی ان میں ایک چنگاری ان کو نظر آئی۔ انھیں شدت سے احساس ہوا کہ اس کا لفظ لفظ ان کے اپنے قلب وروح کی آواز ہے۔ چنانچہ قلم برداشتہ ان کا بدیہی ترجمہ کردیا۔ اس ترجمہ شدہ نظم کا آہنگ اصل اردو نظم کے آہنگ سے بلند ہے۔ اس کا ہر لفظ جذبے کی آنچ سے تیار ہوا ہے۔ اس میں انسانیت کے درد سے بھری ہوئی ان کے دل کی آواز تڑپتی ہے۔ زریاب فلاحی صاحب نے ان نظموں پر تبصرہ کرتے ہوئے اس حقیقت کا

اظہار ان لفظوں میں کیا ہے:

''ایک طرف تو یہ ترجمہ جہاں مترجم کی انسانیت دوستی، امن پسندی، ملک وملت کا درد، خدمت خلق اور قربانی جیسی اعلیٰ صفات کا مظہر ہے وہیں مترجم کی انگریزی زبان وادب پر قدرت، اسلوب کی ندرت اور جذبہ کی شدت کا بھی عکاس ہے۔ جس کی وجہ سے یہ ترجمہ اصل اردو نظم سے بھی زیادہ مؤثر اور پرسوز ہوگیا ہے۔''

ماسٹر ظفر عالم صاحب مرحوم خاموش طبع تھے، بلاضرورت کسی سے خواہی نہ خواہی بات کرنا ان کو پسند نہ تھا۔ اس لیے اکثر خاموش رہا کرتے تھے، لیکن ان کی خاموشیاں فکر کی بلاغت سے معمور ہوا کرتی تھیں یعنی ان کی خاموشی مراقبہ کے استغراق سے عبارت تھی جو آگہی کی معراج ہوتی ہے۔ جس میں زندگی کے حقائق کی تجلیات کا فروغ، وہم وگمان اور شک وریب کے تمام پردے چاک کردیتا ہے، ایک بار ضرورتاً طیبہ منزل (ثانوی کا ہاسٹل) جانے کا اتفاق ہوا، اپنے کام سے فارغ ہوا تو بے ساختہ قدم ان کے کمرے کی جانب بڑھ گئے، وہ ان دنوں طیبہ منزل کے شمالی مغربی گوشے میں رہا کرتے تھے، جو ان دنوں خانساماؤں کی رہائش گاہ ہے۔ دروازہ پر پہنچا تو دیکھا وہ تخت پر دیوار کی ٹیک لیے بیٹھے ہیں، آنکھیں بند ہیں، جنبش لب سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کسی سے باتیں کررہے ہیں یا کسی مضمون کا اعادہ کررہے ہیں۔

چہرے پر فکر کی بلاغت کا جمال لویں دے رہا تھا، میں نے سلام کیا تو چونک کر کھڑے ہوگئے۔ پھر مسکراہٹوں کی دلآویز کیفیات سے میں ہم آغوش تھا، کچھ دیر شاد کام ہوتا رہا پھر خود ہی گویا ہوئے، کہا کہ ہمارے دوست ماسٹر اختر الزماں صاحب جمعرات کو گھر چلے گئے، تنہائی ملی تو سوچا اپنی حقیقت ووسعت کو سامنے رکھتے ہوئے خود سے کچھ باتیں کروں اور اپنے نفس کے تقاضوں کو اپنی حقیقت و وسعت سے ہم آہنگ بنانے کا منصوبہ بناؤں۔ اس وقت ان کے ہاتھوں مُس چند سکے تھے۔ ان کو الٹتے پلٹتے ہوئے کہا: یہی وہ چیز ہے جو انسان کو اس کی حقیقت سے دور کرتی ہے، اگر یہ نہ ہو اور انسان اس کے لیے سگِ گرسنہ بھی نہ بنے تو اپنی حقیقت سمجھنے میں دشواری نہ ہو۔ میں نے عرض کیا کہ جو منصوبہ آپ نے بنایا ہے اس کی کچھ تفصیلات بتائیے تو کہا کہ چلئے پہلے اس کو دور بھگالیں اور چائے پی لیں تو بات کریں گے۔

انسان کی یہ بھی ایک خوبی شمار ہوتی ہے کہ وہ اپنی حیثیت وحقیقت سے آگاہ ہونے کے ساتھ ساتھ دوسروں کی حیثیت وحقیقت کا بھی صحیح ادراک رکھتا ہوتا کہ باہمی معاملات میں اس

حیثیت وحقیقت سے ہم آہنگ ایسا اخلاقی رویہ اپنائے جو انسانیت کے لیے کامل ہو۔ ماسٹر ظفر عالم مرحوم بہت سادہ دل اور سادہ مزاج تھے، تکلف وتصنع اور موجودہ دور کے ظاہری تہذیبی مراسم سے برائے نام بھی ان کی آشنائی نہیں تھی لیکن میں نے دیکھا کہ جس آدمی سے بھی ملے، اس سے اسی طرح ملے جس طرح اس سے ملنا چاہیے۔ گفتگو کا لب ولہجہ دلداری کے اطوار سب کچھ اس کے بالکل شایان شان، نہ کسی پہلو سے کوئی کمی وکوتاہی نہ مرتبہ ومقام سے بلند تر پذیرائی کے لوازمات وترتیبات۔ ان سے جو بھی ملا، آسودہ حال ہو کے لوٹا۔

ماسٹر صاحب مرحوم کی تعلیم عصری جامعات کی مرہون منت تھی لیکن ان کا ذہن ومزاج اور فکرورجحان دینی تھا، ان کو دیکھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ انگریزی زبان وادب کے ممتاز اسکالر ہیں۔ وضع قطع سادہ بالکل مشرقی انداز کی رفتار وگفتار میں عالمانہ تمکنت، انگریزی دانی کا رعب جھاڑنے کے لیے کبھی مغربی پوشاک سے سمجھوتہ نہیں کیا۔ تعلقات کا دائرہ بھی علماء وصلحا تک محدود رکھا چونکہ کسی مکتب فکر سے وابستگی نہیں تھی اس لیے جس میں صلاحیت وصالحیت کا عنصر غالب دیکھا اس کے گرویدہ ہو گئے۔ ابتداءً تبلیغی جماعت سے قربت قریبہ رکھتے تھے چونکہ وہ خود بے غرض قسم کے انسان تھے اس لیے تبلیغی جماعت کی بے غرض سعی تبلیغ ان کو بہت پسند آتی تھی۔ ان کے بڑے بھائی ڈاکٹر فخر عالم صاحب کے مطب کے سامنے ایک مسجد کچھ ویران سی تھی، تبلیغی جماعت کا ایک وفد آ کے اس میں ٹھہرا۔ انھوں نے محلے میں گشت کے ذریعہ اکثر لوگوں سے ملاقات کی اور ان کو دعوت دی کہ مسجد میں آئیں۔ وہاں دین کی ضروری باتیں ہوں گی، ماسٹر صاحب بھی اس پروگرام میں شریک تھے ۔ مبلغ نے تقریر کا آغاز اس بات سے کیا کہ دینی بھائیو! یہ مسجد رو رہی تھی، میں اس کے رونے کی آواز سنی ہے۔ کاش آپ لوگ بھی اس کی آواز گریہ سن سکتے۔ یہ بات ماسٹر صاحب مرحوم کے دل میں اس تیر نیم کش کی طرح پیوست ہو گئی جس کی خلش غالب کو زندگی بھر تڑپاتی یا لذت بخشتی رہی۔ ان ہی دنوں اعظم گڑھ کی جامع مسجد میں مولانا اعجاز احمد مدظلہ کا درس قرآن شروع ہوا۔ آپ ان کے درس میں پابندی سے شریک ہونے لگے۔ ایک روز میں نے ان کا تاثر معلوم کرنے کی کوشش کی تو ان کی آنکھوں میں ایک چمک جاگ اٹھی۔ (یہ چمک الفاظ سے زیادہ معنی خیز تھی) زبان سے صوف اتنا ہی کہا: بڑی فاضل وقابل شخصیت ہے۔ چونکہ مطالعہ کا شغف زیادہ تھا اس لیے آتے آتے تحریری لٹریچر بھی مطالعہ میں آیا تو دنیا کی بے اعتنائی (جو بیزاری کی حد تک تھی) کی کیفیت میں تبدیلی آئی اور دعوتی سرگرمیوں سے کچھ رشتہ استوار ہوا۔ خاص طور سے غیر مسلموں میں دعوتی کام کی ضرورت کا شدت

سے احساس پیدا ہوا۔ پھر علماء کونسل قائم اور اعظم گڑھ کربلا کے میدان میں اس کا پروگرام ہوا، مولانا طاہر مدنی مدظلہ کا خطاب تھا۔ تقریر کے بعد وہیں ان سے ملاقات ہوئی تو میں نے پھر ان کا تاثر معلوم کیا۔ کسی قدر کھل کے مسکرائے اور کہا ''عشق کے دردمند کا طرز کلام اور ہے'' میں ان کا مدعا سمجھ گیا، وہ کہنا چاہتے تھے کہ ملی ضرورت واحتیاج کا تقاضا بن کر جو تنظیم وجود میں آئی ہے اس میں زندگی ہوتی ہے اور اس کے اکابرین کی آوازوں میں مقناطیسی قوت واثر ہوتا ہے۔ وہ آخر تک علماء کونسل کے پرجوش حامی رہے اور مولانا طاہر مدنی مدظلہ ان کا مرجع عقیدت بنے رہے۔

اللہ ان کی روح کو اپنی رضا وخوشنودی کا جام پلا پلا کر آسودہ وبامراد رکھے۔ آمین

☆☆☆

''ماضی میں خاص طور پر دینی مدارس کی روایت یہ رہی ہے کہ اساتذہ اور طلبہ میں عمر بھر قائم رہنے والا ایک روحانی رشتہ ہوتا تھا۔ استاذ اپنے طلبہ کے لئے ایک مشفق باپ، ان کا اخلاقی اور روحانی مربی اور علم وعمل دونوں کے میدان میں ایک شفیق نگراں کی حیثیت رکھتا تھا، جو طلبہ کے نجی معاملات تک میں دخیل ہوتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ طلبہ اپنے اساتذہ سے علمی استعداد کے ساتھ ساتھ اخلاقی تربیت بھی حاصل کرتے تھے، ان سے زندگی کا سلیقہ اور دوسرے اخلاقِ فاضلہ سیکھتے تھے اور اس طرح شاگرد اپنے استاذ کے علم وعمل کا آئینہ ہوا کرتا تھا۔ اب رفتہ رفتہ یہ باتیں داستانِ پارینہ ہوتی جارہی ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ استاذ نے اپنا مقصد صرف کتاب پڑھانا بنالیا ہے، رہی یہ بات کہ طلبہ کو مفید تر بنانے کے لئے انہیں کن کاموں کا مکلّف کرنا ضروری ہے، کون سے رجحانات ان کے علم وعمل کے لئے مضر ہیں اور انہیں کیسے ختم کیا جاسکتا ہے، طالب علم درسگاہ سے باہر کس قسم کی زندگی گزارتے ہیں......؟ ان سوالات کے بارے میں سوچنے اور ان مقاصد کی لگن رکھنے والے اساتذہ مفقود ہوتے جارہے ہیں، الا ماشاء اللہ......'' (مولانا مفتی محمد تقی عثمانی)

اکرم باروی-ایک عظیم شخصیت

محمد اسماعیل فلاحی☆

جامعۃ الفلاح کے اساتذہ میں جماعت اسلامی کے قدیم رکن اور ایک پیاری شخصیت محمد اکرم صاحب کی ہے۔ یہ رہنے والے تو تھے بارو کے، لیکن بھاگلپور میں بمقام 'پُرَینی' اپنے نانہال میں رہا کرتے تھے۔ جماعت اسلامی سے تعلق رکھنے والی ایک اور پیاری شخصیت محمد اکرم نام کی بھاگلپور میں رہتی تھی۔ ان دونوں میں فرق کرنے کے لیے ان کو اکرم باروی اور ان کو اکرم صدیقی کہا جاتا تھا۔ ان دونوں میں اس حیثیت سے بڑی مماثلت ہے کہ اس زمانہ میں تحریک سے متاثر ہوکر اور سرکاری تعلیمی اداروں کو قتل گاہ سمجھ کر دونوں نے اپنا تعلق ان اداروں سے نہ صرف منقطع کرلیا بلکہ اپنی ڈگریاں تک پھاڑ ڈالیں اور اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے اپنے کو یکسو کرلیا۔ اکرم باروی صاحب تو ثانوی درسگاہ رام پور میں آگئے۔ یہ وہی زمانہ تھا جب جناب فضل الرحمٰن فریدی اور ڈاکٹر عبدالحق انصاری وغیرہ وہاں زیر تعلیم تھے۔ ان بزرگوں نے تو دوبارہ ان عصری درسگاہوں کا رخ کیا لیکن اکرم باروی صاحب نے دوسرے اور بزرگوں کی طرح سرکاری درسگاہوں کو تین تین طلاقیں دے رکھی تھیں۔ اس لیے دوبارہ اس کوچہ میں قدم نہیں رکھا اور پوری زندگی تحریک اسلامی کے لیے وقف کردی۔ گرچہ ایک بڑے زمیندار گھرانے سے ان کا تعلق تھا لیکن گھر سے تعلق نہ ہونے کی وجہ سے اونے پونے حصہ ملا۔ پوری زندگی قناعت کے ساتھ گذاری، بڑے صابر وشاکر تھے۔

عربی زبان سے واقفیت کی وجہ سے قرآن وحدیث براہ راست سمجھتے تھے۔ لیکن قدیم و جدید انگریزی زبان پر بڑا عبور تھا۔ انگریزی فراٹے سے بولتے تھے۔ مطالعہ کے شوقین تھے، انگریزی استاد کی حیثیت سے جامعۃ الفلاح میں ان کا تقرر ہوا۔ اس دور کا عام مزاج ہے کہ ادارے ہوں یا تنظیمیں، لوگ افراد کی صلاحیت اور قربانی کو نہیں دیکھتے، ڈگریوں کو غیر معمولی حیثیت حاصل

☆استاذ تفسیر، جامعۃ الفلاح، اعظم گڑھ

ہوگئی ہے۔ اسی ذہنیت کا اثر تھا کہ ان کی تنخواہ ڈگری نہ ہونے کی وجہ سے عام انگریزی کے اساتذہ سے کم رکھی گئی۔ حالانکہ وہ صلاحیت میں کسی سے کم نہ تھے۔ ایسے لوگوں کا استحصال اس دور کی ایک عام بات ہے۔ لڑکے کلاس کے علاوہ بھی انھیں گھیرے رہتے اور وہ انھیں پڑھاتے ہوئے خوشی محسوس کرتے، کبھی کبھی کوئی عربی کی کتاب لے کر ان کے پاس پہنچ جاتا، وہ خوش ہوتے اور گھبراتے نہیں۔ ڈاکٹر محی الدین غازی فلاحی اور ان کے ساتھیوں نے ان سے خوب خوب استفادہ کیا ہے۔

ان کے گھٹنوں میں اکثر تکلیف رہتی تھی۔ جس سے اٹھنے بیٹھنے اور چلنے پھرنے میں دشواری ہوتی تھی۔ بعد میں یہ تکلیف اتنی بڑھ گئی کہ چلنے پھرنے سے معذور ہوگئے، بستر پر پڑے رہتے۔ میں ان سے ملنے ان کے گھر گیا۔ ''ذکر شہباز'' پیش کی، وہ مولانا شہباز اصلاحی کے بڑے عقیدت مند تھے، بہت خوش ہوئے۔ اہلیہ فالج زدہ تھیں جس کی وجہ سے بولنے سے معذور تھیں۔ لکھ کر کوئی بات کہتیں۔ اللہ نے انھیں صرف بچیاں دی تھیں، چھ بچیاں تھیں۔ کوئی لڑکا نہیں تھا۔ اپنی طویل بیماری کے زمانہ میں انھوں نے مجھے خط لکھا کہ میں اس بات پر اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ ابھی تک فاقہ کی نوبت نہیں آئی ہے۔ میں نے ڈاکٹر محی الدین غازی کو توجہ دلائی اور ان لوگوں نے حق شاگردی ادا کیا۔ اپنی بچیوں کی شادی کے لیے بڑے پریشان رہا کرتے تھے، اللہ کا فضل ہے کہ ان کی زندگی ہی میں سب کی شادی ہوگئی۔ ان کا انتقال مارچ ۲۰۰۹ء میں لگ بھگ ۷۲ سال کی عمر میں ہوا۔ بچیاں تو اپنے سسرال میں ہیں گھر میں صرف ان کی بیوہ بچی ہیں۔

مولانا مصلح الدین نامی ایک بزرگ تھے، بنگال میں رہتے تھے۔ سال میں کئی بار بھاگلپور آتے اور اپنے کو لکھنوی بتاتے اور ہفتہ ہفتہ بھر رہتے۔ وہاں ان کے مریدوں کا حلقہ تھا۔ ان کی خاطر تواضع اور ضیافت بالعموم ہمارے یہاں سے ہوتی۔ جب اکرم باروی صاحب جامعۃ الفلاح آئے تو یہ عقدہ کھلا کہ وہ لکھنؤ کے نہیں، جیراجپور اعظم گڑھ کے رہنے والے تھے۔ مولانا مصلح الدین صاحب کے لڑکے جناب افضل صاحب اور پوتے فیضان سلمہ نے اپنے گھر میں ان کو ٹیوشن پڑھانے کے لیے رکھ لیا اور ان کا بڑا خیال رکھتے۔ ناشتہ وہ انھیں کے یہاں کرتے۔ ناشتہ میں بڑا اہتمام ہوتا۔ اکرم باروی صاحب کہا کرتے کہ مولانا مصلح الدین صاحب کی خدمت تو آپ لوگوں نے کی اور فائدہ میں اٹھا رہا ہوں۔ جس دن غیر معمولی ناشتہ ہوتا مجھے شریک کرنے کی کوشش ضرور کرتے۔

جناب اکرم باروی صاحب کی دیانت داری اور امانت کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے کہ ایک ادارہ میں تقرر کے لیے ان کا انٹرویو ہونے والا تھا، انٹرویو سے ایک روز قبل ایک صاحب

نے جو انٹرویو بورڈ کے ممبر تھے انھیں ایک کاغذ تھمایا، انھیں کچھ شبہ ہوا لیکن ان کے احترام میں انھوں نے وہ کاغذ جیب میں رکھ لیا۔ انٹرویو کے بعد الگ سے ان صاحب نے ان سے پوچھا، کیا آپ نے وہ کاغذ دیکھا نہیں تھا؟ انھوں نے معذرت کی، بعد میں جب کاغذ نکال کر دیکھا تو ان کی جانب سے انٹرویو میں کیے جانے والے وہی سوالات تھے جو اس کاغذ پر درج تھے۔ انھوں نے مجھ سے بتایا کہ میری ہمت نہیں پڑی کہ انٹرویو سے پہلے اس کاغذ کو دیکھوں۔

جناب اکرم باروی کے جامعۃ الفلاح میں قیام کے دوران ان کے ایک خط کے جواب میں مولانا شہباز اصلاحی نے جو کچھ لکھا اس سے ان کی شخصیت پر روشنی پڑتی ہے۔ مولانا شہباز اصلاحی لکھتے ہیں؛

ندوہ۔۱۹/ذی الحجہ ۱۴ھ

برادر محترم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا خط ملا، آپ نے 'عید مبارک' لکھا ہے، پڑھ کر علامہ اقبال کا ایک شعر اندرونی کرب کے ساتھ یاد آیا۔

پیام عیش و مسرت ہمیں سناتا ہے
ہلالِ عید ہماری ہنسی اڑاتا ہے

دوسری جگہ ہلالِ عید کو مخاطب کر کے کہا ہے۔

بارشِ سنگِ حوادث کا تماشائی بھی ہو
امت مرحوم کی آئینہ دیواری بھی دیکھ
دیکھ مسجد میں شکست رشتۂ تسبیحِ شیخ
بت کدہ میں برہمن کی پختہ زناری بھی دیکھ

پتہ نہیں کیوں اور کیسے یہ اشعار یاد آ گئے، ورنہ اب اس طرح کے احساسات ماضی کی حسرت ناک یادیں ہیں، بے حسی اور بے دلی کا عجیب عالم ہے۔

بے بسی ہائے تماشا کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق
بے کسی ہائے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دین

لیکن چھوڑیے ان باتوں کو، اپنے خط کا جواب سنئے۔ خوشی ہوئی کہ آپ پوری محنت اور دیانت داری سے اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ ایک عمومی ڈھیلا پن جو آپ کے فکر و عمل دونوں

میں ہے اس سے بالقصد پرہیز کی ضرورت ہے۔ دنیا خوبیوں کا اعتراف بہت دیر میں کرتی ہے بلکہ بالعموم نہیں کرتی ہے لیکن کوتاہیوں پر مواخذہ بہت جلد کرتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے جو صورت پیدا فرمادی ہے اس کی قدر کیجیے اور جب تک کوئی دوسری بہتر اور قطعی صورت نہیں پیدا ہو جائے یکسوئی کے ساتھ اس پر جمے رہیے۔ استعفاء کی بات تو کبھی زبان و قلم پر نہ لائیے۔ ہاں اضافہ تنخواہ کی درخواست دینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ البتہ درخواست میں بہت زیادہ لجاجت یا مسکینی ظاہر کرنا مناسب نہیں ہے۔ بس اتنا کافی ہے کہ اس تنخواہ میں میرا کام نہیں چل پارہا ہے، تنخواہ معقول ہو جائے تو آدمی کسی حد تک اطمینان قلب کے ساتھ کام کر سکتا ہے۔ برادرم اصلح صاحب کے لیے دعا کرتا ہوں۔ ویسے میں کیا اور میری دعا کیا، لیکن اپنا فرض سمجھ کر آپ کے لیے بھی اور آپ کی والدہ محترمہ کے لیے بھی اور آپ کے اختر بھائی کے لیے بھی سب کے لیے دعا کرتا ہوں۔

اللہ تعالیٰ سب کی کوتاہیوں سے درگذر فرمائے اور سب کی عاقبت سنوارے۔ آمین

میری صحت کا حال بدستور ہے، بال بچوں کا حال بھی حسب سابق ہے۔ جی چاہے اور کوئی خاص تکدر نہ ہو تو میرے جاننے والے حضرات کو میرا سلام کہہ دیجیے۔

والسلام

شہباز

آج بھی جب اکرم باروی صاحب کی یاد آتی ہے تو دل میں ایک کسک سی اٹھتی ہے۔ وہ ہنستا مسکراتا چہرہ، سب کے لیے اپنے دل میں خیرخواہی اور محبت کے جذبات رکھنے والی شخصیت، جو غصہ ہونا جانتی نہیں، اگر ذرا سا کسی کو تکلیف پہنچ جائے فوراً معذرت کرنا اور معافی مانگ لینا جس کا امتیاز، جس کا استحصال ہوا اور بار بار ہوا اور یہ استحصال کرنے والے ان کے اپنے لوگ تھے پھر بھی انھوں نے اپنے مقصدِ زیست سے کبھی منھ نہیں موڑا۔ دمِ آخر تک اپنے نصب العین پر جمے رہے۔ آج ان کی یہ سب باتیں یاد آتی ہیں اور دل میں ایک درد سا اٹھتا ہے۔ اللہ مغفرت فرمائے اور جنت میں جگہ دے۔ بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔

آسماں تیری لحد پہ شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

☆☆☆

ماسٹر قاضی زین العابدین صاحب مرحوم

ادارہ☆

جناب قاضی زین العابدین صاحب نے جامعہ میں سات سال تک شعبہ اعلیٰ میں خدمات انجام دی تھیں، آپ مہاراشٹر کے رہنے والے تھے۔ یہاں آنے سے قبل موصوف گورنمنٹ اردو جونیئر کالج آف ایجوکیشن بالاپور ضلع آکولہ (مہاراشٹر) میں بحیثیت پرنسپل تھے۔ ریٹائر ہونے کے بعد آپ جامعہ تشریف لائے اور سات سال یہاں خدمات انجام دیں۔ آپ کو انگریزی پر دسترس حاصل تھی۔ طلبہ کو مطمئن کردینے کی صلاحیت سے مالا مال تھے۔

مصدقہ اطلاع کے مطابق مئی ۱۹۹۶ء میں ان کے گاؤں 'دساسر' مراوتی مہاراشٹر میں ان کے گھر پر رات کے وقت انہیں اور ان کی اہلیہ کو نامعلوم شرپسندوں نے قتل کرڈالا۔ تفصیل نہیں معلوم ہوسکی۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کی بال بال مغفرت فرمائے۔

☆☆☆

جس میں نہ ہو انقلاب، موت ہے وہ زندگی
روحِ امم کی حیات کشمکش انقلاب
نقش ہیں سب ناتمام، خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام، خونِ جگر کے بغیر

استادِ بے مثال — ماسٹر ارشد عالمؒ

عبدالبر اثری فلاحی☆

جامعۃ الفلاح کو کوئی اور نام دینا کتنا مناسب ہوگا یہ تو اہل علم و دانش بتائیں گے۔ لیکن اسے ''بہترین تجربہ گاہ'' ضرور کہا جاسکتا ہے۔ دینی تعلیم کے معاملہ میں چاہے نہ کہا جاسکے لیکن ''عصری تعلیم اور دینی تعلیم کے سنگم'' کے طور پر تو اسے تجربہ گاہ ماننا پڑتا ہے۔

عصری علوم کے جتنے اساتذہ یہاں آتے ہیں عموماً کچے ہوتے ہیں لیکن یہاں کا طریقہ تعلیم ایسا ہے کہ اگر کوئی صبر سے کام لے اور محنت کرے تو وہ بہت جلد پختہ بن جاتا ہے۔ اس کی سب سے عمدہ مثال ماسٹر ارشد عالم مرحوم ہیں۔ آپ سنجر پور اعظم گڑھ کے رہنے والے تھے۔ یکم فروری ۱۹۶۱ء کو ایک زمین دار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام عبدالرحیم تھا۔ گھریلو تعلیم کے بعد ایم۔ اے، بی ایڈ کیا۔ کچھ دنوں بارہ بنکی کے قریب نیوتنی کے ایک مدرسہ میں استاد رہے پھر جامعۃ الفلاح تشریف لائے۔

جب بحیثیت استاد جامعہ تشریف لائے تھے تو عصری اداروں کے عام فیض یافتہ افراد کی طرح وہ بھی واجبی سا انگریزی کا ملکہ رکھتے تھے۔ اسباق کے عمومی مفہوم کو سمجھ اور سمجھا سکتے تھے۔ عبارت کی باریکیوں اور وسعتوں تک رسائی محال تھی۔ چنانچہ جامعہ کے طریقہ تعلیم کے مطابق جب پڑھنا پڑھانا شروع کیا تو انہیں ابتداء میں کافی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ لفظ بہ لفظ عبارتوں کو حل کرنے کے لئے انہیں ڈکشنری اور ماہر اساتذہ کا سہارا لینا پڑا۔ پوری کتاب پنسل کے نشانوں سے رنگین ہوجاتی اور معانی اور استعمالات سے بھر جاتی تھی۔ اس معاملہ میں انہوں نے کبھی شرم وحیا کو آڑے نہیں آنے دیا۔ بڑے اساتذہ سے تو وہ رہنمائی حاصل کرتے ہی تھے اپنے شاگردوں سے بھی استفادہ کرنے میں انہیں کوئی ہچکچاہٹ نہ ہوتی۔ مرحوم میرے اساتذہ میں سے ہیں۔ فراغت کے بعد جب میں بھی اساتذہ کے زمرے میں شامل ہوگیا تو زبان و بیان کی باریکیوں پر عموماً مجھ سے بھی تبادلہ خیال کرتے اور بلا تکلف دلائل سے مطمئن ہونے کے بعد رایوں کو قبول فرماتے۔ اس طرز عمل نے انہیں چند ہی

☆ ناظم اعلیٰ (چیف ایگزیکیٹیو آفیسر)، فیروس ایجوکیشنل فاؤنڈیشن، ممبئی

سالوں بعد ماہر اساتذہ کی فہرست میں لا کھڑا کیا اور ایک وقت آیا کہ وہ آنے والے اساتذہ کے لئے مرجع وماٰوی بن گئے۔ سچ ہے "مَنْ جَدَّ وَجَدَ" جو محنت کرتا ہے وہ پاتا ہے۔ لیکن افسوس کہ جب وہ اس لائق بن گئے کہ وہ جامعہ کو زیادہ سے زیادہ فیض پہنچاتے تو چارو ناچار وہ شبلی نیشنل انٹر کالج اعظم گڑھ منتقل ہو گئے اور وہاں ان کا فیض عام ہوا۔ صلاحیت کی ہر جگہ قدر ہوتی ہے۔ وہاں جب جگہ خالی ہوئی تو وہاں کے اہل نظر نے انہیں سب سے زیادہ لائق و فائق پایا اور انہیں فوراً منتخب کر لیا۔ دوسرے تو اثر ورسوخ اور کچھ دے دلا کر منتخب ہوتے تھے اور آپ محض اپنی فاضلانہ صلاحیت کی وجہ سے منتخب کر لئے گئے۔ آپ کو جامعہ سے ایک طرح کا انس ومحبت پیدا ہو چلا تھا اس لئے وہ یہیں مستقل رہنا چاہتے تھے چنانچہ بارہا انہوں نے اس کا اظہار بھی کیا لیکن حالات سازگار نہ رہے اور مجبوراً انہوں نے جامعہ کو خیر آباد کہنے کا فیصلہ کیا۔ یہ لمحہ فکر یہ ضرور ہے کہ ہم قدر دانی کے تقاضوں کو پورا کرنے میں بسا اوقات پورے نہیں اترتے اور ہمیں قیمتی اثاثوں سے محروم ہونا پڑتا ہے۔ اس پر قابو پانے کی راہ ڈھونڈھنی چاہئے۔ جامعہ سے تعلق خاطر ہی تھا کہ شبلی نیشنل انٹر کالج منتقل ہونے کے بعد بھی برابر جامعہ تشریف لاتے رہتے اور جامعہ کے علمی و تعلیمی کاموں میں رضا کارانہ تعاون دیتے رہتے۔

تدریس کے علاوہ تربیتی کام یعنی طلبہ کی نگرانی کا کام آپ کے سپرد کیا گیا تو اسے بھی بحسن وخوبی انجام دیا۔ بلکہ اس کے لئے بھی اپنے آپ کو کھپا دیا۔ آپ کا گھر سنجر پور اعظم گڑھ تھا معمولاً ہر ہفتے گھر جایا کرتے تھے لیکن جب نگرانی کا کام سنبھالا تو آمد ورفت کم ہو گئی۔ کیونکہ فطری طور پر چھٹی کے ایام میں نگرانی کا کام کچھ زیادہ ہی بڑھ جاتا ہے۔ چنانچہ رک کر اس کا حق ادا کرنے کی کوشش کرتے اور طلبہ کی چھٹی کو مفید بنانے اور غیر تدریسی سرگرمیوں کو مؤثر بنانے کے لئے کوشاں رہتے۔ اس کام میں ایک وقت ایسا بھی آیا کہ ایک شریر بچے نے ناسمجھی میں آپ پر حملہ کر دیا۔ آپ زخمی بھی ہوئے۔ ذمہ داران جامعہ نے طے کیا کہ اس بچے کا اخراج کر دیا جائے، لیکن آپ نے اخراج سے منع کیا اور بچے کو معاف کر دیا۔ ان ہنگامی دنوں میں ناچیز کو ان کے ساتھ رہنے اور خدمت کا موقع ملا۔ لیکن جو کام خود کر سکتے تھے اس کیلئے کبھی تیار نہ ہوئے کہ میں کر دوں۔ البتہ جہاں مجبوری ہوتی وہاں بھی بہ تکلف ہی خدمت لیتے۔ اس موقع سے بہت شدت کے ساتھ میں نے محسوس کیا کہ بڑوں کی صحبت کے بغیر تربیت مکمل نہیں ہوتی۔ آپ کی ہمہ وقت صحبت نے بہت کچھ سیکھنے کا موقع فراہم کیا اور بہت سی قدروں سے آگاہ کیا۔ جن کے بارے میں اب تک صرف سنتا رہا تھا اور آج کے

زمانے کیلئے اسے مشکل سمجھتا تھا۔

آپ میرے استاد تھے لیکن کبھی ایسا محسوس نہیں ہوا کہ استاد اور شاگرد والا معاملہ کر رہے ہوں بلکہ بالکل ساتھی اور شریک جیسا معاملہ کرتے۔ مریض کی حیثیت سے کوئی چیز آتی تو بھی بغیر مجھے کھلائے خود نہ کھاتے۔ بعد میں یہ معمول ہو گیا کہ جب گھر جاتے تو میرے لئے کچھ نہ کچھ ضرور لاتے۔ طبیعتاً کم گو تھے مگر زبان میں بڑی سادگی اور شیرینی تھی اور باتیں دل کو چھو لینے والی ہوا کرتی تھیں۔

جب وہ جامعہ تشریف لائے تھے تو عام اسکول کلچر کے مطابق پینٹ شرٹ ان کا لباس تھا۔ لیکن جامعہ کے دینی ماحول میں وہ بہت زیادہ کھٹکتا تھا۔ چنانچہ یہاں کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے انہوں نے بہت جلد اپنا لباس بدل لیا۔ ابتداء میں کرتا اور علی گڑھ پاجامہ پہننا شروع کیا اور پھر علی گڑھ شیروانی پسند آئی تو اسے زیب تن کرنا شروع کیا۔ پھر تو علی گڑھ شیروانی اور پاجامہ ہی آپ کا مستقل لباس بن گیا۔ حتی کی شبلی نیشنل انٹر کالج اعظم گڑھ منتقل ہو گئے پھر بھی یہی لباس پہن کر کالج جاتے۔ حالانکہ کالج کا عمومی کلچر اب تک پینٹ شرٹ ہی چلا آ رہا ہے۔

ابھی طبعی عمر کو نہیں پہنچے تھے کہ اچانک ایک سڑک حادثہ میں ۱۳ر رمضان المبارک مطابق ۷ر اکتوبر ۲۰۰۶ء بروز اتوار اللہ کو پیارے ہو گئے۔ "اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ" شاید اللہ انہیں اپنے قریب رکھنا زیادہ پسند کر رہا تھا۔ اچانک حادثے میں وفات کی خبر سے طبیعت کافی مضمحل ہوئی لیکن اللہ کے فیصلے کے آگے کس کی مجال ؂

موت سے کس کو رستگاری ہے
آج وہ کل ہماری باری ہے

اللہ سے دعا ہے کہ مرحوم استاد کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے اور پس ماندگان کو صبر جمیل کی توفیق بخشے۔ آمین

مجھ جیسے ہزاروں شاگرد پس ماندگان میں شامل ہیں۔ مرحوم یقیناً استاد بے مثال تھے۔ آج بھی ان کی شفقت ومحبت رلاتی ہے اور محنت وجدت مہمیز کرتی ہے۔

آپ کے یہاں پانچ بیٹے اور چار بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ بیٹے ساجد علی، محمد خالد اصلاحی، محمد شارق، محمد فارس، محمد حاذق ہیں۔ بیٹیاں سعیدہ فلاحی، ثنا فلاحی، فرح فلاحی، حرا فلاحی ہیں۔ الحمد سب تعلیم یافتہ ہیں۔ اللہ ان سب پر اپنا سایہ خاص قائم ودائم رکھے۔ آمین ثم آمین

☆☆☆

ماسٹر مسیحا قادری صاحب مرحوم

محمد اسماعیل فلاحی ☆

جامعۃ الفلاح کے اساتذہ کے تذکرہ میں اگر ماسٹر مسیحا قادری صاحب کا نام نہ آئے تو یہ تذکرہ نامکمل رہے گا۔ مسیحا قادری صاحب کی پیدائش ۱۹۲۹ء میں موضع رام نگر، قصبہ لار، ضلع دیوریا کے ایک علمی گھرانے میں ہوئی۔ آپ کے والد عبدالمجید صاحب مرحوم پرائمری اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے اور گاؤں کے معززین میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ مسیحا قادری صاحب کو اللہ تعالیٰ نے بچپن سے خداداد صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ ہائی اسکول، انٹر اور بی اے مکمل کرنے کے بعد گورکھپور یونیورسٹی سے معاشیات میں ایم اے کیا اور اس کے بعد ایل ٹی بھی مکمل کیا۔

تعلیم کی تکمیل کے بعد قصبہ لار کے مشہور اقلیتی تعلیمی ادارہ اویس قرنی مخدوم انٹر کالج میں انگریزی کے استاذ کی حیثیت سے تقرری عمل میں آئی۔ آگے چل کر معاشیات کے لکچرر مقرر ہوئے۔ لیکن اس کے باوجود انگریزی سے آپ کی دلچسپی برقرار رہی اور طلبہ کو انگریزی کی تعلیم دیتے رہے۔ آپ کی انتظامی صلاحیتوں سے متاثر ہوکر آپ کو کالج کے داخلہ اور امتحانات کا ذمہ دار بنایا گیا۔ اس کے بعد وائس پرنسپل بنے اور آخر میں دو سال پرنسپل رہتے ہوئے ۱۹۸۷ء میں ریٹائر ہوئے۔

ریٹائرمنٹ کے چند سالوں بعد دینی تعلیم سے شغف اور دینی ماحول کی کشش انھیں جامعۃ الفلاح کھینچ لائی، کلیۃ البنات میں اونچی کلاسوں میں انگریزی کے استاد کی حیثیت سے تقرر عمل میں آیا۔ ان کی صلاحیتوں کو دیکھ کر کچھ دنوں بعد معاون مہتمم برائے کلیۃ البنات بنا دیا گیا۔ یہ بڑی اہم ذمہ داری تھی۔ ایک طرف طالبات اور معلمات کے اندر نظم وضبط پیدا کرنا، دوسری جانب سرپرستوں کو ڈیل کرنا، تیسری طرف روز نت نئے مسائل سے نمٹنا آسان کام نہیں اس ذمہ داری کو انھوں نے بحسن وخوبی نبھایا۔ طلبہ بھی ان سے انگریزی میں استفادہ کرتے تھے۔

☆ استاذ تفسیر، جامعۃ الفلاح، اعظم گڑھ

وہ طلبہ کے ہمدرد، اساتذہ، معلمات اور ذمہ داروں کے خیر خواہ تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ یہاں ایسا ماحول بنے جو الدین النصیحہ (دین سرتاپا خیر خواہی کا نام ہے) کی سچی تصویر ہو۔ ان سے طلبہ، طالبات، متعلق اساتذہ اور معلمات اور ذمہ داران سب مطمئن تھے میں نے کسی کو ان کا شاکی نہیں پایا۔ ان کی کوششوں سے ان کے گھر کے قریب ان کے گاؤں میں ایک مسجد کی بھی تعمیر ہوئی۔ بڑے دلدار اور سخی تھے۔ گھر سے جب آتے، خستہ، حلوا، چوڑا وغیرہ لاتے اور دوستوں کو کھلاتے۔ میں ان دنوں حسن پور کے باغ میں جاوید سلطان صاحب فلاحی کے گھر میں رہتا تھا۔ ازراہِ کرم کبھی کبھی تشریف لاکر حوصلہ افزائی کرتے تھے۔

بڑے حوصلہ مند، صائب الرائے اور جرأت مند انسان تھے۔ ایک بار ان کی پرنسپلی کے زمانہ میں کسی استاد سے پڑھانے میں کچھ غلطی ہوگئی، لڑکے کا سرپرست غصہ میں بھرا ہوا آکر اول فول بکنے لگا۔ پہلے تو انھوں نے اسے ٹھنڈا کرنا چاہا، سمجھایا لیکن جب اس کے اندر کوئی نرمی نہیں آئی تو انھوں نے کہا ٹھیک ہے جایئے۔ ہمارا استاد دو اور دو (2+2) پانچ پڑھائے گا، آپ کو اپنے بچے کو پڑھانا ہے تو پڑھایئے ورنہ لے جایئے۔ بعد میں استاد کو اس کی غلطی پر متنبہ بھی کیا۔

وہ اپنا بنایا ہوا منجن استعمال کرتے تھے اور اسے دانتوں کے لیے بہت مفید بتاتے تھے۔ کہتے پائیریا کے لیے بھی مفید ہے۔ ہلتا ہوا دانت ہلنا بند کردیتا ہے۔ ہم نے بھی ان کے نسخے کو استعمال کیا اور دوسروں کو استعمال کرایا اور مفید پایا۔ وہ نسخہ یہ ہے گیرو ڈیڑھ سو گرام، ٹھیکری سوا سو گرام اور سیندھا نمک بھی سوا سو گرام۔ ان تینوں کو کوٹ کر یا پیس کر منجن بنانا ہوتا ہے۔

پھر ان کی صحت خراب رہنے لگی، مختلف عوارض کا شکار ہوگئے۔ ان کی بیماری کے زمانہ میں دو بار ہم ان سے ملنے ان کے گھر لار گئے۔ اہلیہ کا پہلے ہی انتقال ہوگیا تھا۔ ان کے بھی اس دنیا سے رخصت ہونے کا وقت آگیا اور ۲۹ر نومبر ۲۰۰۳ء کو انھوں نے ہمیشہ کے لیے آنکھیں بند کرلیں اور اپنے پیچھے تین بیٹے اور تین بیٹیاں سوگوار چھوڑ گئے جو سب خوشحال زندگی گذار رہے ہیں۔

اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے اور ہمارا خاتمہ بھی بالخیر کرے۔ جب بھی ان کی یاد آتی ہے، دل کی عجیب کیفیت ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے یہ چند سطریں ان کی یاد میں سپرد قلم کردیں۔

☆☆☆

مولانا محمد ایوب جیراج پوری

مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی ☆

مولانا محمد ایوب بن محمد صدیق اپنے آبائی وطن موضع جیراج پور ضلع اعظم گڑھ میں ۱۹۱۸ء مطابق ۱۳۳۷ھ میں پیدا ہوئے۔ مکتب کی تعلیم گھر اور گاؤں میں حاصل کی۔ پھر مدرسۃ الاصلاح سرائے میر میں داخلہ لیا اور یہاں کے نصاب کے مطابق علوم وفنون کی تحصیل کرکے فاتحہ فراغ پڑھا، اساتذہ میں مولانا شبلی متکلم، مولانا اختر احسن، مولانا امین احسن بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

تعلیم وتحصیل کے مراحل طے کرلینے کے بعد درس وافادہ کا سلسلہ شروع کیا اور قصبہ نگرام لکھنؤ کے مدرسہ میں تقریباً دو سال تدریسی خدمت انجام دی، بعدازاں مولانا احمد سعید دہلوی ناظم عمومی جمعیۃ علماء ہند کی دعوت پر جمعیۃ کے شعبۂ تصنیف وتالیف سے وابستہ ہوگئے۔ اسی زمانہ میں 'سیرت رسول' پر ایک کتاب مرتب کی جس کے متعدد ایڈیشن اب تک شائع ہوچکے ہیں۔ یہاں سے الگ ہوکر شہر اعظم گڑھ کے محلّہ میر باغ پیٹھ کے مدرسہ اسلامیہ میں بحیثیت معلم چند سال بچوں کی تعلیم وتربیت میں مشغول رہے۔ بعدازاں مدرسہ الٰہیات کانپور آگئے اور چار سال یہاں بھی درس وتدریس کی خدمت انجام دی۔ اسی دوران یہ درسگاہ مالی اور انتظامی بحران میں مبتلا ہوکر ختم ہوگئی تو یہاں سے درسگاہ اسلامی رامپور منتقل ہوگئے اور یہیں سے ۱۹۸۶ء میں ریٹائر ہوکر وطن واپس آئے اور تقریباً ڈھائی تین سال گھر پر قیام کے بعد یکم جون ۱۹۸۹ء میں جامعۃ الفلاح بلریاگنج کے شعبۂ کلیۃ البنات سے وابستہ ہوگئے۔ تقریباً دس سال یہاں تدریسی خدمت انجام دی پھر پیرانہ سالی کی بنا پر وہاں سے سبکدوش ہوکر گھر چلے آئے اور گھر ہی کے زمانہ قیام میں ۲۹؍جنوری ۱۹۹۹ء مطابق ۱۴۲۰ھ کو راہی دار آخرت ہوگئے۔

مولانا مرحوم کا خصوصی مضمون صرف ونحو تھا جو برابر ان کے زیر درس رہا۔ ان دونوں فن

☆استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند

میں انھیں اچھی مہارت حاصل ہوگئی تھی، چنانچہ 'تعلیم النحو' کے نام سے فن نحو میں دو حصوں میں ایک کتاب بھی مرتب کی جو مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کے نصاب تعلیم سے متعلق مدارس میں مقبول ہوئی۔ کتاب کی ترتیب میں مولانا فراہی کی 'اسباق النحو' کی پیروی کی گئی ہے اور مسائل نحو کے بیان میں 'النحو الواضح' کے طرز کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اس لیے تعلیم النحو، النحو الواضح اور اسباق النحو دونوں کے لیے معاون کی حیثیت رکھتی ہے۔

اسی طرح عام لوگوں کو عربی زبان سکھانے کی غرض سے دو جلدوں میں 'آؤ عربی سیکھیں' کے نام سے ایک ریڈر مرتب کی جو شائع ہوکر مقبول ہوئی۔ مولانا مرحوم ایک اچھے مترجم بھی تھے۔ چنانچہ علامہ ابن القیم کی کتاب 'امثال القرآن' کا ترجمہ کیا جو پہلے بالاقساط 'ترجمان القرآن' میں شائع ہوا پھر کتابی شکل میں بھی طبع ہوا، اس کے علاوہ ان کی دو کتابیں اور چھپ کر شائع ہوئیں: (۱) عورت تہذیب کے دوراہے پر (۲) پردہ اور اسلام۔ ان مستقل کتابوں کے علاوہ انھوں نے کثرت سے مضامین بھی تحریر کیے جو زیادہ تر ماہنامہ 'الفرقان' میں شائع ہوئے۔ نیز ترجمان القرآن، الحسنات، زندگی، ذکریٰ وغیرہ ماہناموں میں بھی ان کے مقالات شائع ہوئے ہیں۔ اگر ان سب مضامین کو یکجا کردیا جائے تو ایک اچھی خاصی کتاب بن جائے گی۔

مولانا موصوف نماز کے بہت پابند تھے، جب تک اپنے گاؤں میں رہے پنج وقتہ اور جمعہ کی نمازوں کی امامت یہی کرتے تھے، نماز اور تدریس ان کے ذہن پر چھائی رہیں حتیٰ کہ آخری لمحات میں جب ہواس بجا نہیں رہ گئے تھے، کہا کرتے تھے کہ پانی لاؤ وضو کرنی ہے، چھڑی اور شیروانی لاؤ مدرسہ جانا ہے۔ 'کما تعیش، تموت'

سادگی، کم گوئی اور قناعت واستغناء ان کے جوہری اوصاف تھے۔

☆☆☆

شوق مری لے میں ہے، شوق مری نے میں ہے
نغمۂ اللہ ھُو میرے رگ و پے میں ہے

آہ! ماسٹر جنید احمدؒ

بچے اداس نازش طفلاں چلا گیا

عبدالبراثری فلاحی☆

شروع سے جامعہ کی تعمیر وترقی اور اس کے تعلیمی وتربیتی نظام کو بہتر بنانے میں جن اہم شخصیات نے قربانیاں دی ہیں ان میں ایک اہم نام استاذ گرامی ماسٹر جنید احمد صاحب کا بھی ہے، جواب ہمارے درمیان نہیں رہے۔ ۹/اکتوبر ۱۹۹۹ء کو اپنے رب حقیقی سے جاملے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

اواخر ۱۹۵۹ء کی بات ہے جبکہ جامعہ 'مدرسہ اسلامیہ' کے نام سے چل رہا تھا اور اس کے ذمہ داران اسے مزید ترقی دینے کا خواب دیکھ رہے تھے، چنانچہ جب درجہ ششم کھلا تو ہندی اور انگریزی کے استاذ کی ضرورت پڑی اور ذمہ داران کی نظر انتخاب آپ پر پڑی۔ انہوں نے آپ سے گفتگو کی اور ادارے کی خاطر قربانی کا مطالبہ کیا۔ آپ کی والدہ سے گفتگو کی اور ادارے کی ضرورت کا حوالہ دیا۔ آپ کی نیک طینت والدہ نے حامی بھردی تو اپنی والدہ کی خواہش کے احترام، ادارے کی ضرورت اور اپنے خانگی مسائل کی وجہ سے آپ نے اس خدمت کو قبول کرلیا اور جنوری ۱۹۶۰ء سے صرف ۳۰/روپئے ماہانہ پر اپنی جوانی لگادی حالانکہ آپ ان دنوں ممبئی میں نیوی کے اندر ٹریننگ حاصل کررہے تھے اور توقع تھی کہ آپ کا سلیکشن ہوجائے گا لیکن انسپکٹر سے کہہ کر کینسل کرایا اور گھر رہ کر کے والدہ کی خدمت اور خواہش کو ترجیح دی۔

آپ ۱۹۳۹ء میں پیدا ہوئے تھے، والد کا نام جواد تھا، آپ نے مال تاڑی اعظم گڑھ سے ہائی اسکول کیا تھا۔ کچھ دنوں ممبئی میں قیام کے بعد جب جامعہ سے وابستہ ہوئے تو درمیان میں چند سال کو چھوڑ کر پوری عمر یہیں کھپادی۔ ابھی گذشتہ سال ریٹائر کئے گئے تھے۔ آپ کی شادی

☆ناظم اعلیٰ (چیف ایگزیکیٹو آفیسر)، فیروس ایجوکیشنل فاؤنڈیشن ممبئی

علاؤالدین پٹی ہوئی تھی، زوجہ محترمہ کا نام طیب النساء ہے، ادھر دو تین سالوں سے شدید بیمار رہنے لگے تھے۔ ابتداء تو گھٹیا کی شکایت اور پیروں میں تکلیف تھی لیکن ادھر رہ کر خون بننا بند ہوجانے کا عارضہ لاحق ہوگیا تھا، علاج کی غرض سے ممبئی بھی لے جائے گئے تھے۔ تشخیص کے بعد وہیں سے دوا چل رہی تھی، اتار چڑھاؤ آتا رہتا تھا لیکن یہ احساس کبھی نہیں پیدا ہوا کہ اس قدر جلد ہمیں داغ مفارقت دے جائیں گے۔ گرچہ آخری اوقات میں بعض باتیں کچھ اس انداز سے کرنے لگے تھے کہ گویا اب ان کا چل چلاؤ ہے مثلاً اپنی چھوٹی بچی مدثرہ کو اگست ۱۹۹۹ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں B.A. کے اندر داخلہ دلایا تھا آخری اوقات میں اس کے تکمیل تعلیم کی فکر لاحق تھی تو ایک مرتبہ اہلیہ سے کہنے لگے 'اگر لڑکے (سلمان اور طارق) خرچ نہ دیں تو میرے اکاؤنٹ میں اتنی رقم ہے کہ B.A. مکمل کرسکتی ہے۔'

گرچہ آپ نے بہت اعلیٰ تعلیم حاصل نہیں کی تھی لیکن علم کے بہت قدرداں تھے، اپنی تمام تر غربت اور پریشانیوں کے باوجود اپنے بھائی بہن اور اپنی اولاد کو اعلیٰ تعلیم دلانے کی کوشش کی۔ اپنے بھائی کو جامعہ ملیہ اسلامیہ بھیجا اور قصبے میں سب سے پہلے اپنی بڑی بچی قانتہ کو اعلیٰ تعلیم کے لیے جامعۃ الصالحات رامپور روانہ کیا، حالانکہ بچیوں کا معاملہ نازک ہوتا ہے، چنانچہ جب آپ نے پہل کی اور وہاں بھیجنے کا فیصلہ کیا تو محترمہ قانتہ صاحبہ کی سہیلیوں نے اپنے سرپرستوں سے بھی بھیجنے پر اصرار شروع کردیا اور ان سرپرستوں نے آپ کو سمجھانے کی بھی کوشش کی لیکن آپ کی ہمت اور اعتماد کو دیکھتے ہوئے پھر وہ بھی اپنی بچیوں کو بھیجنے کے لیے تیار ہوگئے، چنانچہ یہی وہ قافلہ ہے جس نے واپس آکر کلیۃ البنات جامعۃ الفلاح کو سنبھالا دیا، چنانچہ محترمہ قانتہ صاحبہ کئی سالوں ہیڈ معلّمہ رہ کر گذشتہ سال سبکدوش ہوکر علی گڑھ تشریف لے گئی ہیں اور سابق ہیڈ معلّمہ محترمہ سلمیٰ جلیل صاحبہ بھی اسی قافلے سے تعلق رکھتی ہیں۔

گرچہ آپ نے اسکول میں تعلیم حاصل کی تھی، لیکن علم دین کی اہمیت خوب سمجھتے تھے، چنانچہ آپ نے اپنی بعض بچیوں کو حافظ قرآن بھی بنایا اور اس کے لیے سوجتن کیے اپنی بچی سمیہ کو حفظ کرانے کے لیے جامعۃ الطیبات جین پور میں داخل کرایا لیکن وہاں کے حالات سے بے زار ہوکر وہ بھاگ آئی۔ ناظم جامعۃ الطیبات جناب شمس الدین صاحب سے آپ نے وجہ پوچھی تو انہوں نے کہا کہ 'وہ حفظ نہیں کرسکتی، ادھر ادھر زیادہ مشغول رہتی ہے۔' لیکن آپ ناامید نہیں تھے گھر پر ہی حفظ کرانا شروع کیا۔ خود سنتے، پھوپھی سنتیں اور حافظ احسان الحق صاحب کی خدمات حاصل کیں، اس طرح

اس نے مکمل حفظ کرلیا اور گاؤں کی سب سے پہلی حافظہ بن گئی۔

بچوں کی تعلیم سے آپ کو خصوصی دلچسپی تھی، چنانچہ قاضی عدیل عباسی صاحب نے جب انجمن تعلیمات دین کے تحت گاؤں گاؤں مکاتب کا جال پھیلانے کی مہم چھیڑی تھی تو اس وقت ڈاکٹر خلیل احمد صاحب اور مولانا عیسیٰ صاحب کے ساتھ آپ نے علاقے کے ہر ہر گاؤں کا دورہ کیا تھا جس کے نتیجے میں تقریباً ہر جگہ مکاتب قائم ہوئے تھے خود انہوں نے سب سے پہلے اپنے گھر پر نرسری کھولی اور اب تو گویا اس کی روچل پڑی ہے۔

آپ بہترین معلم تھے بچوں کی نفسیات خوب سمجھتے تھے، اس کا خیال رکھتے ہوئے پڑھاتے تھے، ذہین اور شریر طلبہ پر خصوصی نظر رکھتے تھے، طلبہ سے اس طرح گھل مل جاتے تھے کہ یہ احساس ہی نہ ہونے دیتے کہ وہ استاذ ہیں۔ دارالاقامہ کے نگراں بھی رہے، ان کی نگرانی کا ایک الگ ہی نرالا انداز تھا۔ بسااوقات انہیں طلبہ کے کمروں کی صفائی کرتے اور راتوں کو پہرہ دیتے ہوئے بھی پایا گیا۔

ہندی آپ کا اصل مضمون تھا، برابر آپ کے زیر درس رہا ہندی قواعد پر جو کتاب 'ساہتیہ سمن' کے نام سے ادارہ علمیہ جامعۃ الفلاح سے شائع ہوئی ہے اور مختلف مقامات پر شامل نصاب ہے وہ آپ ہی کی تیار کردہ ہے۔

آپ کے اندر تحریر کا ملکہ بھی تھا کوئی کتاب تو نہیں لکھی البتہ مضامین لکھتے رہتے تھے، جو حیات نو بلریا گنج اسلامک مومنٹ نئی دہلی اور سہ روزہ دعوت نئی دہلی وغیرہ کے صفحات میں بکھرے پڑے ہیں۔ بالخصوص ان موضوعات اور پہلوؤں پر قلم اٹھاتے تھے جنہیں لوگ نظرانداز کردیتے تھے۔ آپ جماعت اسلامی ہند کے رکن بھی تھے اور تاحیات وابستہ رہے۔ اس کی سرگرمیوں میں برابر شریک رہتے۔ پروگراموں میں تقریریں بھی کرتے اور اچھی تقریر کرتے۔ ٹو دی پوائنٹ گفتگو رکھتے اور موضوع کا حق ادا کردیتے۔

سادگی آپ کا خاص وصف تھا بناؤ سنگار اور تصنع سے کوسوں دور تھے، بسااوقات کچھ انتہا پسندی کا گمان ہوتا، ظاہری شکل وصورت اور رکھ رکھاؤ سے یہ اندازہ لگانا مشکل ہوتا کہ اس سراپا کے اندر اس قدر باکمال انسان چھپا ہوا ہے، چنانچہ جب بات کرتے تبھی مخاطب کو اندازہ ہوتا کہ اتنی اچھی صلاحیت کے مالک ہیں۔ ایک مرتبہ جامعہ کی سفارت پر ممبئی تشریف لے گئے، جناب عبدالعزیز صاحب (عجّو پہلوان) کے یہاں پہنچے جن کا صابن کا بہت بڑا کاروبار تھا، ان سے جب مدرسے کی

ضروریات رکھیں تو انہوں نے امتحاناً کہا کہ 'رقم تو نہیں ہوسکتی چاہیں تو صابن دلادوں میرے پاس یہی ہے' ظاہر ہے سفیر ڈھوکر تو نہیں لاسکتے، اس لیے عموماً معذرت کردیتے تھے لیکن آپ نے جواب دیا 'فرمایئے کتنے ٹرک منگوادوں' جواب سن کر انہوں نے صالحیت کو بھانپ لیا پھر تعاون فرمایا اور اس قدر گرویدہ ہوگئے کہ برابر ایک دوسرے کو تحفے تحائف بھیجنے لگے۔

جرأت وبے باکی آپ کا خاصہ تھی کسی چیز کا آپ خوف نہیں کھاتے تھے، جہاں جو چیز کھٹکتی فوراً انگلی اٹھاتے بلکہ اس معاملہ میں آپ جارح واقع ہوئے تھے، آپ کی اس جرأت مندی کا اعتراف مولانا عبدالحسیب صاحب سابق مہتمم جامعۃ الفلاح نے بھی اپنے تعزیتی تقریر میں کیا اور کافی دنوں تک آپ کے رفیق سفر رہے۔ مولانا عبدالرؤف صاحب قاسمی مبارکپوری کو جب آپ کی وفات کی خبر ملی تو برجستہ کہا ''صاف گو اور حق بات کہنے والے تھے، اسی لیے سب کی نظر میں کھٹکتے تھے، اب وہ نہیں رہے'' آپ کا یہی امتیازی وصف تھا کہ علاقے بھر میں پنچایتوں کے اندر بلائے جاتے تھے، جب کسی کا حق دلانے کی بات آتی تو آپ پیش پیش رہتے اور ان کی موجودگی سے مظلوم کو یک گونہ اطمینان رہتا کہ اسے ضرور اس کا حق مل جائے گا، آپ کی یہ جرأت وبے باکی ہی تھی کہ گاؤں کے لوگوں کو تعزیہ بنانے سے منع کیا نہ مانے تو ڈھول لاکر جلادیا۔ آپ بے لوثی اور اخلاص کی دولت سے مالا مال تھے، جس کی جس قدر خدمت بن پڑتی ضرور کرتے اور اس میں کسی غرض کا دخل نہیں ہوتا۔ چنانچہ آپ کے قدیم رفیق وبزرگ حکیم ایوب صاحب جن کے ساتھ ہمیشہ آپ کا اٹھنا بیٹھنا رہا ایک ملاقات میں فرمانے لگے ''میرے دوست تو بہت تھے لیکن سب چھوڑ گئے، صرف ماسٹر جنید نے ساتھ دیا وہ مخلص تھے، مطلب کے نہیں تھے۔''

اے اللہ تو ان کا نعم البدل جامعہ کو عطا فرما، تیری رحمت سے کچھ بھی بعید نہیں اور انہیں ان کی خدمت کے صلہ میں جنت الفردوس میں جگہ دے۔ (آمین ثم آمین)

☆☆☆

عشق کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات
عشق سے نورِ حیات، عشق سے نارِ حیات

ماسٹر جنید احمد......میرے بڑے بھائی

محمد عارف خان☆

مولانا انیس احمد مدنی نے فرمائش کی کہ گولڈن جوبلی کے موقع پر 'حیات نو' کا خصوصی شمارہ ''اساتذہ نمبر'' شائع ہونے جارہا ہے، اس میں آپ ماسٹر جنید احمد کے بارے میں لکھئے۔ یہ جانتے ہوئے کہ میری تحریر کا معیار 'حیات نو' جیسے مؤقر اور علمی مجلّہ کی سطح تک نہیں پہنچ سکتا پھر بھی ایک خوشگوار فریضہ سمجھ کر حکم کی تعمیل کے علاوہ چارہ نہیں۔

کسی بھولے بسرے لمحے یا تجربے کی یاد ایک طرح کی بازیافت ہے، پھر اس لمحے یا تجربے کا حصار اگر کسی ایسے فرد کے گرد پھیلا ہو جس سے بچھڑنے کا احساس آپ کی اپنی ذات کے ایک حصے سے محرومی کا احساس بن جائے تو ایسی صورت میں اسے یاد کرنا اپنے آپ کو پانے کے مترادف ہے۔ یادوں کے وسیلے سے مجھ پر اپنے حال کا یا اس وقت کا ظہور ہوتا ہے جس نے مجھے گھیر رکھا ہے۔ آنکھوں میں بسے ہوئے کتنے منظر اجڑے، کتنی بستیاں تاراج ہوئیں مگر یادوں کا شہر جوں کا توں آباد ہے۔ اس آبادی میں مجھے کھوئے ہوؤں کا سراغ بھی ملتا ہے اور اپنا بھی کہ میرے لیے اپنا وجود عبارت ہے ان لمحوں، تجربوں، موسموں اور چہروں سے جو گزر کر بھی سامنے ہیں جن کا ذکر ایک لحاظ سے آپ بیتی کا بیان ہے۔

بہت دن ہوئے ایک جملہ نظر سے گزرا تھا کہ اپنے ہیرو کے بہت قریب مت جاؤ اس کی روشنی آنکھوں کو خیرہ کردے گی۔ لیکن ماسٹر جنید احمد کے ساتھ میرا معاملہ یہ رہا کہ وہ میرے بڑے بھائی اور مربی بھی تھے، استاد اور آئیڈیل بھی تھے اور ساتھ ہی رفیق کار، شریک مشورہ، ہم سفر، ہم نوا اور ہمراز بھی تھے۔ ان کے ساتھ میرا تعلق فطری بھی تھا، جذباتی بھی تھا اور شعوری بھی۔ ایسے میں کچھ باتیں جو اوروں کے لیے غیر معمولی ہوں اور میں اسے معمولی سمجھ کر نظر انداز کردوں اور اس کا بھی امکان ہے کہ

☆ممبر مجلس شوریٰ جامعۃ الفلاح، اعظم گڑھ

چند غیر اہم باتوں کو جن سے میرا جذباتی رشتہ ہو بیان کردوں۔ پھر بھی ان دونوں نقائص سے بچنے کی حتی المقدور کوشش کروں گا۔ یہ دعوی تو نہیں کرسکتا کہ اس میں صد فیصد کامیاب ہو پاؤں گا۔

ماسٹر جنید احمد ۱۹۳۶ء میں بلریا گنج کے متوسط طبقہ کے ایک خاندان میں پیدا ہوئے۔ والد محترم ابھی کمسن تھے کہ دادی کا انتقال ہوگیا۔ دادا پاگل پن کا شکار ہوگئے۔ بڑے دادا نہایت شفیق اور نیک تھے، لوگ انھیں میاں جی کہتے تھے۔ انھوں نے بھتیجے کو اپنی اولاد سے زیادہ پیار دیا لیکن گھر کے چند افراد کے برتاؤ اور سلوک سے بددل ہوکر چودہ سال کی عمر میں بمبئی چلے گئے۔ وہاں ایک بزرگ کے مرید ہوگئے۔ ان کا ذکر بڑی عقیدت سے کرتے لیکن کبھی ان کا نام نہیں لیتے۔ کسی نے کبھی ان کا نام پوچھنے کی ہمت نہیں کی۔ ان کی صحبت میں رہ کر دنیا سے بیزاری کی حد تک بے رغبت ہوگئے لیکن ترک دنیا کے خیال سے ہمیشہ محفوظ رہے۔ محنت اور جفاکشی کی عادت ڈالی۔ زمین، جائیداد، تجارت اور کاروبار ان کے مزاج سے میل نہیں کھا سکے۔ مزدوری کو رزق حلال کے حصول کا واحد ذریعہ خیال کیا۔ آخر وقت تک کپڑا مزدور بن کر اس پر عامل بھی رہے۔ والدہ کی تعلیم گھریلو تھی لیکن قرآن بڑی روانی سے پڑھتی تھیں۔ ہمارے گھر میں قرآن اتنی روانی کے ساتھ کوئی نہیں پڑھ سکتا تھا۔ روزانہ ایک پارہ کی تلاوت اور ایک رکوع ترجمہ اور آسان مختصر تفسیر کے ساتھ پڑھنا ان کا معمول تھا۔ اس کی وجہ سے وہ ایک صحیح العقیدہ مومنہ بن گئیں۔ جھاڑ پھونک، تعویذ، کالا دھاگہ، قرآن خوانی مرنے کے بعد، شب برات، محرم وغیرہ جاہلانہ رسوم سے نہ صرف دور رہیں بلکہ برملا اس کی مخالفت کرتی رہیں۔ والد کی عدم موجودگی میں اولاد کی تعلیم کی ذمہ داری اس وقت نبھائی جب تعلیم عام نہیں تھی، گاؤں مکتب اعدادیہ اور مڈل اسکول کے بعد ہائی اسکول اعظم گڑھ شہر میں تھے، ایک پردہ نشین گھریلو عورت کے لیے اولاد کی تعلیم کا انتظام کس قدر دشوار تھا، اس کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ لیکن انھوں نے بڑے بیٹے زبیر احمد مرحوم کو تعلیم کے لیے اعظم گڑھ بھیجا پھر جنید احمد مرحوم کو مالٹاری سے ہائی اسکول تک تعلیم دلائی۔ مضمون طویل نہ ہو اس کا بھرپور احساس ہے لیکن اولاد کی تربیت کے سلسلے میں والدہ کے ایک انداز کا ذکر ضرور کروں گا۔ ہم بچپن میں روٹھ جاتے، کسی بیجا ضد پر اڑ جاتے، شرارت سے تنگ کرتے یا بے ادبی کا ارتکاب کرتے تو کبھی غصہ نہیں کرتیں، پیار سے سمجھا بجھا کر حکمت کے ساتھ کسی بہانے سے منا لیتیں۔ چاہے اس کے لیے کتنی ہی محنت کیوں نہ کرنی پڑے۔ کھلا پلا کر کہانیاں یا لطیفے سنا کر سلا لیتیں۔ صبح کو اسکول بھیجتیں، اسکول سے واپس آنے کے بعد اسی دن یا پھر ایک دو دن بعد جب بھی کوئی غلطی سرزد ہوتی تو اس کو بہانہ بنا کر بھرپور تسلی بخش سزا دیتیں، بڑے ہونے پر ہم کو احساس ہوا کہ فلاں واقعے کے

سبب یہ سزا دی جا رہی ہے۔ اولاد کی تربیت کے سلسلے میں والدین خاص طور سے والدہ کو میری صلاح ہے کہ وہ اس طریقے کو اپنائیں اور اس کی افادیت کا اندازہ کریں۔

ماسٹر جنید احمد نے ابتدائی تعلیم مکتب اعدادیہ (جو آگے چل کر جامعۃ الفلاح ہوگیا) سے درجہ دوم تک حاصل کی۔ اس کے بعد پرائمری مڈل بلریا گنج سے پاس کیا۔ ہائی اسکول کی تعلیم مالٹاری سے پوری کی۔ ہائی اسکول پاس ہونے کے بعد بمبئی کے قریب ایک چھوٹے سے جزیرے نہوہ کے 'نہوہ میرن کالج' میں نیوی کے ٹریننگ کورس میں داخلہ لیا۔ ٹریننگ کا پہلا سال مکمل ہونے سے پہلے بڑے بھائی کا انتقال ہوگیا۔ ٹریننگ پر اس کا منفی اثر نہ پڑے اس لیے انھیں اس حادثے کی خبر نہیں دی گئی۔ تربیت پہلا سال مکمل کرکے نہ صرف اپنے بیچ (Batch) بلکہ پورے کالج میں پریکٹیکل کا فیصد سب سے زیادہ تھا۔ بمبئی آئے تو بڑے بھائی کی موت کی دلخراش خبر سنی۔ گھر پر کوئی ذمہ دار نہیں تھا میری عمر اس وقت آٹھ، نو سال تھی۔ والد نے گھر کی ذمہ داری قبول کرنے سے انکار کردیا۔ مجبوراً گھر آگئے۔ نیوی کی ٹریننگ سے محروم ہوگئے۔ انیس سال کی عمر گھر گرہستی اور کھیتی باڑی کے امور سے ناواقف ہونے کے باوجود گھر کی ساری ذمہ داریاں نہایت دیانتداری اور سمجھداری کے ساتھ بہت خوش اسلوبی سے نہ سہی لیکن کامیابی کے ساتھ نبھائیں۔

ایک زمانے میں سیاست سے بھی دلچسپی رہی۔ جب تک سیاست کے میدان میں رہے، دلجمعی اور یکسوئی سے رہے۔ شوسلشٹ پارٹی کے سرگرم رکن رہے۔ پارٹی کے بڑے لیڈروں سے بلاواسطہ ربط رہا۔ بی ڈی او، بلاک کے تمام کرمچاری نام سے مرعوب تھے۔ ان میں سے کسی نے شکل بھی نہیں دیکھی تھی۔ کچھ ان کا نام لے کر اپنا کام کروا لیتے تھے۔ ان کو پتہ چلا تو مجھے لے کر بلاک پر گئے اور تمام کرمچاریوں سے تعارف کرایا اور کہنے لگے بیج یا کھاد وغیرہ میں آؤں یا میرا چھوٹا بھائی آئے تو دیجیے گا، میرا نام لے کر کوئی مانگے تو انکار کردیجیے۔ ایس پی، کلکٹر سے ملاقات بے جھجک کرتے لیکن تھانے یا پولیس چوکی میں کبھی قدم نہیں رکھا۔ اس زمانے کے مشہور لیڈر چرن سنگھ، راج نرائن، وی پی موریا، چھیدی لال ساتھی ڈاکٹر فریدی وغیرہ سے اپائنٹمنٹ کے بغیر ملاقات کرسکتے تھے۔

پھر کہنے لگے اصولوں کی پابندی اخلاق، ایمانداری اور دیانتداری کے ساتھ اس میدان میں زیادہ دیر تک نہیں رہ سکتا، اس لیے سیاست سے بددل ہوگئے پھر تحریک اسلامی سے قربت اور رکنیت۔ نتیجتاً اس میدان سے کنارہ کشی اختیار کرلی۔

۱۹۵۹ء میں جامعہ اسلامیہ (آج کا جامعۃ الفلاح) بلریا گنج میں ہندی انگریزی تدریس

کے لیے تقرر ہوا۔ ہائی اسکول کی معمولی تعلیم، تدریسی تربیت سے محروم، تجربہ کے نام پر کورے کاغذ لیکن اخلاقی استقامت اور عملی سلاست کی بدولت علمی صلاحیت کی ساری کمیوں پر قابو پالیا۔ ساری جسمانی توانائی اور ذہنی صلاحیت کو ادارے کی خدمت پر صرف کردیں۔ تدریس کے روایتی طریقوں سے الگ اپنی نئی راہیں نکالیں۔ کلاس روم تک تدریس کو محدود نہیں کیا بلکہ کوشش کی کہ جامعہ کے در و دیوار بولنے لگیں۔ ہواؤں میں، فضاؤں میں تعلیم گنگنانے لگے، کلاس روم، کھیل کے میدان، ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں میں دلچسپی اور دلجمعی سے شریک ہوتے۔ انگریزی بہت اچھی نہیں تھی لیکن سبق پڑھانے سے پہلے پوری تیاری کرتے۔ سبق کی تمام باریکیوں الفاظ معانی، جملوں کے مفہوم غرض ہر پہلو سے تیار ہوکر آتے۔ اگر یہ کہا جائے طلبہ کو خود سے ماہر بنانا چاہتے تھے تو مبالغہ نہیں ہوگا۔ ایک ہی سال کے اندر ہم لوگ اس لائق ہوگئے تھے کہ ٹینس اور قواعد کے دوران کبھی کبھی ٹوک دیتے کہ ماسٹر صاحب 'ایسے نہیں اس طرح' تو ان کی مسکراہٹ میں عجیب اطمینان اور مسرت کی جھلک صاف محسوس ہوتی۔ ایسا بھی ہوتا کہ دوسرے دن کہتے کہ فلاں بات کل میں نے مان لی لیکن گھر جاکر دیکھا تو میری بات صحیح تھی، تم لوگ غلطی پر تھے۔ رائٹنگ اچھی نہیں تھی لیکن اپنے طلبہ کو بدخطی سے محفوظ رکھنے کی کامیاب کوشش کی۔ مولانا شبیر احمد اصلاحی جو اس وقت صدر مدرس تھے، ہفتہ میں صرف تین دن کتاب پڑھاتے۔ اس دوران مشکل الفاظ کے تلفظ اور معانی پر زور دیتے۔ کہتے تھے زبان دانی کا سارا دارومدار ذخیرہ الفاظ (Vocabulary) پر ہے۔ ایک دن قواعد کے لیے ایک دن ٹرانسلیشن کے لیے مخصوص تھا۔ جمعرات کو انگریزی میں گفتگو (Conversation) کے لیے متعین کر رکھا تھا۔ درجہ میں ایک چاک لے کر آتے۔ بورڈ پر سبق کا نام اور نمبر لکھتے۔ صفحہ نمبر زبانی بتاتے طلبہ سمجھتے تھے کہ ماسٹر صاحب کو پوری کتاب مع مشقی سوالات زبانی یاد ہے۔ حقیقت یہ نہیں تھی بلکہ اس کے پیچھے سبق کی تیاری کی جادوگری تھی۔ سکھانے کے بجائے سیکھنے پر آمادگی کے فلسفہ پر عمل کرتے تھے۔

تدریس کے علاوہ جامعہ کی سرگرمیوں میں ذوق وشوق کے ساتھ شرکت کرتے۔ مولوی ادریس صاحب جب عمر رسیدہ ہوگئے تو دو سال ان کے ساتھ پھر ان کے بعد کسی نوجوان استاد کے ساتھ بمبئی اور اطراف میں چندے کی وصولی کا کام بھی محنت سے کیا۔ آخر وقت میں رسوائی بھی حصے میں آئی لیکن راہِ وفا میں اس طرح کے مرحلے غیر متوقع نہیں ہیں۔ ہماری تاریخ میں بڑے بڑوں کو اس طرح کے لمحات اور تجربات سے دوچار ہونا پڑا ہے۔

دوسروں کے جذبات کے تئیں دل میں کشادگی کے باوصف سماج کے زعماء اور نام ونہاد

دانشوروں سے نباہ کے سلیقے سے نابلند تھے لیکن بیوقوفوں اور بے وقعتوں کو گلے لگانے کی صلاحیت ان میں بدرجہ اتم موجود تھی۔ اپنے طور طریقوں اور انداز و آداب کے اعتبار سے ایک عام آدمی نظر آتے ہر طرح کی آرائش، تصنع اور نمائش سے یکسر عاری اپنے آپ میں گم لیکن دنیا اور اس کے تقاضوں سے باخبر، کبھی کبھی غیروں کے ساتھ اپنوں کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ دوستوں اور دشمنوں کی ناراضگی برداشت کرنی پڑی۔ مفاد پرستوں اور ان کی سازشوں سے متصادم بھی ہونا پڑا مگر انھوں نے اپنے جس جادۂ منزل کا انتخاب کیا تھا اس سے سرمو انحراف نہیں کیا۔ ان کے پائے استقلال میں کبھی لغزش اور لرزش نہیں آئی۔

ان کی غیر مربوط زندگی کے واضح اور غیر واضح کئی پہلو ہیں لیکن سب سے نمایاں ہے تعلیم سے وابستگی اور دلچسپی۔ ان کا بس چلتا تو زمانے کی ساری تگ و تاز کا محور تعلیم کو بنا دیتے۔ کسی بھی ضرورت مند کی مدد بہت سوچ سمجھ کر بڑے حساب سے کرتے لیکن تعلیمی امداد کے سلسلے میں بغیر سوچے سمجھے بے حساب خرچ کر ڈالتے۔ وہ کہتے تھے کہ تنگ دستی اور فاقہ مستی میں بھی تعلیم باوقار اور معتبر زندگی کا مقام عطا کر سکتی ہے۔ لیکن علم کے بغیر دولت کی فراوانی جھوٹی شان و شوکت اور عارضی شہرت کا سامان فراہم کر سکتی ہے لیکن سماج میں مستقل حیثیت اور مقام دلانے کا وسیلہ نہیں بن سکتی۔ ایک موقع پر بات آئی کہ تعلیمی اداروں سے باصلاحیت افراد نہیں نکل رہے ہیں قوم کا سرمایہ برباد ہو رہا ہے۔ کہنے لگے تعلیمی اداروں کی مثال مچھیروں کے جال کی سی ہے۔ پانی چھاننے کے عمل میں اکثر ناکامی حصے میں آتی ہے۔ کبھی چھوٹی مچھلیاں ہاتھ آجاتی ہیں، کبھی کوڑا کرکٹ گھاس پھوس سیپ گھونگھے وغیرہ جمع ہو جاتے ہیں لیکن مچھیرے پانی چھاننے کے عمل سے باز نہیں آتے یہاں تک کہ بڑی بڑی مچھلیاں شکار کر لیتے ہیں اسی طرح تعلیمی اداروں سے وابستہ افراد کو چاہیے کہ صبر و استقامت سے پانی چھاننے کا عمل جاری رکھیں۔ باصلاحیت افراد وقفے وقفے سے فراہم ہوتے رہیں گے۔ چندے کی وصولی کے لیے بمبئی آئے تھے، کچھ وقت چرا کر مجھ سے ملنے اسکول آئے، دعا ختم نہیں ہوئی آ گئے اور دعا میں شامل ہو گئے۔ دعا کے بعد ہیڈ ماسٹر اور اساتذہ سے تعارف ہوا۔ رمضان تھا اس لیے چائے پانی کا موقع نہیں تھا۔ مجھ سے پوچھا پہلا پیریڈ خالی ہے، میں نے کہا نہیں کہنے لگے پھر تم کلاس میں جاؤ، میں نے تھوڑا توقف کیا تو سخت لہجے میں کہا: کسی دوسرے کام میں کوتاہی اور غفلت کرو گے تو ایک کام نہیں ہوگا یا خراب ہوگا جس کی تلافی ہو جائے گی۔ لیکن تعلیمی کام میں بددیانتی کرو گے تو اس کا اثر ایک نسل پر ہوگا جس کی تلافی ممکن نہیں ہوگی۔

ماسٹر جنید احمد طبیعتاً جذباتی اور مزاجاً تند اور انتہا پسند تھے۔ اس قدر خوددار کہ بھرپور احساس تشنگی کے باوجود ریا کی خوشامد سے کوسوں دور رہے۔ ضدی اتنے کہ جس کام کی ہامی بھر لی اسی کے ہو گئے۔ خودسر ایسے کہ جہاں انکار کر دیا کیا مجال کہ بڑے سے بڑا فرد بھی قائل کر سکے۔ کفایت شعار اس حد تک کہ بخیلی کا گمان ہوتا۔ شاہ خرچی کا وہ عالم کہ فضول خرچی شرمندہ ہو جاتی۔ ایک بار شام کو محلّہ کے ایک آدمی آئے، کہنے لگے ماسٹر صاحب فاقہ کی نوبت ہے بیس روپیہ دے دیجیے، ورنہ گھر میں چولہا نہیں جلے گا۔ گنجائش نہیں ہے کہہ کر واپس کر دیا۔ صبح کو ایک صاحب آئے کہ بیٹے کو ہائی اسکول کے امتحان کا فارم بھرنا ہے، آج آخری تاریخ ہے، پچاس روپیوں کی ضرورت ہے، فوراً دونوں جیبیں خالی کر دیں، کہا گھر جا کر گن لینا پانچ دس کم پڑیں تو کسی طرح انتظام کر لینا لیکن فارم ضرور بھروا دینا۔ قناعت پسندی مہینوں برہنہ پیٹھ یا پھٹی قمیص کی پردہ پوشی کرتی، لوگ سمجھتے کہ طبیعت ناساز ہے، توکل تو کمال کا تھا۔ زندگی بھر تنگ دست رہے لیکن گھر کے افراد کی تعلیم کا معیار ہمیشہ اعلیٰ رکھنے کی کوشش کی اور ضرورت مندوں کی مدد بھی حد بھر کرتے رہے۔ ایک بار فسادزدگان کی ریلیف کے کپڑے جمع کیے جا رہے تھے، گھر میں آئے اور حکم دیا کہ چھوٹے بڑے سب ایک ایک جوڑا نکال دیں اور میرے بدن پر جو موجود ہے اس کو چھوڑ کر سب دے دیا جائے۔ بھابھی نے ایک قمیص اٹھا کر کہا یہ نئی ہے، پہن لیجیے اور اسے اتار دیجیے، سن کر بھڑک اٹھے، گالی دیتے ہوئے کہا: یہ نہیں کہہ سکتی کہ جو بدن پر ہے وہ بھی اتار دو۔

ماسٹر جنید احمد چونکہ آغاز سے ہی کئی دہائیوں تک جامعۃ الفلاح سے وابستہ رہے جس کی بنا پر ان کے محاسن و عیوب کا تذکرہ تقریباً آدھی دنیا میں ہوتا ہے۔ جامعہ ایک بین الاقوامی برادری کی شکل اختیار کر چکا ہے، اس لیے اس کے افراد کا چرچا مختلف مواقع پر مختلف حوالوں سے ہوتا رہتا ہے، خود میرا تعارف بھی ابھی تک ان کے چھوٹے بھائی کی حیثیت سے کرایا جاتا ہے۔

’چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری‘

اس مضمون میں، میں نے ان کی ’کتاب زندگی‘ کے نجی باب کے چند اوراق کی جھلک پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی خوبیوں کے ساتھ اشارتاً کمزوریوں کو بھی بیان کیا ہے، اس غرض سے کہ یقیں محکم، عزم مستحکم اور عمل پیہم ہو تو کمزوریوں کے ساتھ بھی سرگرم سفر رہنا دشوار نہیں ہے۔ یوں تو میرے لیے یہ موضوع ایسا ہے کہ اس موقع پر اتنا ہی کافی سمجھتا ہوں ورنہ ایک دیوان جمع کر کے بھی محسوس ہوگا کہ ؎

یہ داستان عشق ابھی ناتمام ہے

مولانا محبوب مرحوم کچھ یادیں کچھ باتیں

اسرار احمد جیراجپوری☆

ذمہ دارِ 'حیاتِ نو' نے مجھے ایک ایسی شخصیت پر رقم طرازی کا حکم دیا ہے جو گوناگوں صلاحیتوں کی مالک تھی اور میری بے بضاعتی اس کی صلاحیتوں کو صفحۂ قرطاس پر لانے سے قاصر ہے۔ ٹوٹے اور خستہ حال جملوں کے ذریعہ روشنی ڈالنے کی سعی کی ہے۔ ارباب فکروفن اور صاحب قلم حضرات سے مودبانہ التماس ہے کہ نوکِ قلم سے نکلے ہوئے کلمات پر ناقدانہ نظر ڈال لیں۔

وہ اشک بن کے میری چشم تر میں رہتا ہے
عجیب شخص ہے پانی کے گھر میں رہتا ہے

پیدائش

مرحوم یکم اگست ۱۹۵۵ء میں بلریا گنج میں پیدا ہوئے۔

نام و نسب

والد محترم ظہور عالم صاحب تھے۔ محبوب عالم نام رکھا گیا، یہ نام مستقبل میں واقعتاً محبوب ہوگیا۔

جد امجد پنڈت سے مسلمان ہوئے تھے۔ واقعہ یہ بتایا جاتا ہے کہ پھوپھی کی لاش چتا پر رکھی گئی، کفن جل جانے سے برہنہ لاش پر نظر پڑتے ہی دل تڑپ اٹھا اور مذہب تبدیل کر کے مسلمان ہوگئے۔ مہراج گنج کے پاس اکھر چندا گاؤں کے رہنے والے تھے، وکیل تھے قاسم علی نام رکھا۔ رعب و دبدبہ، شان وشوکت کے مالک تھے۔ آٹھ کہار کی پالکی سے اعظم گڑھ آنا جانا ہوتا، بلریا گنج کا محلّہ قاسم گنج آپ ہی کے نام پر پڑا۔ مرحوم کے چچا حاجی محمد سعید (ڈپٹی سعید) نہایت سنجیدہ اور زیرک انسان تھے اور انہی کی سرپرستی میں مولانا کے ایام طفولیت گذرے۔ آپ کے بڑے بھائی مسعود عالم

☆ جیراجپور، اعظم گڑھ

دل وجان سے ٹوٹ کر ان کو چاہتے تھے اور یہ حقیقت ہے کہ مسعود عالم کی سعی وجہد کے نتیجہ میں مولانا اس مرتبہ کو پہنچے۔

تعلیم

بچپن سے لے کر تعلیم کا پورا زمانہ جامعۃ الفلاح میں گزرا۔ فضیلت کے بعد مادر علمی ہی میں بحیثیت استاذ شعبہ اعلیٰ میں تقرری ہوئی لیکن کچھ وجوہات کی وجہ سے شعبہ ثانوی میں درس دیتے رہے اور تاحیات یہ سلسلہ جاری رہا۔

صحت

مولانا بچپن سے لے کر ایام جوانی تک کافی تندرست وتوانا رہے، ان کے محلّہ اور فلاح کے اندر کوئی بھی پنجہ آزمائی کے لیے تیار نہ ہوتا۔ صرف دو طالب علم فاخر گورکھپوری اور نور محمد بستوی (موجودہ سدھارتھ نگر) مقابلہ کی تاب لا سکے۔ بیل گاڑی ہانکنے کا بہت شوق تھا، کسی بھی گاڑی وان کی گاڑی پھنس جاتی تو وہ اور دوسرے گاڑی وان کہتے لنگڑ (محبوب عالم) کو بلاؤ اور حقیقت ہے کہ جسمانی طاقت اور حکمت سے وہ گاڑی ضرور نکل جاتی۔

خرابی صحت

عین ایام جوانی میں کثرت سے سگریٹ نوشی کے سبب تپ دق کے شکار ہوئے اور ساتھ ہی ذیابیطس کا مرض بھی لاحق ہوگیا۔ نتیجتاً صحت گرتی گئی اور بینائی بھی متاثر ہوئی۔ علاج ومعالجہ کا سلسلہ جاری رہا۔ اسی درمیان درد قلب کے بھی شکار ہوئے اور 'مرض بڑھتا گیا جیوں جیوں دوا کی'۔

کھیل سے دلچسپی

اس میدان میں مولانا کو شروع سے دلچسپی تھی۔ خود کھیل نہیں سکتے تھے۔ اس دیار کے والی بال کے تمام کھلاڑی ان کے یہاں آتے، منصوبہ بندی ہوتی، کھلاڑیوں کا انتخاب عمل میں آتا، مقابلہ کے لیے ٹیم روانہ ہوتی، ہر کھلاڑی مطیع وفرماں بردار رہتا، کسی غلطی پر اگر آپ ڈانٹ دیتے تو وہ چوں چرا نہ کر کے خاموشی سے سر جھکا لیتا۔ صرف ایک واقعہ بتاتا چلوں۔

استاذ محترم مولانا عبدالحسیب صاحب کی صدارت کا دور تھا، مبارک پور میں رات میں والی بال کا ٹورنامنٹ تھا۔ سخت پابندی تھی کہ کسی کو نہیں جانا ہے لیکن واہ رے جوانمردی، یہ شخص بعد مغرب لاٹھی کے سہارے پیدل جاتا ہے اور پیدل ہی واپس آکر کلاس لیتا ہے۔

پڑوسیوں سے تعلقات

پڑوسیوں سے تعلقات نہایت ہی خوش گوار تھے، سب کے دکھ درد میں برابر شریک ہوتے بلکہ معاملہ کو اپنے ہاتھوں میں لے لیتے اور خوش اسلوبی اور حکمت سے لاینحل مسائل کو حل کر دیتے۔ اپنے اردگرد چھائے ہوئے مسائل پر غالب آنا ان کی معاشرتی صفت تھی۔ معاملہ فہمی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ پڑوسی ہر معاملہ اور مسئلہ میں ضرور رائے لیتے، استاذ محترم ماسٹر سید عبداللہ صاحب نے اس ناچیز سے کہا 'جب بھی میں ان کے یہاں گیا دوران گفتگو اگر ان کو احساس ہوا کہ میں کسی پریشانی میں مبتلا ہوں تو کرید کرید کر معلوم کرتے اور دلاسہ دیتے ہوئے کوئی نہ کوئی راستہ نکال لیتے۔ میری تین بچیوں کی شادی ہوئی اور مجھے احساس نہ ہو سکا۔ یہ تھا جاں سپاری کا عالم۔

تعلیمی میدان

ادائے خاص سے وہ دل کو چھین لیتے تھے۔

کوئی نہ سمجھے گا ان کے شکار کا عالم

فارسی اور اردو ادب پر عبور حاصل تھا۔ بچپن ہی سے کافی اشعار یاد تھے۔ دورانِ تدریس مزید اضافہ ہوتا گیا۔ گلا بہت اچھا پایا تھا، فارسی بہت بہترین پڑھاتے تھے بلکہ پڑھانے کا حق ادا کر دیتے تھے۔ بورڈر اور غیر بورڈر بچے آپ کے رعب و دبدبہ سے ہمیشہ خوف زدہ رہتے۔ ایک ہی ڈانٹ میں خاموشی اختیار کر لیتے۔ طالب علموں کو ان کی ذمہ داریوں کا احساس دلاتے رہتے۔ چنانچہ خوف زدہ طالب علم بھی علم کی تشنگی بجھانے کے لیے آپ کے اردگرد پروانے کی طرح منڈلاتا اور آپ اس کی رہنمائی ہی نہیں کرتے بلکہ شفقت سے کہتے 'بلاخوف وخطر اور بے جھجک ہو کر پوچھو، طالب علم اس پر عمل کرتا اور آپ حتی الامکان اور حتی الوسع اس کو سمجھاتے۔ سمجھانے کے انداز میں نرمی اور ملائمت تھی، طرز کلام میں شیرینی، لطافت اور رنگینی پائی جاتی تھی۔ کبھی بھی جذبات سے دلیل کا کام نہیں لیتے۔ ان کی گفتگو کا ایک خاص انداز تھا جو طلبہ میں اضطراب پیدا کر دیتا اور وہ ان کے گرویدہ ہو جاتے۔ طلبہ کی خفیہ اور خوابیدہ صلاحیتوں کو بیدار کرنے میں اہم رول ادا کرتے۔ یہی وجہ تھی کہ طلبہ ان کو ٹوٹ کر چاہتے اور بے لوث محبت کرتے۔

نظم و ضبط کی پابندی اور مادرعلمی کی ذمہ داریاں

نظم وضبط کے زبردست پابند تھے۔ یہاں تک کہ جب جسمانی طاقت نے جواب دے دیا تو رکشہ سے آمد ورفت ہونے لگی لیکن عین وقت پر کلاس میں حاضر ہو جاتے۔ جب بینائی قریب قریب ختم ہو گئی تب بھی ذمہ داروں کے اصرار پر اسکول آتے رہے۔ بارہا دوران گفتگو مجھ سے کہا کہ

'اب ضمیر گوارا نہیں کرتا کہ فلاح سے اجرت لوں اس لیے کہ درس کا حق ادا نہیں کر پاتا۔'

مادر علمی میں کسی بھی تقریب کا انعقاد ہوتا تو ذمہ داران جامعہ کی نگاہیں آپ کی طرف جاتیں، کہیں اسٹیج تیار کروا رہے ہیں تو کہیں ضیوفانِ کرام کی اقامت کا معاملہ بخوبی نباہ رہے ہیں حتی کہ کھانے پینے کا نظم انہیں کے ذمہ ہوتا۔ مولانا جب تک جامعۃ الفلاح سے منسلک رہے ان تمام ذمہ داریوں کو اس خوبی سے نبھایا کہ کہیں سے کوئی شکایت نہیں ملی، نہ کسی کمی کا احساس ہوا۔ ان والینٹیر ان کے حکم کے منتظر رہتے، جو بھی حکم ملا آناً فاناً وہ کام انجام پا گیا، مولانا عبدالعظیم فلاحی کو ساتھ رکھتے۔ عظیم صاحب نے ان کی ماتحتی میں جو تجربہ حاصل کیا آج ان کی عدم موجودگی میں یہ ذمہ داریاں ان کے سر پر آن پڑیں اور خود عظیم صاحب ان کاموں کو اچھی طرح نباہ رہے ہیں اور مرحوم کو ہمیشہ یاد کرتے ہیں۔

رعب و دبدبہ

رعب ودبدبہ کا یہ عالم تھا کہ بورڈنگ میں دو بچے لڑ پڑے اور دونوں نے اس جھگڑے کو انا کا مسئلہ بنا لیا، تعطیل ہونے والی تھی یہ جوان کہتا ہوا نظر آیا کہ دیکھوں کس کی مجال ہے جو بات کو آگے بڑھاتا ہے، شاہ گنج اسٹیشن تک بنفس نفیس گئے اور ان بچوں پر اتنا زبردست اثر پڑا کہ جھگڑے کا نام ہی بھول گئے۔ اسی طرح کے ایک دوسرے واقعہ میں اس ناچیز کو اعظم گڑھ ریلوے اسٹیشن پر لے کر گئے بچے بغلیں جھانکنے لگے۔ نظم وضبط کے معاملہ میں وہ درخشندہ ماہتاب وآفتاب کی طرح رہے اور فلاح کی جو خدمات انجام دیں وہ ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔

وہ جدھر جھکتے تھے جھک جاتا تھا نیلا آسماں
بزم اعلیٰ میں بھی تھے ہر لمحہ وہ عزت مآب

شعروشاعری اور اردو ادب سے رغبت

کچھ ہونا میری ذلت و خواری کا سبب ہے
یہ ہے میرا اعزاز کی میں کچھ بھی نہیں ہوں

میرے محبوب کو بہت زیادہ اشعار یاد تھے اور شاعری کے جراثیم عربی سوم ہی سے ان پر حملہ آور ہو چکے تھے۔ ان جرثوموں نے جب قلب پر یلغار کی تو غزل کے اشعار موقع کی مناسبت سے کہے جانے لگے لیکن مخفی رکھے جاتے۔ میں نے بار بار کہا کسی بھی شخص کی تحریر اس کی عدم موجودگی میں صاحب تحریر کو زندہ رکھتی ہے، انجمن طلبہ قدیم کے آرگن حیات نو اور انجمن طالبات قدیم کے

آرگن ضوفگن اور ارمغان میں اپنی غزلیں بھیجا کریں، انکار پر انکار کرتے رہے اور میں اپنی ضد پر قائم رہا بالآخر آمادہ ہوئے اور ان مجلوں میں ان کی غزلیں بکھری پڑی ہیں کاش کوئی انہیں جمع کر دیتا تو یہ مختصر سا دیوان گولڈن جوبلی کے موقع پر آجاتا تو طلبہ جامعہ اور اہل علم حضرات یہ جان لیتے کہ یہ ہے پاکیزہ شاعری۔

میرے سامنے ان کی صرف تین کاوشیں ہیں۔ مجلّہ ضوفگن جولائی دسمبر۲۰۰۴ء صفحہ نمبر ۲۲، جس کا ایک شعر لکھنا ضروری سمجھتا ہوں:

اے خدا نظر بد سے بچا انجمن
تاکہ باقی ہمیشہ رہے خندہ زن

الفلاح میگزین ۱۹۸۵ء:

باغباں ہمیں کو اب دیتا ہے کیوں سزائے موت
مجرم ہوئے ہیں ہم ہی کیوں ان کے ظلم ڈھانے سے

مندرجہ ذیل دو اشعار جنوری ۱۹۸۵ء اور نومبر ۱۹۸۶ء 'حیات نو' میں موجود ہیں:

آہ و فغاں نہیں ہے مداوائے رنج و غم
عالم اور سوچیں دوائیں بیمار میں
جو بوئے الفت سے ہیں گریزاں وہی بنے ہیں چمن کے نگراں
جنہیں شعور وفا نہیں ہے بھلا وہ کیسے وفا کریں گے

یہ اشعار کس شمارے میں ہیں مجھے معلوم نہیں، میری یادداشت میں محفوظ تھے:

میرے خدا میری آنکھوں کو روشنی دے دے
کرم کی بھیک دے کچھ اور روشنی دیدے
بجا کی فضل و کرم عام ہے تیرا آقا
کہ اب حبیب کے صدقے میں روشنی دیدے

ایک خاص ترنم سے غزل سرا ہوتے اور مجلس جھوم اٹھتی، ریاض احمد نصیر پوری، ممنون احمد علائی، خلیق احمد حریری اور بھی دوست احباب جمع ہوجاتے۔ شعر وشاعری کا دور شروع ہوجاتا، پڑوسی بھی آجاتے، لوگ محو ہوجاتے اور گھنٹوں یہ سلسلہ جاری رہتا، کبھی کبھی میرا بھی جانا ہوتا، اگر اکیلے ہوتے تو میں صرف اتنا ہی کہتا ؎

غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا

بس کیا تھا خوابیدہ احساس اور جذبات جاگ اٹھتے اور میں محظوظ ہوتا۔

حاسدین

ہر اچھے انسان سے حسد رکھنے والوں کی تعداد کم نہیں ہوتی۔ اقتصادی بے بضاعتی کے باوجود پڑوسی اور دوست واحباب اکثر ان کے یہاں مجلس جمائے رہتے۔ دیار اعظم گڑھ کا ہر اچھا آدمی اور ساتھ ہی ہر برا آدمی بھی ان کو خوب جانتا اور پہنچانتا تھا۔ عجب آزاد مرد تھے حاسدین غائبانہ طور پر غیبت کرتے، باتیں ان کے بھی گوش گزار ہوتیں لیکن یہ کبھی بھی حرف شکایت زبان پر نہ لاتے بلکہ اکثر یہ کہتے سنے گئے ؎

میری شہرت سیاست سے محفوظ ہے
یہ طوائف بھی عصمت بچا لے گئی

یہ حقیقت ہے اور مجھے کہنے میں عار نہیں ہے کہ جو معاشرتی صفت ان میں تھی وہ بلریا گنج کے باسیوں میں مفقود ہے اور باشندگانِ بلریا گنج اس بات کو سمجھ ہی نہیں سکتے تھے ؎

میں صاف ہی نہ کہہ دوں جو ہے فرق تجھ میں مجھ میں
تیرا درد درد تنہا میرا غم غمِ زمانہ

مرحوم کی صفات

مجھ سے مولانا کا تعلق عربی دوم میں ہوا۔ اپنی علالت کی وجہ سے وہ فیل ہوگئے تھے، صاحب سلامت کا سلسلہ پہلے سے تھا، اتفاق یہ ہوا کہ میں اور ساتھ ہی چند لوگ دوران سفر دیر ہوجانے کی وجہ سے گیارہ بجے رات میں بلریا گنج پہنچے۔ میں ساتھیوں کے ساتھ جادھمکا ابھی سوئے نہیں تھے، استقبال کیا، کھانے اور سونے کا نظم کیا اور صبح چائے پلا کر رخصت کیا۔ یہیں سے تعلقات گہرے ہوتے چلے گئے۔

اصلاً انسان کہلانے کا حق دار وہ ہوتا ہے جس کی خودی اتنی جان دار ہو کہ وہ اپنے وجود پر غالب رہے اور حیوانی جبلتوں پر قابو پالے۔ میرے محبوب کے اندر خودداری کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ اگر انسان کے اخلاق عمدہ ہوں تو دشمن بھی دوست بن جاتے ہیں۔ صدیق کریم کے اندر کشادہ دلی، عالی ظرفی اور سخاوت بدرجہ اتم موجود تھی۔ غربت میں زندگی گزاری، اس کے باوجود کسی بھی وقت کوئی پہنچ جاتا تو موقع کی مناسبت سے خاطر ومدارات میں کمی نہ ہونے پاتی۔ ان کی تمام خوبیوں کو لفظ کے

پیکر میں، میں نہیں ڈھال سکتا۔ مصیبت، دکھ درد اور پریشانی انسان ہی کے لیے ہے ان پر کتنی ہی بڑی مصیبت آن پڑی کبھی آپے سے باہر نہیں ہوئے، زندگی کے نشیب و فراز کا مقابلہ کیا اور ڈٹ کر کیا۔ حقیقتاً صبر و تحمل، ثبات و استقامت کے پیکر تھے۔

ہدف اور مقصد کو حاصل کرنے کے لیے قربانی کی ضرورت ہوتی ہے اور مرحوم نے قربانی دی۔ جس حال میں بھی رہے، ماحول کو اپنے رنگ میں رنگنے کی کوشش کی۔ زندگی کے ہر محاذ پر کامیاب رہے۔ گفتار کے غازی نہ تھے کردار کے سپاہی تھے۔ ہنسی خوشی اور ادبی ذوق میں زندگی گذاری، بلکہ کہا کرتے کہ 'سنگلاخ وادیوں میں ٹوٹے پہیوں کے سہارے زندگی کے ایام گذار رہے ہیں'۔ زندگی کا سب سے نمایاں پہلو یہ تھا کہ سخت سے سخت مراحل میں پژمردگی اور اضمحلال کو پاس پھٹکنے نہیں دیا۔ کتنے ہی مشکل حالات ہوتے خوشی کے زاویہ میں بدل دیتے اور سوگوار ماحول میں خوشی کی لہر دوڑا دیتے۔ جاہ و مرتبہ، عہدہ و منصب سے دور بھاگتے رہے۔ حب دنیا سے بے رغبتی بھی ان کی صفات عالیہ میں سے ایک صفت تھی کسی بھی موقع اور مرحلہ پر کسی طرح کی کوتاہی نہ کی۔ عمل کی دنیا میں غیر متزلزل رہے۔ ثبات قدمی پر ایمان رکھتے۔ اصول و ضابطہ کے سلسلہ میں کبھی بھی کوئی طاقت مسخر نہ کرسکی۔

تربیت میں ان کی اثر انگیزی کا یہ عالم تھا کہ سیکڑوں طلبہ کی زندگی کا رخ بدل دیا۔ یہ بات پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ مادر علمی اور طلبہ میں ان کو جو مقام حاصل تھا کسی سے مخفی نہیں تھا۔ مادر علمی سے سلسلہ منقطع ہوجانے کے بعد بھی طلبہ کا ان کے یہاں برابر آنا جانا ہوتا تھا۔

جود و سخاوت

اس صفت عالیہ میں جب کوئی گرفتار ہوجاتا ہے تو کوئی مصیبت، مصیبت نہیں رہ جاتی اور متصف تمام دشواریوں سے بے نیاز ہوجاتا ہے۔ اگر میں یہ کہوں کہ سخاوت کا جو مادہ مرحوم کے اندر پایا جاتا تھا بہت کم لوگوں میں دیکھنے کو ملا۔ چونکہ میں ان کے رازہائے دروں سے خوب واقف تھا اس لیے میری عقل حیران و ششدر رہ جاتی کہ غربت کی مار جھیل رہے ہیں اور اگر کوئی بھی بندہ مزاج پرسی ہی کے لیے آجائے بغیر خاطر و مدارات کے نہیں جانے دیتے۔

اسکول آنے جانے کا سلسلہ جب منقطع ہوگیا تو فارسی کے درس کے لیے ایک خلا پیدا ہوگیا۔ مولانا رحمت اللہ الاثری صاحب اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود درس دیتے رہے پھر یہ ذمہ داری استاذ محترم مولانا اخلاق احمد کریمی کے سپرد ہوئی۔ حافظ ریاض صاحب، مولانا سے

استفادہ کرتے رہے اور اب وہی یہ مضمون پڑھا رہے ہیں اور خوب حق ادا کررہے ہیں۔

انتقال پر ملال

انتقال سے چند روز قبل کہنے لگے، بہت جلد روح قفس عنصری سے پرواز کرجائے گی، میں نے دلاسا دیا تو کہنے لگے جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی اور کمرے کے ماحول کو خوش گوار بنادیا۔

دسمبر ۲۰۰۸ء عید قرباں کے دوسرے دن مشن ہسپتال اعظم گڑھ میں مغرب کے وقت روح قفس عنصری سے پرواز کرگئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

دوسرے روز دس بجے نماز جنازہ ادا کی گئی۔ مولانا طاہر مدنی صاحب مدظلہ العالی نے نماز جنازہ پڑھائی۔ ایک جم غفیر تھا اور حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کا جم غفیر بہت ہی کم دیکھنے کو ملتا ہے۔ پسماندگان میں تین نرینہ اولاد اور چار بچیاں ہیں، بچوں کے نام یہ ہیں: مصلح الدین، مقیم الدین، محی الدین۔

آخر میں اس شعر کے ذریعہ ان کو خراج عقیدت پیش کرتا ہوں۔

میں ان کے سوا کس پہ فدا ہوں یہ بتادے
لا مجھ کو دکھا ان کی طرح کوئی اگر ہے

☆☆☆

صبر

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: واصبروا وما صبرک الا باللہ

صبر یہ ہے کہ کسی تکلیف پر اندرونی بے قراری پر نفس کو قابو میں رکھا جائے، اس کے تین درجات ہیں:

(۱) معصیت سے اجتناب پر صبر (۲) اطاعت پر صبر (۳) مصائب پر صبر۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اصبروا یعنی مصائب پر صبر کرو، صابروا: گناہوں سے بچے رہنے پر صبر، رابطوا: اطاعت و بندگی پر جماؤ۔

ماسٹر عبدالمجید صاحب مرحوم

جاوید احمد خان☆

غالباً میں چوتھی جماعت کا طالب علم تھا اور ایک دن ریاضی کے سوال میں غلطی کی تھی جس کے آخر میں میرے شفیق استاد نے میری دائیں ہتھیلی پر تمباکو اور چونے کا مخلوط مسالہ رکھ کر اپنی شہادت کی انگلی سے دور ایک کلاس روم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ جاؤ، یہ اس کالی شیروانی والے ماسٹر صاحب کو دے کر آؤ۔ میں نے تمباکو مٹھی میں دبایا اور بچپن کے اس عذاب سے جسے عام فہم زبان میں حساب کہتے ہیں، تھوڑی دیر کا چھٹکارا پا کر اچھلتا کودتا کالی شیروانی والے استاد کے پاس پہنچا۔ ان کے پورے مجسمے کو دیکھا اور پاس ہی کرسی پر رکھی ہوئی چھڑی پر نگاہ جمالی اور ان کے سامنے ہاتھ بڑھا کر اپنی وہ مٹھی کھول دی جس میں تمباکو تھا۔ نہ میرے پیر میں جوتے تھے اور نہ چپل اور نہ آداب خوش کلامی۔ انھوں نے میری طرف کب دیکھا اور کیسے تمباکو ان کی ہتھیلی میں پہنچ گیا اس کا مجھے علم نہیں سنا ہے شیر جنگل میں جب بندروں کی طرف دیکھتا ہے تو وہ مارے خوف کے آنکھیں بند کر لیتے ہیں اور درخت سے ٹپک کر شیر کے چنگل میں آجاتے ہیں۔ دوسرے ہی لمحہ میں کالی شیروانی والے استاذ کے چنگل میں تھا۔ ان کا ایک پیر میرے کمزور پیر پر، ہاتھ میری گردن پر اور ان کے ایک ہلکے دھکے سے میں پاس ہی گر پڑا۔ مجھے اپنی کیفیت معلوم نہیں ہوئی لیکن ان کے تمام شاگرد، جو پاس ہی بیٹھے تھے ہنس پڑے پھر انھوں نے فارسی میں کہا ''بندۂ ناخراش'' جس کا مطلب مجھے کافی بعد میں معلوم ہوا۔

یہ میری ماسٹر صاحب سے پہلی مڈبھیڑ تھی اور یہ بھی مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ ماسٹر صاحب اپنے شاگردوں کا استقبال کچھ اسی طرح کرتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان کے شاگرد انھیں فراموش نہیں کر پاتے۔ میں بھی ماسٹر صاحب کے سایہ سے ڈرنے لگا میں نے محسوس کیا کہ میری عمر کے زیادہ تر طالب علم ان کے آنے کی سنسناہٹ سے چونک جاتے ہیں، جس نے بھی ماسٹر

☆جامعہ ہمدرد، دہلی

صاحب کو دیکھا ہے وہ نہیں بھول سکتا کہ وہ ایک کسرتی بدن والے، مضبوط ہاتھ اور گرجدار آواز کے مالک تھے۔ ان کو دیکھتے ہی کہہ سکتا تھا کہ اکھاڑے اور بنوٹ کی تربیت سے گزرے ہوئے ہیں۔

ماسٹر صاحب نے اس صدی کی ابتداء میں آنکھ کھولی تھی۔ انھیں فخر تھا کہ وہ پہلی جنوری ۱۹۰۱ء کو پیدا ہوئے ہیں۔ جن لوگوں کو ان کے پاس بیٹھنے کا اتفاق ہوا ہے، وہ ماسٹر صاحب کو یاد کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ان کے شاگردوں کی تعداد شاید اتنی ہی ہو جتنے انسانی مرتبے ہوتے ہیں لیکن وہ کوئی اتنے بڑے آدمی نہیں تھے کہ ان پر کتابیں لکھی جائیں یا ان کی شخصیت پر سیمینار ہو۔ وہ ایک معمولی آدمی تھے۔ اپنے ہی طالب علموں میں اپنی زندگی گزار دی۔ اپنے ہی طالب علموں کو بنتے اور بگڑتے دیکھا، ہر اچھی چیز کو سراہا، غلط بات کی پرزور مذمت کی، یہی وہ آگ پانی ہے جس سے گزر کر انسانیت کی تکمیل ہوتی ہے۔

ماسٹر صاحب یاد آتے ہیں تو ان کے ساتھ گزرے ہوئے دن بھی یاد آتے ہیں۔ وہ ہمیں جغرافیہ، ریاضی اور گلستاں بوستاں پڑھاتے تھے، ہائے وہ ان کا جغرافیہ پڑھانا! اب بھی ان کا پڑھایا ہوا سائبیریا کی برفیلی چٹانوں میں سفید ریچھ کا شکار یاد ہے اور بحرِ اوقیانوس سے چلنے والی ہواؤں کا ان کے منھ سے گرجدار آواز میں نکلنا یاد ہے، ان کی باتوں میں فلم کی طرح تصویرکشی تھی، تمام طالب علم ٹکٹکی لگائے ان کی باتیں سنتے تھے، سوائے اس طالب علم کے جس کی قسمت خراب ہوتی تھی کیونکہ اپنی بے توجہی کے جرم میں اسے گھن اور گرج دونوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا پھر اس کے بعد مضمون پر لکچر نہیں ہوسکتا تھا بلکہ خاندان اور ذات پات پر، گذشتہ دور اور موجودہ دور کے بنیادی فرق پر اور اس طرح ہم سب مختلف طریقوں سے اپنے علم میں اضافہ کرتے رہتے۔ جب ذرا غصہ ٹھنڈا ہوتا تو بہت ہی خلوص سے سمجھاتے کہ میں طالب علموں کو کیوں مارتا ہوں اور ہم لوگ ان کی بات کے قائل ہو جاتے۔ البتہ ریاضی کی گھنٹی میں سبھی طالب علم بہت خوش رہتے۔ اس لیے نہیں کہ وہ اس میں دلچسپی پیدا کرتے تھے بلکہ یہ کہ آتے ہی ضرب یا تقسیم اور ایک لمبا سوال بول دیتے اور سورج کی طرف رخ کر کے خاموش بیٹھ جاتے اور ہم لوگ سمجھ جاتے کہ اب گئے کہ تب گئے۔ ان کے اوپر نیند کا غلبہ ہوتا اور خاموشی سے آنکھیں بند کر لیتے۔ طالب علم جو کہ اس کے منتظر ہوتے اپنی آنکھیں کھول لیتے، اپنے ہونٹ سی لیتے اور گھنٹہ ختم ہونے تک ان تمام حرکتوں سے پرہیز کرتے جس سے استادِ محترم کی نیند میں خلل پڑ سکتا تھا۔ جس روز شیخ سعدی کے قطعات پڑھاتے تھے تو سبھی طالب علم خوش خوش نظر آتے۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ سبھی اشعار ترنم سے اور زوردار آواز سے پڑھتے تھے اور شیخ سعدی

کی ذاتی زندگی کا ذکر کچھ اس طرح کرتے جیسے ان کے پرانے دوستوں میں رہے ہوں، یہ ماسٹر صاحب کی بہت بڑی خوبی تھی۔ وہ ماضی اور حال کے باہمی رشتہ کو اس قدر زندہ طریقے سے پیش کرتے کہ کم عمر کے طالب علم تمیز نہیں کر پاتے تھے۔

ماسٹر صاحب اس وقت مجھے بہت اچھے لگے جب انھوں نے بتایا کہ وہ پریم چند کو بہت قریب سے دیکھ چکے ہیں۔ میں پریم چند کی کہانیاں پڑھ کر ان سے متاثر ہو چکا تھا۔ میں نے ماسٹر صاحب سے جاننا چاہا کہ اس عظیم ناول نگار کے شب و روز کیا تھے۔ شاید وہ میری بات سمجھ گئے۔ بولے؛ واہ رے پریم چند! کیا سادہ زندگی تھی اس کی۔ دھوتی پہن کر باہر کنوے سے پانی نکال کر نہاتے تھے اور روزانہ کچھ نہ کچھ ضرور لکھتے تھے۔ پھر انھوں نے پریم چند کی نجی زندگی کا نقشہ کچھ اس طرح کھینچا کہ مجھے یقین ہو گیا کہ پریم چند بھی اسی دنیا کے انسان تھے۔

ماسٹر صاحب کی تدریسی زندگی اتنی لمبی رہی ہے کہ انھوں نے اپنی عمر ہی میں اپنے شاگردوں کو علم کی شہرت پا کر مشہور ہوتے دیکھا اور وہ شاگرد بھی ان کی نظر کے سامنے رہے جو گمنام زندگی گزارتے ہیں۔ ایک بار مجھے کہیں سے پتہ چلا کہ اردو کے مشہور و معروف نقاد پروفیسر احتشام حسین ماسٹر صاحب کے شاگرد رہ چکے ہیں اور دلچسپ بات یہ کہ بچپن میں انھیں پڑھایا ہے۔ میں نے ایک دن موقع کو غنیمت جان کر ماسٹر صاحب کو سرِ راہ پکڑ لیا اور سید احتشام حسین کی ابتدائی زندگی سے متعلق کئی سوالات ایک ساتھ کیے۔ اس امید سے کہ ماسٹر صاحب تفصیل سے بتائیں اور خاص طور سے ان کے بچپن کے ادبی رجحانات کا ذکر کریں۔ وہ چند سیکنڈ کے لیے خاموش ہوئے اور پھر اپنی ۲۵ سالہ پرانی لٹھیا کو جو بقول ان کے سب سے معتبر ساتھی ہے، اپنی ٹھوڑی پر لگا کر ٹیک لیتے ہوئے بولے: بھئی احتشام کا میں نے ختنہ کرایا ہے، اس کے گھریلو جاگیردارانہ ٹھاٹ دیکھے ہیں اور یہ کہ بچپن ہی سے اس کے اندر تحقیق و تفتیش کا جذبہ تھا۔ ظاہر ہے اتنی ساری معلومات میرے لیے کافی تھیں۔

ماسٹر صاحب بچوں کی نفسیات کے ماہر تھے۔ وہ اپنے خیالات کا اظہار تدریس کے دوران کیا کرتے تھے۔ اگرچہ کہ وہ اپنے غصے کے لیے مشہور تھے لیکن کمزور طالب علم پر ہاتھ نہیں اٹھاتے تھے۔ ہاں اگر کسی طالب علم کے بارے میں پتہ چل جاتا کہ وہ فتنہ گری کر رہا ہے تو کچھ ایسی سزا دیتے جس سے اس کا رشتہ ان سے دائمی ہو جاتا۔ ہم سب کو سمجھاتے کہ پڑھنے کے ساتھ کھیلنے پر بھی توجہ دو اور اس کا جواز اس شعر میں پیش کرتے۔

جس طرح گاڑی کے پہیے تیل سے　　　　تیز ہو جاتے ہیں بچے کھیل سے

انھوں نے اپنی زندگی کا زیادہ حصہ گورنمنٹ اسکول میں گزارا، بعد میں اسلام سے گہری وابستگی پیدا کر لی اور باقی حصہ مدرسے کی نذر کر دیا۔ وہ اسلامی روایات کے بہت قائل تھے لیکن بے جا مذہبی بحث مباحثے سے اتنا ہی دور بھاگتے تھے جتنا شیطان متقیوں سے بھاگتا ہے۔ کلاس میں کہا کرتے تھے کہ ہماری قوم کی بدنصیبی یہ ہے کہ لوگ کوّا کو حلال اور حرام کی بحث میں لگے ہوئے ہیں۔

ماسٹر صاحب کے اندر اک جواں مرد انسان کا سا جذبہ تھا جس کے اندر بہادری اور غصہ بھی ہوتا ہے اور انسان کو تکلیف میں دیکھ کر ٹپ ٹپ آنسو بہانے والی آنکھیں بھی۔ شاید ایسے ہی لوگوں کے بارے میں روسی ناول نگار چیخوف نے کہانیاں کہہ کر نوبل انعام حاصل کیا ہے۔ انسان اچھا اسی وقت لگتا ہے جب تک وہ اپنی فطرت کے مطابق رہتا ہے۔ صناعی اور بناوٹ کا لباس اس کی حقیقی زندگی کے لیے قاتل ہے۔ ہماری معاشرت میں یہ جذبہ بڑی حد تک نمایاں نظر آتا ہے۔ ہم اپنی اصلیت چھپا کر ایک دوسرے کو فریب دینے والی قوم بن کر رہ گئے ہیں۔ انسان بقول سمرسٹ مام کے مجموعۂ اضداد ہے۔ اس کے اندر جوش کا جذبہ تحریک کا موجب ہوتا ہے۔ وہ تلوار کی طرح فولادی اور ریشمی دھاگوں کی طرح کمزور ہوتا ہے۔ مجھے ایسے آدمیوں سے کافی دلچسپی ہے۔ کچھ لوگ مشہور اور برگزیدہ آدمیوں کے اندر کوئی خامی یا برائی سننے کے لیے تیار نہیں ہوتے لیکن آدمی قریب سے ہی حقیقی معلوم ہوتا ہے۔ مجھے ذاتی طور پر انسان کو بھیڑ بھاڑ میں دیکھنے سے گھبراہٹ ہوتی ہے اور دھوکہ بھی۔ اس طرح کچھ لوگ مشہور شخصیتوں سے مصافحہ کے خواہاں ہوتے ہیں۔ بڑے اور مشہور لوگوں کو سمجھنا اور پرکھنا بڑا مشکل کام ہے کیونکہ ان کی شخصیت متعدد خول میں لپٹی ہوتی ہے اور وہ فنکارانہ انداز میں عوام کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ آپ مشہور بڑے لوگوں سے مل کر دھوکہ کھا سکتے ہیں لیکن ایک معمولی آدمی میں اس کا سب کچھ صاف صاف دکھائی دے گا۔

ہم لوگوں نے ماسٹر صاحب کی ریٹائرڈ زندگی دیکھی تھی۔ البتہ ایامِ جوانی یا یوں کہیے کہ ایک پٹھان کی طغیانی نہیں دیکھی۔ یہ ایک طرح سے اچھا ہی تھا۔ ورنہ خود ان کی زبان سے بیان کیے ہوئے انھیں کے حالات زندگی اتنے دلچسپ نہیں معلوم ہوتے۔ ان کے شاگردوں کو اندازہ ہے کہ جب وہ آتش فشاں پہاڑ کا ذکر کرتے اور اپنے ہاتھ پاؤں اور آواز کی مدد سے بھاپ بن کر زمین کے پھٹنے کا منظر اس طرح بیان کرتے جیسے کلاس روم کے اندر زلزلہ آ گیا ہو، ایک مرتبہ ان کا پڑھانے کا موڈ نہیں تھا تو کہنے لگے کہ آج کون سی تاریخ ہے۔ کسی طالب علم نے کہا ۲ر فروری، پھر وہ اپنا دونوں پیر کرسی پر رکھ کر اپنے گاؤں کی ڈکیتی کا وہ قصہ بیان کرنے میں مصروف ہو گئے جس میں انھوں نے

ہیرو کا رول ادا کیا تھا اور دو تین ڈاکوؤں کو زندہ پکڑا تھا، چوٹ کھائی تھی ، ایک کنویں پر سے چھلانگ لگائی تھی ، جس کے نتیجہ میں انگریزی حکومت سے اعزاز حاصل کیا تھا۔ ایک گھنٹہ کا یہ بیان سننے والے کو یا تو ان کی بہادری کا قائل کر دیتا یا پھر اپنی بزدلی کا، کیونکہ پوری داستان میں کوئی کردار ایسا نظر نہیں آتا تھا جس نے انھیں کی طرح اس معرکے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہو۔

ماسٹر صاحب کا ذکر گوشت کے بغیر ممکن نہیں۔ انھیں گوشت اور میٹھے سے جتنی محبت تھی اتنا کریلے سے نفرت۔ کہتے تھے کہ اگر میں مرجاؤں تو میرے پاس پکا ہوا گوشت ایک پیالے میں رکھ دینا۔ ہم سب پوچھتے کہ پھر کیا ہوگا؟ کہتے کہ گوشت دیکھ کر فوراً کھڑا ہو جاؤں گا۔ وہ گوشت کے معاملے میں معیار کے قائل نہیں تھے بلکہ مقدار کے۔ مرحوم نے اپنے ذوق کو آخر دم تک برقرار رکھا۔ بیمار ہوتے تو ڈاکٹروں کے منع کرنے کے باوجود بھی نہیں مانتے اور کہتے:

دال روٹی خوردی ، شکر شکر کردی　　　عادت خدارا خراب می کردی

ان کی گوشت خوری کا منظر شادی بیاہ میں یا پھر بقر عید کے دنوں دیکھنے میں آتا۔ آواز میں کڑکڑاہٹ ہوتی، خوشی کا پٹارہ نظر آتے، خوش اخلاقی سے پیش آتے۔ اس کے برعکس رمضان کے دنوں میں ان کی اضطراری کیفیت دیکھنے لائق ہوتی جب ان پر بھوک کا غلبہ ہوتا۔ ضبط کرنے کے باوجود بھی ضبط نہ کر پاتے مجبوراً صبر اور خاموشی سے کام لیتے۔

ماسٹر صاحب سے دور ہو جانے کی وجہ میری علی گڑھ میں تعلیمی زندگی تھی ، لیکن جب بھی سال چھ مہینے میں ان سے ملاقات ہوتی تو پھر تحت الشعور میں پوشیدہ بات یاد آتی جو ان سے پہلی مڈبھیڑ کے دوران ہوئی تھی لیکن یہ ایک نفسیاتی خلل تھا ورنہ اب ان کی شفقت اور انسانیت کو دیکھ کر یہ اعتماد ہوتا تھا کہ نوجوانوں کی جتنی صحیح اور صالح تربیت برگزیدہ شخصیتوں سے ملتی ہے اتنی کتابوں اور لکچر سے نہیں ملتی۔ کسی نے صحیح کہا ہے کہ جب تک آپ کے دل میں کسی بڑے عقیدہ، ارادہ، مقصد یا شخصیت کا احترام نہ ہوگا نہ آپ اپنے لیے کسی مصرف کے رہیں گے اور نہ کسی دوسرے کے لیے۔

جب میں علی گڑھ سے اپنے گھر آتا تو ماسٹر صاحب سے پہلی ملاقات عموماً مسجد میں ہوتی تھی۔ دیکھ کر باغ باغ ہو جاتے۔ پوچھتے کب آئے ہو، پھر گھر پر ملاقات ہوتی۔ ایک بار کافی دنوں کے بعد ملاقات ہوئی۔ پوچھا کیا کر رہے ہو۔ میں نے بتلایا کہ ایم اے کر لیا ہے اور غیر سودی بنکاری پہ تحقیق کے لیے دوڑ بھاگ کر رہا ہوں، سنا تو آنکھوں میں خوشی کی ایسی چمک ہوئی جو قلب میں اترتی معلوم ہوتی تھی۔ کہنے لگے کہ میں کل آؤں گا تو مجھے اسلامی بنکاری کے بارے میں تفصیل سے بتائیے

اور حسبِ وعدہ وہ دوسرے روز آئے اور میں نے انھیں بتانا شروع کیا، اسی دوران حلوہ اور چائے آگئی۔ پھر وہ اپنی توجہ میری طرف مرکوز کرنے میں ناکام ہو گئے اور جب فارغ ہوئے تو نماز کا وقت ہو گیا۔ وہ مسجد کے متولی تھے، روحانی اور جسمانی دونوں لحاظ سے مسجد میں ان کا غلبہ ہوتا تھا لیکن جو چیز سب سے اہم تھی وہ ان کی اذان تھی۔ میں نے اب تک اتنی پر زور اور پرسوز آواز میں اذان نہیں سنی۔ آندھی ہو یا طوفان، بارش ہو یا کڑاکے کی سردی لیکن "الصلاۃ خیر من النوم" کا پیغام سب کے کانوں میں پہنچا کر بیدار کرتے۔

ماسٹر صاحب اب ہمارے درمیان نہیں رہے۔ مجھے یقین ہے کہ آنے والے دنوں میں لوگ انھیں بھول جائیں گے لیکن اس سے کیا ہوا، جب تک وہ زندہ رہے ان میں زندہ دلی تھی۔ انھوں نے اپنے اوپر کبھی بڑھاپا غالب نہیں آنے دیا۔ وہ بچوں کی طرح خوش رہنا جانتے تھے۔ اپنے اوپر ہنسنے اور اپنے آپ سے مطمئن رہنے کا سلیقہ انھیں معلوم تھا۔ اپنی زندگی کے آخری ایام میں جب انھوں نے پیر کی تکلیف کی وجہ سے سائیکل چلانا چھوڑ دیا تو اپنی پرانی لٹھیا کے سہارے چلتے پھرتے تھے۔ وہ بوڑھے ہو چکے تھے۔ ایک بار میرے گھر آئے تو میں نے انھیں تازہ تازہ خستہ پیش کیا۔ بہت خوش ہو کر دو تین کھایا اور باقی کو کاغذ میں لپیٹ کر اپنی صدری کی جیب میں رکھ لیا۔ ان کے ہونٹ پر مسکراہٹ پھیلی اور دھیمی آواز میں بولے کہ اپنی بڑھیاں کو دوں گا اور مجھے اتنا بڑا سبق دے گئے جو کتاب کے ذریعہ ممکن نہیں۔ پھر میں نے وہ دن بھی دیکھا جب وہ اپنی بڑھیا کو قبرستان لے جا رہے تھے جیسے خدا کی امانت اس کے حوالے کرنے جا رہے ہوں۔ دفن کر کے واپس آ رہے تھے تو لٹھیا کہیں رکھتے اور پیر کہیں پڑتا تھا اور یوں محسوس ہو رہا تھا کہ ؂

ٹھہر جا اے شرر ہم بھی تو آخر مرنے والے ہیں

اس بار علی گڑھ سے گھر آیا تو ماسٹر صاحب نہیں ملے۔ ان کی قبر پر جانے کا اتفاق ہوا۔ قبر دیکھ کر ان کی انسانی شکل نگاہ میں گھومنے لگی۔ میں قبر کے پاس کھڑا تھا آم کی ایک گھنی شاخ اس پر سایہ کیے ہوئے تھی۔ پاس ہی سے پانی کی ایک پتلی سی نہر بہہ رہی تھی، دیکھ کر مجھے بڑا اطمینان ہوا۔

☆☆☆

ماسٹر عبدالقدوس صاحب

حافظ ریاض احمد فلاحی☆

ماسٹر عبدالقدوس صاحب مرحوم چھتر پور کے ایک شریف خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد بہت پہلے جب جامعہ مکتب تھا مدرس ہوئے، اس کے بعد سرکاری اسکول سے منسلک ہوگئے۔ ریٹائر ہونے کے بعد دوبارہ ۱۹۹۱ء میں جامعۃ الفلاح کے شعبۂ ثانوی میں تقرر ہوا اور ۱۹۹۹ء تک خدمت انجام دیتے رہے۔ ماسٹر صاحب اپنے مضمون پر عبور رکھتے تھے۔ یوں تو ہندی، حساب، انگریزی سب پڑھاتے تھے اور خوب پڑھاتے تھے لیکن خاص طور سے جغرافیہ پر ان کی گہری نظر تھی۔ طبیعت کے صاف، خوش مزاج اور ہنس مکھ تھے۔ جس سے ملتے خندہ پیشانی سے ملتے، جامعہ میں جب تک رہے تعلقات سب سے اچھے رہے۔ کسی کو کسی طرح کی شکایت نہ ہوئی۔

آپ کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ آپ بہت زیادہ مہمان نواز تھے، مہمان کی آمد پر آپ خوشی کا اظہار کرتے۔ ایک مرتبہ آپ نے اساتذہ جامعہ کو اپنے گھر مدعو کیا تھا، جب ہم لوگ آپ کے دولت خانہ پر پہنچے تو آپ کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔ جب تک ہم لوگ آپ کے گھر پر رہے ساری توجہ ہم پر رہی کہ کہیں سے ضیافت میں کمی نہ آجائے۔ آپ اخلاق کے اعلیٰ مقام پر فائز تھے۔ آپ نے چند سال ہم لوگوں کے ساتھ تدریسی خدمات انجام دیں لیکن اس دوران ہم نے آپ کو شکایت کرتے نہیں سنا۔ آپ جب بھی گفتگو کرتے تو آپ کے چہرے پر مسکراہٹ ضرور رہتی تھی۔ آپ کا انداز گفتگو نہایت پیارا رہتا تھا اور ان سے بات چیت کرنے میں لطف آتا تھا۔

آپ ۲۶ر فروری ۲۰۰۸ء کو اس دار فانی سے دار جاودانی کی طرف کوچ کر گئے۔ اللہ جل شانہٗ سے دعا ہے کہ آپ کی کوتاہیوں سے درگذر فرمائے اور جنت الفردوس میں جگہ دے۔ آمین ثم آمین

☆☆☆

☆استاذ شعبۂ ثانوی جامعۃ الفلاح، اعظم گڑھ

ماسٹر محمد ادریس صاحب - جامعہ کے معمار اولین

انیس احمد مدنی☆

ماسٹر محمد ادریس صاحب جامعہ کے بالکل اساسی اساتذہ کرام میں سے ہیں۔ آپ نے بلریا گنج کے مکتب کو جامعہ کی شکل دینے میں بہت ہی اہم رول ادا کیا ہے۔ اس کی تعمیر وترقی کے لیے ہندوستان ہی نہیں بیرون ملک بھی بار بار تشریف لے گئے تھے۔ آپ کا پورا نام محمد ادریس ولد خدا بخش ہے۔ آپ بلریا گنج کے مضافات کے ایک گاؤں ہنگائی پور میں یکم دسمبر ۱۹۱۶ء کو پیدا ہوئے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم سرکاری مکتب سے حاصل کی۔ یکم جولائی ۱۹۳۲ء میں جامعۃ الفلاح میں آپ کی تقرری ہوئی اور عمر کے آخری مرحلہ تک تدریسی خدمات انجام دیتے رہے۔ اردو اور ہندی میں آپ اعلیٰ قابلیت وصلاحیت کے حامل تھے، وہ ناکیولر فائنل تھے۔ مڈل اسکول میں آپ مولانا صدرالدین صاحب اصلاحی مرحوم کے کلاس فیلو تھے۔

درجہ چہارم ابتدائی میں آپ میرے استاذ رہے ہیں۔ آپ کا طریقہ تدریس بڑا ہی انوکھا اور مؤثر رہا ہے۔ بڑے انہماک سے اور پورے ذوق وشوق کے ساتھ پڑھاتے، پچھلے سبق کا اعادہ، طلبہ سے سوالات، ہوم ورک کروانا اور اسے چیک کرنا یہ آپ کا روزانہ کا معمول تھا۔ یہاں تک کہ طلبہ کو تمام ہی اسباق اور اس کے معانی ومفاہیم ازبر کرادیتے۔ کوئی ایک طالب علم بھی آپ کے مضمون میں کبھی فیل نہ ہوتا۔ تدریس سے طلبہ کی عدم دلچسپی کا آپ کبھی رونا نہیں روتے۔ وہ معلم ہی کیا جو طلبہ کے اندر تعلیم سے دلچسپی اور اس کا شوق اور حصول علم کی لگن پیدا نہ کردے۔

آپ وقت کی پابندی کرتے، روزانہ درس شروع ہونے سے ایک گھنٹہ پہلے ہی جامعہ آجاتے۔ تاحیات اس معمول میں کبھی فرق نہ آیا۔ اگر کوئی دوسرا معلم تاخیر سے پہنچتا تو بڑی ناراضگی کا اظہار کرتے۔ وقت کی پابندی کی آپ کی اس عادت کو دیکھ کر کبار تابعین کے تعلق سے منقول اس طرح کے اقوال پر اطمینان قلب نصیب ہوجاتا ہے جیسے "ما نودی للصلاۃ منذ اربعین سنۃ الا وسعید فی المسجد" چالیس سالوں سے نماز کے لیے نہیں پکارا گیا مگر سعید بن المسیب اذان

☆استاذ حدیث وتقابل ادیان، جامعۃ الفلاح، اعظم گڑھ

سے قبل ہی مسجد میں موجود ہوتے۔

تعلیم وتدریس کے دوران استنجاء وغیرہ کے لیے کبھی درجے سے باہر نہ جاتے، تدریس کی پوری مدت میں آپ نے کبھی جامعہ میں استنجاء نہیں کیا۔ اس سے آپ موصوف کی تعلیم وتدریس سے بے پناہ لگن اور شوق کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

جامعہ کی تعمیر وترقی اور اس کے مالی استحکام کے لیے آپ نے ان تھک کوشش کی۔ اس زمانے میں جب بلریا گنج اور اس کے اطراف کی مالی حالت بڑی خراب تھی اور لوگ ممبئی وغیرہ جیسے شہروں میں معمولی نوکریاں کرتے تھے۔ آپ ان شہروں میں چند روپئے اور سکوں کے لیے کئی کئی کلومیٹر کا پیدل سفر طے کرکے اہل خیر حضرات کے علاوہ اعظم گڑھ کے ہر ہر فرد تک پہنچنے کی کوشش کرتے۔ آج ممبئی میں جامعہ کا جو قابل ذکر چندہ ہے وہ درحقیقت آپ کی کوششوں ہی کا ثمرہ ہے۔

شریعت پر عمل بھی آپ کی ایک اہم خوبی تھی۔ شریعت کی کسی معمولی ہدایت کو بھی نہیں چھوڑتے تھے۔ آپ کی زندگی میں ہی جب آپ کے ایک بیٹے جناب بدیع الزماں صاحب فلاحی کا انتقال ہوگیا تو ان کے بیٹے کے لیے شریعت کے منشا کے لحاظ سے وصیت کردی۔

ازروئے لطیفہ یہ بات بھی بیان کرتا چلوں جس سے آپ کو ان کی سعادت اور معلم الناس ہونے کی حیثیت سے ان کی خوش بختی پر حسرت ہوگی کہ درجے میں بچوں سے جب تعارف کرواتے اور طالب اپنا اور اپنے والد کا نام اور پتہ بتلاتا تو کہتے کہ ''تمہارے باپ کو بھی پڑھایا ہے اور تمہارے دادا کو بھی۔''

تولہ، ماشہ اور رتی کی جگہ جب گرام اور کلوگرام نے لے لی تو آپ نے فرمایا کہ اس میں دھوکہ کا زیادہ احتمال ہے۔ اس سے آپ وزن کے باب میں موصوف کی شدید احتیاط وتورع کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ وفات سے چند سال قبل جامعہ کی طرف سے سنگاپور کے دورے پر تشریف لے گئے تھے وہاں گرنے کی وجہ سے ہاتھ کی ہڈی ٹوٹ گئی اور کمر میں کافی چوٹ آئی جس کی وجہ سے دوا کھاتے رہتے تھے۔ وفات سے چند ماہ قبل دوبارہ کمر کی تکلیف میں شدت آگئی۔ اٹھنا بیٹھنا محال ہوگیا اور اسی حالت میں موصوف ۳۰؍جولائی ۱۹۹۰ء کو بروز دوشنبہ اپنے رب سے جاملے۔ (ایک روایت ۷؍اگست ۱۹۹۰ء کی بھی ہے) تدفین ہنگائی پور کے آبائی قبرستان میں ہوئی لیکن اس کے باوجود قرب وجوار کے بے پناہ افراد نے جنازے میں شرکت کی۔ اللہ تعالیٰ موصوف کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اور آپ کے شاگردوں کو آپ کی تدریسی زندگی سے سبق لینے کی توفیق بخشے۔☆

میرے استاذ میرے مربی......منشی محبوب خاں مرحوم

محمد عمران فلاحی☆

دنیا میں تقریباً دو طرح کے افراد ہوتے ہیں ایک تو وہ ہوتے ہیں جو پر جلال، نظر فریب، ہنگامہ خیز اور پر ہیبت ہوتے ہیں۔ ہر دیکھنے والے کی نگاہ پہلی ہی نظر میں مرعوب ہوجاتی ہے۔ دل و دماغ پر ان کا سکہ بیٹھ جاتا ہے۔ ان کی آواز سب پر بھاری اور شخصیت سب پر حاوی ہوجاتی ہے مگر ان حضرات کا حال عموماً یہ ہوتا ہے کہ دور سے تو باعظمت معلوم ہوتے ہیں مگر جیسے جیسے ان سے قریب ہوتے جایئے اور اندرون میں جھانک کر دیکھئے تو ان کی حیثیت پھیکی پڑنے لگتی ہے اور وہ ہلکے نظر آنے لگتے ہیں۔ اس کے برعکس کچھ حضرات ایسے ہوتے ہیں جو اپنے ظاہر میں تو کوئی نمایاں شان نہیں رکھتے۔ دور کے لوگوں کو تو چھوڑئے گردوپیش اور ماحول کے لوگ بھی انہیں نہیں پہنچانتے، دیکھنے والی نگاہیں انہیں کوئی اہمیت نہیں دیتیں، انہیں ایک معمولی انسان سمجھتی ہیں مگر ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ درحقیقت وہ ایک عظیم انسان ہوتے ہیں۔ ان کے اندر ایک قد آور شخصیت پوشیدہ ہوتی ہے۔ جیسے جیسے ان سے قریب ہوتے جایئے، طبیعت متاثر ہوتی جاتی ہے۔ ان سے عقیدت بڑھ جاتی ہے، دھیرے دھیرے وہ شخصیت دل و دماغ پر چھاجاتی ہے اور اس کے مقابلہ میں دوسری شخصیتیں ہیچ نظر آنے لگتی ہیں۔ جناب منشی محمد محبوب مغفور ومرحوم کی شخصیت بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ موصوف بظاہر بہت سادہ تھے مگر بلریا گنج کے قرب و جوار کے جن حضرات نے ان سے علمی پیاس بجھائی ہے وہ جانتے ہیں کہ آپ کتنے باکمال انسان تھے، وہ تنہا ایک فرد نہ تھے بلکہ ایک عظیم ادارہ اور ایک عظیم ادارہ کی جان تھے۔

منشی محبوب صاحب کے اخلاق وکردار سے تو سبھی حضرات متاثر تھے ان کی نیک نفسی اور نرم خوئی، سادگی اور خدا ترسی، زہد وورع اور صبر وقناعت کے تو بھی لوگ قائل تھے، سبھی ان کی تعریف کرتے تھے۔ آپ نے اخلاق کا ایک معیار اور ایثار وقربانی کی ایک مثال قائم کی۔ شمع کی طرح

☆استاذ نحو وصرف، جامعۃ الفلاح، اعظم گڑھ

انھوں نے نہایت خاموشی اور صبر کے ساتھ اپنے قلب وجگر کا تیل جلا جلا کر طلبہ کے دلوں کو علم سے منور کیا۔

منشی محبوب مرحوم ومغفور نے اس مکتب اسلامیہ کو جو جامعہ اسلامیہ سے گذرتے ہوئے اب جامعۃ الفلاح کی شکل میں موجود ہے، اپنے خون جگر سے سینچا۔ اپنی جوانی و پیری کی قیمتی صلاحیتوں اور توانائیوں کو اس میں لگا دیا۔ کام زیادہ کیا اور نام سے گریز کیا۔ اپنے آپ کو نمایاں نہیں کیا۔ ان کی مثال عالیشان بلڈنگ کی تہہ میں لگی ہوئی اس اینٹ کی سی ہے جو دکھائی تو نہیں دیتی مگر اس پوری بلڈنگ کا مکمل بوجھ اٹھائے رہتی ہے۔ موصوف بھی اس جامعہ کے بنیادی اساتذہ میں سے تھے۔ آپ نے تقریباً ۱۹۳۰ء میں اس مکتب میں معلّمی شروع کی۔ ۱۹۵۸ء میں اس سے مستعفی ہوئے۔ آپ نے مکتب کی شکل کے بعد جامعہ اسلامیہ سے ہوتے ہوئے اس مکتب کو جامعۃ الفلاح کی شکل میں بھی دیکھا۔ آپ ۱۹۶۸ء میں بلریا گنج میں ہی انتقال کر گئے اور یہی پر دفنائے گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

شجرۂ نسب

منشی محبوب کے جد اعلیٰ جگمل سنگھ (جگد مبا سنگھ) بیڑ ہر سے ہجرت کرکے جگمل پور نام کا گاؤں بسایا جو علاؤ الدین پٹی کے پچھّم جانب واقع ہے اور یہیں پر آکر آباد ہو گئے۔ منشی محبوب کے والد کا نام خدا بخش دادا جان کا نام مولیٰ بخش اور پر دادا کا نام کریم بخش تھا۔ بڑیہر ضلع فیض آباد (جو فی الحال امبیڈکر نگر) کے قصبہ ہنسور کے پاس ایک قدیم بستی ہے بڑیہر آج بھی آباد ہے اور ٹھاکروں کی شان وشوکت کی گواہ کی شکل میں کئی پرانی عمارتیں آج بھی کھڑی ہیں۔ تغلق سلاطین کے عہد تک بڑیہر پورب کی ایک طاقتور ریاست تھی۔ جب جب دہلی کی مرکزی حکومت کمزور ہوئی بیڑ یہر کے ٹھاکر بغاوت کرکے آزاد ہو جاتے۔ سب سے پہلے جونا خان نے ان ٹھاکروں کے زور کو توڑ کر اپنے زیر نگیں کیا اور اس ریاست کو چھوٹی چھوٹی جاگیروں میں تبدیل کر دیا۔ اس انتظام کے بعد یہاں کے ٹھاکر پھر کبھی سر نہ اٹھا سکے۔ یہ وہی جونا خان ہیں جن کے نام پر شہر جونپور آباد ہے جونا خاں کے اس انتظام کے بعد ہی پورب کا یہ علاقہ باضابطہ طور پر دہلی کے ماتحت آیا۔

بیڑ یہر ریاست کے سات ٹکڑے ہوئے۔ ہر ٹکڑے کو (کورٹ) کا نام دیا گیا۔ یہ سبھی کورٹ کسی نہ کسی شکل میں آج بھی موجود ہیں۔ فیض آباد، امبیڈکر نگر، سلطان پور، پرتاب گڑھ، اعظم گڑھ وغیرہ پرتاب گڑھ کے راجہ بھیا کا خاندان بیڑ یہر سے ہی تعلق رکھتا ہے۔ مرکزی بیڑ یہر کو

باون پرگنے ملے یہ خاندان پھلتا پھولتا رہا۔ اس خاندان کا بڑا مشہور واقعہ اس طرح بیان کیا جا رہا ہے کہ جگمل سنگھ تین بھائی تھے جن میں صرف بڑے بھائی کی شادی ہوئی تھی۔ بڑے بھائی کے ہاتھ میں جاگیر کی باگ ڈور تھی۔ انھوں نے دونوں بھائیون کو جاگیر کے معاینہ کے لیے بھیجا۔ دونوں بھائی جب اس مہم سے واپس آئے تو بھوک زوروں پر لگی تھی۔ سیدھے رسوئی گھر (کچن) میں گھس گئے۔ ماں سمان بھابھی نے ان کی اس حرکت پر چڑھ کر کہا: کارے؟ تو لوگ ترک ہو گیلا کیا کہ بنا نہائے دھوئے رسوئی گھر میں گھس آئے۔ بھابھی کے اس جملہ سے دونوں بھائی سخت ناراض ہو گئے اور غصے کی حالت میں رسوئی گھر سے نکل آئے۔ جب یہ بات بڑے بھائی تک پہنچی تو انھوں نے ان دونون کو منانے کی بہت کوشش کی، بہت چمکارا اور کہا: ارے بھائی بھوجائی ہے، مجاک کیا ہے، مجاک پر کوئی رسیاتا ہے۔ مگر دونوں کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہوا اور ماننے کو تیار نہیں ہوئے بلکہ کہنے لگے: اب ہمہن ترک بن کر دکھائیں گے۔ اس جملہ پر آس پاس کے بڑے بوڑھے ٹھاکر بھی سمجھانے کے لیے آئے مگر ہر کوشش لا حاصل رہی۔ تھک ہار کر بزرگوں نے پوچھا بھئی کیا چاہتے ہو۔ دونوں نے کہا باون پرگنہ ہے کسی کونہ میں کچھ دے دیجئے تا کہ ہمار اونش بھی چلتا رہے۔ بزرگوں کے فیصلہ کے مطابق موجودہ اعظم گڑھ میں دو گاؤں دے دیا گیا۔ جگمل سنگھ بیڑ یہر سے جگمل پور آ گئے، مسلمانوں میں شادی ہوئی۔ بچے ہوئے خاندان آگے بڑھتا گیا۔ رفتہ رفتہ بیڑ یہر سے تعلق ختم ہوتا چلا گیا۔ بیڑ یہر آج بھی موجود ہے۔ ٹھاکروں کا گھرانہ بھی موجود ہے۔ ایک بھائی بیڑ یہر میں رہتے ہیں اور ایک بھائی ریاست اتر پردیش کے سچیوالے لکھنؤ میں باوقار عہدے پر فائز ہیں۔ بزرگوں کے مطابق آزادی سے کافی پہلے تک آنا جانا تھا، قریب کے موضع گدوپور کے ٹھاکروں سے بھی بیڑ یہر کی رشتہ داریاں تھیں۔ بلریا گنج کے مشہور ڈاکٹر فیاض احمد خان کا شجرہ پانچویں پشت میں جا کر منشی محبوب صاحب کے شجرہ سے مل جاتا ہے۔ منشی محبوب صاحب کے والد برٹش آرمی میں ایک اعلیٰ عہدہ پر فائز تھے۔ ان کی ڈیوٹی عدن میں تھی۔ بیوی بچوں کے ساتھ وہیں پر رہتے تھے۔ منشی محبوب عدن میں پیدا ہوئے، ان کے والد خدا بخش جب شہید ہو گئے تو ان کی بیوی بچوں کو برٹش گورنمنٹ نے بمبئ بھیج دیا۔ یہ لوگ ایک سال تک بمبئ ہی میں مقیم رہے۔

خدا بخش کی شادی بلریا گنج میں بہادر خاں کی بہن سے ہوئی تھی۔ جب بہادر خاں کو اس کا پتہ چلا تو وہ فوراً بمبئ گئے اور بہن اور اس کے بچوں کو لے کر وطن واپس آ گئے۔ بہادر خاں بلریا گنج کے رئیسوں میں شمار کئے جاتے تھے۔ زمینداری مہاجنی کے ساتھ ساتھ کپڑے کا کاروبار کرتے۔

ان کی شادی کلکتہ کے ایک رئیس گھرانے میں ہوئی تھی۔۱۹۲۲ء سے قبل بہادر خاں کے گھر پر لاہور، بمبئی، کلکتہ سے اردو کے مشہور اخبار پابندی سے آتے تھے۔اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ منشی محبوب کے آباواجداد نیز دوسرے اعزہ واحباب بھی علم دوست تھے۔ چونکہ بہادر خاں کے پاس کوئی اولاد نہیں تھی اس لیے بہن کے ساتھ ساتھ دونوں بھانجوں (یعقوب خاں اور منشی محبوب خاں) کو بھی اپنے یہاں رکھ لیا۔اس وجہ سے ان کا آبائی وطن جگمل پور چھوٹ گیا۔خدابخش کے یہ دونوں بیٹے اپنے ماموں بہادر خاں کے پاس رہنے لگے۔یعقوب خاں نے اپنے ماموں کی کھیتی باڑی سنبھال لی اور محبوب خاں تعلیم میں لگ گئے۔چونکہ ذہین تھے اس لیے ضلع اعظم گڑھ میں اول آئے اور خاندان کا نام روشن کیا۔ان کی ذہانت کو دیکھ کر انگریز عہدیدار نے بہادر خان سے خود آکر کہا: تمہارا بچہ بہت Genius (حددرجہ ذہین ہے) اسے ہم کو دے دو ہم اس کو پڑھا کر ڈپٹی مجسٹریٹ بنادیں گے۔ چونکہ بہادر خان کے انگریز عہدیداروں سے اچھے مراسم تھے اس لیے ازراہِ ہمدردی یہ بات کہی مگر اس پر بہادر خاں نے انگریز کو یہ جواب دیا کہ یہ دونوں میرے بازو ہیں۔میں اپنے کسی بازو کو نہیں کٹواؤں گا۔ویسے بھی میں لاوارث ہوں، میرے بعد سب انہیں کا ہے۔تعلیم کے بعد محبوب مکتب اسلامیہ (جواب جامعۃ الفلاح ہوگیا ہے) میں پڑھانے لگے اور محبوب خاں سے منشی محبوب ہوگئے اور طلبہ میں منشی جی کے نام سے پہچانے جانے لگے۔

شادی

آپ نے دو شادیاں کی، پہلی شادی بلریاگنج کے پڑوس میں مدھناپار کے گاؤں کے زمیندار گھرانے میں اقبال احمد مرحوم کھادوالے کی چچیری پھوپھی سے ہوئی۔ان کے بطن سے ایک بیٹا رفیق احمد خاں اور تین بیٹیاں پیدا ہوئیں۔طاعون کی بیماری میں یعقوب خاں کی بیوی و محبوب خاں کی بیوی اور تین بیٹیاں انتقال کر گئیں۔بچوں میں صرف رفیق احمد خاں ہی بچے۔ان کا دلار پیار اور بڑھ گیا تعلیم کے لیے اسی مکتب میں داخلہ کرایا گیا مگر ان کا دل تعلیم میں نہیں لگا۔بہانہ کرنے لگے کہ سر میں درد پیٹ میں درد کوئی نہ کوئی بہانہ بناتے رہے۔اکیلے ہونے کی وجہ سے ان کے والد اور چچا نے بھی کوئی سختی نہیں کی۔جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ منشی محبوب جس نے پورے دیار کو پڑھایا مگر اپنے اس اکلوتے بیٹے کو نہ پڑھا سکے۔اس طرح چراغ تلے اندھیرا ہی رہ گیا۔

چوں کہ منشی محبوب کی پہلی بیوی انتقال کر گئیں اور گھر کی دیکھ ریکھ کے لیے کوئی نہیں رہ گیا تو مجبوراً ایک دوسری شادی پنڈت برادری کی نومسلمہ سے کر لی۔جس کے بطن سے پانچ لڑکے اور

دولڑکیاں پیدا ہوئیں۔منشی محبوب کے بڑے صاحبزادے رفیق احمد کی شادی بلیا کلیان پور میں ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں دو بیٹے ریاض احمد خاں اور نثار احمد خاں اور ایک بیٹی افسری بانو عطا کیا۔رفیق صاحب نے خود تو نہیں پڑھا مگر اپنے بچوں کو تعلیم سے آراستہ کیا۔بڑے لڑکے ریاض احمد خاں نے تاریخ سے ایم اے کیا۔

رفیق احمد نے بمبئی میں Port Trust میں کام کیا اور اپنے بڑے لڑکے کو بھی وہیں پر سروس میں لگا دیا۔ان کی اہلیہ کا انتقال ۱۹۶۰ء میں ہوگیا۔بچوں کی پرورش بہت ہی محنت سے کی۔ انھیں تعلیم سے آراستہ کیا۔آخر کار موصوف بھی ۱۹۹۴ء میں انتقال کر گئے۔اناللہ وانا الیہ راجعون

جسمانی ساخت

۱۹۵۴ء میں جب میرے والد مرحوم نے میرا داخلہ مکتب اسلامیہ میں کرایا تو سب سے پہلے جس استاذ کو دیکھا وہ منشی محبوب تھے۔آپ نہایت ہی خوبصورت وتوانا اور جسیم تھے۔رنگ گورا چٹا تھا۔قدمیانہ تھا، بدن پر عموماً خون کی سرخی دوڑتی رہتی تھی۔خوش وضع وخوش پوشاک تھے۔

عبادت و ریاضت

منشی محبوب صاحب بے حد عبادت گزار اور شب بیدار تھے۔تلاوت کلام پاک پابندی سے کرتے۔طبیعت میں استغناء پایا جاتا۔اس کی صرف دو مثالیں پیش کر رہا ہوں۔

منشی جی کے پڑوسی زمین فروخت کر رہے تھے۔ان کے بچوں نے کہا کہ یہ ہمارے موقع کی زمین ہے، خرید لیجئے۔اس پر آپ نے فرمایا نہیں پڑوسی کی زمین نہیں خریدی جائے گی، معلوم ایسا ہوتا ہے ان کو پیسہ کی ضرورت ہے اس لیے ان کی مالی مدد کردو۔

منشی جی کے قبضہ میں تین بیگھہ زمین کاشتکاری کی تھی۔جب زمیندار نے کہا کہ یہ میری زمین ہے آپ چھوڑ دیجئے، اس مطالبہ پر آپ نے اسے واپس کر دیا جبکہ قانوناً زمیندار زمین نہیں لے سکتا تھا دیگر حضرات نے بھی آپ کو روکا مگر آپ کا جواب تھا کہ درحقیقت یہ زمین اسی کی ہے۔یہ میرے لیے درست نہیں ہے۔اس طرح منشی جی نے دنیا کے مقابلے میں آخرت کو ترجیح دی۔اس طرح کی بہت سی ایسی مثالیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے اندر زہد وورع کے ساتھ ساتھ حد درجہ استغناء بھی پایا جاتا تھا۔

آخری وصیت

جب منشی جی کے انتقال کا آخری وقت آیا تو یہ افواہ پھیل گئی کہ منشی جی کا انتقال ہوگیا۔

حالانکہ ابھی انتقال نہیں ہوا تھا۔ یہ خبر سن کر جب ان کے اعزہ واقرباء اور لڑکے گھر پہنچے تو دیکھا کہ آپ کا آخری وقت ہے۔ بہت ساری عورتیں قرآن کریم کی تلاوت کر رہی ہیں۔ اس موقع پر جب آپ نے اپنے چھوٹے لڑکے شفیق احمد کو دیکھا تو سر کے اشارے سے اپنے پاس بلایا اور ان کے کان میں کہا کہ روزانہ تلاوت کرنا۔ غریب بھائی کی مدد کرنا۔ اپنی ماں کا خیال رکھنا۔ ان شاء اللہ خدا تم کو سب کچھ دے گا۔

اسلوب تدریس

جس مکتب میں منشی محبوب تعلیم دے رہے تھے اس وقت وہ مکتب درجہ اطفال، اول، دوم اور سوم پر مشتمل تھا۔ درجہ اطفال اور درجہ اول کی تدریس کی ذمہ داری منشی محبوب کی تھی اور درجہ دوم و سوم کی ذمہ داری مولوی محمد ادریس ہنگائی پوری کی تھی۔ گویا درجات چار اور اساتذہ صرف دو تھے۔ مکتب اسلامیہ کی دیوار بھی کچی اور چھت کھپریل کی تھی۔

یہ دو ہی اساتذہ چار درجات کے طلبہ کو تعلیم دیتے پھر بھی ان کا معیار تعلیم دیگر مکاتب و مدارس سے اچھا رہتا۔ یہ ان حضرات کے خلوص ومحبت کی برکت تھی۔ تعلیمی گھنٹی بجنے سے تقریباً ایک گھنٹہ قبل یہ حضرات حاضر ہو جاتے اور باقاعدہ تعلیم شروع ہونے سے پہلے ہی طلبہ وطالبات کو بہت کچھ پڑھا چکے ہوتے۔ جب باقاعدہ تعلیم کا آغاز ہوتا تو بقیہ مضامین کی تعلیم دیتے۔ طلبہ بھی اس کے عادی ہو چکے ہوتے۔ گھنٹہ بجنے سے قبل حاضر ہو جاتے۔ یہ منظر ان اساتذہ وطلبہ نے بھی دیکھا ہوگا جو ماضی قریب میں محمد ادریس کے زمانے میں جامعۃ الفلاح میں موجود تھے۔ آج کل نہ اساتذہ اور نہ ہی طلبہ میں یہ خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ اگر کوئی وقت سے قبل آنا بھی چاہتا ہے تو نہ آفس کھلا رہتا ہے نہ اسٹاف روم اور نہ ہی کلاس روم۔ گویا زبان حال سے کہا جاتا ہے کہ تم نے پہلے آکر جرم کیا۔ خواہ اساتذہ ہوں یا طلبہ آئندہ وقت سے قبل آنے کی جرأت نہ کریں۔

اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ ایک استاذ دو درجوں کو کیسے پڑھاتا تھا، اس کا جواب یہ ہے کہ طلبہ کو ایک گھنٹہ باقاعدہ تعلیم کے آغاز سے قبل پڑھاتے پھر تعلیم شروع ہونے پر ایک درجہ کے طلبہ کو کچھ مضامین پڑھا کر لکھنے و یاد کرنے کا کام دے دیتے پھر دوسرے درجہ کے طلبہ کو بلاتے اور اس کو چند مضامین پڑھا کر لکھنے و یاد کرنے کا کام دیتے۔ اس طرح باری باری سبھی طلبہ کو مشغول رکھتے اور خود بھی پورے اوقات لگے رہتے اور تعلیم جاری رکھتے۔ یہ حضرات اپنی کوئی گھنٹی خالی نہیں رکھتے، آٹھوں گھنٹی پڑھاتے۔ تعلیم کا انداز اور اس کا معیار ایسا تھا کہ قرب وجوار کے مسلمان ہی نہیں بلکہ غیر

مسلم یادو و بنیا برادری وغیرہ بھی اس مکتب کا رخ کرتے اور ان بزرگوں سے اپنی تعلیمی پیاس بجھاتے اور ایک دوسرے کے ساتھ رہ کر پیار ومحبت کا نمونہ پیش کرتے۔ منشی محبوب صاحب بچوں کی نفسیات سے واقف تھے۔ گنتی وحساب پڑھانے کے لیے انہیں چیزوں کا استعمال کرتے جن سے بچے مانوس ہوتے مثلاً اس کام کے لیے وہ شیشہ کی گولی وکوڑی استعمال کرتے، جو کپڑے کی دو تھیلیوں میں رکھتے اور بچوں کو انہیں کے ذریعہ عملاً سمجھاتے مثلاً ایک گولی رکھ کر بتاتے ایک اکائی، دو گولی رکھ کر بتاتے دو اکائی۔ اسی طرح ایک ایک گولی کا اضافہ کرکے نو اکائی تک بتاتے پھر اس میں ایک گولی کا اور اضافہ کرکے بتاتے اب یہ دس ہو گئیں۔ ان کو ایک دہائی کہتے ہیں۔ اسی طرح سو گولیوں یا کوڑیوں کے ذریعہ سو تک کی گنتی بچوں کے ذہن میں بیٹھا دیتے۔ ایسے ہی جوڑ اور گھٹانے کا حساب بھی ان گولیوں اور کوڑیوں کی مدد سے سمجھاتے اور بچوں کے ذہن نشین کرا دیتے۔

آج کمپیوٹر کا زمانہ ہے، طلبہ خوشخطی پر زور نہیں دیتے۔ پہلے باقاعدہ خوشخط لکھنے کی مشق کرائی جاتی تھی۔ اس فن کی کتابیں بھی اس زمانے میں دستیاب تھیں۔ خوش خط لکھنے کے لیے اچھے قلم کا بھی ہونا ضروری ہے۔ منشی محبوب جب دیکھتے کہ فلاں طالب علم کے پاس قلم نہیں ہے یا اس کا قلم خراب ہو چکا ہے تو اپنے چاقو سے کنڈے یا نرکٹ کا قلم خود تیار کرکے طلبہ کے حوالہ کرتے تاکہ وہ خوش خط لکھ سکیں۔

ایسے ہی زراعت کے سلسلہ میں بھی ابتدائی معلومات دیتے۔ چونکہ حکومتی سطح پر پودے لگانے کھیتی کرنے کے طریقے سکھانے کی نہ صرف ترغیب دی جاتی تھی بلکہ بحیثیت مضمون نصاب تعلیم میں شامل ہوتا، اس لیے ہم طلبہ کو منشی محبوب صاحب اس کا بھی گر سکھاتے۔

حسن البناء ہاسٹل کے سامنے جو پانی کی بڑی ٹنکی ہے، ٹھیک اس سے متصل پچھم جانب یعنی نگران اعلیٰ کے موجودہ دفتر کے سامنے تقریباً دو بسوہ زمین کھیتی باڑی کی تعلیم کے لیے مختص تھی۔ طلبہ اپنے گھروں سے گوبر کی کھاد لاتے اور ایک ایک پوٹری لہسن کا بیج لاتے۔ طلبہ منشی جی کی نگرانی میں اس کھیت کی گڑائی کرکے کیاری بناتے اور گھروں سے لائے کدال وغیرہ سے لہسن کی بوائی کرتے۔ ضرورت کے مطابق اس کی سینچائی ونرائی کرتے۔ چونکہ یہ کیاریاں مختلف طلبہ کے درمیان تقسیم کر دیتے، اس لیے طلبہ کی ہر ٹولی یہ کوشش کرتی کہ میری کیاری کی فصل سب سے اچھی اور اول آئے اس طرح ہم طلبہ کے اندر خیر میں مسابقہ کا جذبہ پیدا ہوتا اور خوب اچھی فصل تیار ہو جاتی۔ اس عمل سے جہاں طلبہ کو زراعت کے گر معلوم ہوتے وہیں ان کے اندر انفاق وخدمت کا جذبہ پیدا ہوتا

اور مادر علمی سے مزید محبت ہوتی۔افسوس کہ اس طرح کی صفت آج مفقود ہے۔

جب میں نے اس مکتب کا آخری درجہ (تیسرا کلاس) پاس کرلیا تو اگلے درجہ کی تعلیم کے لیے کسی دوسرے مدرسہ میں جانے کی ضرورت نہیں پڑی بلکہ خوش قسمتی سے مدرسہ کے ذمہ داروں نے درجہ چہارم و درجہ پنجم کی تعلیم کا نظم بھی کردیا اور یہ درسگاہ مولانا مودودی ہاسٹل کے ہال کی جگہ تعمیر کی گئی تھی۔اس میں ان دونوں درجات کی تعلیم ہوئی۔اس کے لیے مزید دو اساتذہ کا تقرر ہوا۔ جناب مولانا خلیل احمد غازیپوری مرحوم، اور جناب ماسٹر عبدالقدوس صاحب چھترپوری مرحوم۔ایک صاحب اس درسگاہ کے دکھن جانب تدریس کا کام کرتے اور دوسرے صاحب اتر جانب تدریس کا کام انجام دیتے۔اس طرح یہ دونوں اساتذہ دونوں درجات کو تعلیم دیتے۔

چونکہ اس مکتب کا الحاق سرکاری ایجوکیشن بورڈ سے تھا، اس لیے ہم درجہ پنجم کے طلبہ نے ڈپٹی (سرکاری تعلیمی ذمہ دار) کی نگرانی میں انجان شہید کے سینٹر پر جاکر امتحان دیا اور امتحان کے دوران وہیں پر ہم سب نے قیام کیا۔اس وقت میرے ساتھیوں میں بدر عالم نصیر پوری مرحوم، ڈاکٹر ابوشحمہ رکن شوریٰ جامعۃ الفلاح بلریاگنج اور عبدالباقی ہنگائی پوری وغیرہ تھے۔

میرے ان ساتھیوں نے مزید جدید مضامین کی تعلیم کے حصول کے لیے سرکاری اسکولوں کا رخ کیا اور اعلیٰ تعلیم حاصل کرکے اہم عہدوں پر فائز ہوئے۔مگر میں اور میرے دیگر ساتھیوں نے یہیں رہنے کا فیصلہ کیا۔اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور اس کی مہربانی سے ذمہ داروں نے درجہ ششم کھولنے کا فیصلہ لیا۔جب یہ درجہ بھی پاس کرلیا تو درجہ ہفتم بھی کھولنے کا فیصلہ کیا۔اس طرح مجھے کہیں دوسرے مدرسہ جانے کی ضرورت نہیں پڑی۔درجہ ہفتم پاس کرنے کے بعد بغیر درجہ بندی کے مفتی عبدالرؤف مرحوم مبارکپوری و دیگر اساتذہ کے ذریعہ ابتدائی عربی و دیگر مضامین کی تعلیم حاصل کیا پھر ۱۹۶۲ء میں جناب مولانا عبدالحسیب اصلاحی مدظلہ العالی بحیثیت معلم اس جامعہ میں تشریف لائے اور اسباق النحو اول و دوم وغیرہ پڑھانا شروع کیا۔اس وقت موصوف سے استفادہ کرنے والوں میں میرے ساتھ ڈاکٹر وسیم احمد مرحوم بلریاگنج، محمد محسن مدھناپار، مولانا انصار احمد مرحوم بلریاگنج وغیرہ تھے، لیکن چند ہی مہینوں کے بعد حسب وعدہ آپ جامعۃ الرشاد چلے گئے، جن کا ہم طلبہ کو بڑا قلق رہا۔ موصوف کے چلے جانے کے بعد ہم لوگوں کا تعلیمی سلسلہ ایک طرح سے مفلوج ہوگیا مگر چند مہینوں کے بعد عربی تعلیم کے لیے جناب مولانا شبیر احمد مرحوم کا تقرر ۱۹۶۲ء ہی میں عمل میں آگیا۔انھوں نے درجہ بندی کی اور باقاعدہ عربی تعلیم شروع کردی اور اس مکتب اسلامیہ کا نام بدل کر جامعہ اسلامیہ رکھا۔

جب مولانا شبیر احمد صاحب یہاں تشریف لائے تو اپنے ساتھ پورنیہ ضلع کے چند بچوں کو بھی لے آئے۔اس طرح اس جامعہ میں بہار لے کر آئے۔جامعہ میں تو طلبہ کے ذریعہ بہار لانے کا کام کیا اور اس کے میدان کو ہرا ابھرا کرنے کے لیے ایک سدابہار پودا لے کر آئے تاکہ جامعہ اسلامیہ کی زمین بھی ہری بھری ہوجائے۔مولانا مرحوم نے اس سدابہار پودے کے ٹکڑے کاٹ کاٹ کر ہم طلبہ سے جامعہ اسلامیہ کے میدان میں لگوادیا جس سے چند مہینوں میں پورا میدان ہرا ابھرا ہوگیا اور چند ہی سال میں قرب و جوار کی بستی کے لوگوں کے ذریعہ یہ پودا قرب و جوار میں بھی پھیل گیا اور پاس پڑوس کے ہر گاؤں کے گڈھے و نالے کے کنارے یہ پودا لہلہانے لگا۔جب جامعہ اسلامیہ کے میدان میں ہریالی چھاگئی تو مولانا نے ایک شاندار نظم لکھی۔اس میں سے ایک شعر یہ ہے جو جامعہ کی تاریخ بتلاتا ہے۔

اب بلریاگنج کی قسمت کا تارا جگ گیا ۔۔۔ دیکھئے کیا ضوفشاں ہے جامعہ اسلامیہ

یہ نظم اس وقت ہر چھوٹی بڑی تقریب کے موقع پر پڑھی جاتی، اس کو پڑھنے کی مشق منظور احمد پورنوی نے اچھے طریقہ سے کرلی تھی اور وہی عام طور پر پڑھتا تھا۔مولانا شبیر احمد اصلاحی مرحوم کے ساتھ ضلع پورنیہ کے جو طلبہ آئے تھے وہ منظور احمد، محمد ذکی، محمد عیسیٰ، مسعود احمد وغیرہ تھے۔انہیں طلبہ کے ذریعہ اس جامعہ اسلامیہ کی بورڈنگ کا آغاز ہوا۔چونکہ مطبخ کا نظم نہیں تھا اس لیے یہ طلبہ بستی کے چند مخیّر حضرات کے گھر جاکر کھانا کھایا کرتے تھے۔منظور جناب حاجی ابوالاعلیٰ مرحوم کے گھر، محمد ذکی منشی فوجدار مرحوم کے گھر، محمد عیسی حاجی امانت اللہ مرحوم کے گھر اور مسعود احمد بابو مطیع الرحمٰن کے گھر جاکر کھانا کھایا کرتے تھے اور بورڈنگ میں رہ کر تعلیم حاصل کرتے تھے۔

چونکہ یہ تحریکی ادارہ ہے، اس کی بنیاد ہی تحریک پر پڑی ہے اس لیے تحریک کے فعال و مخلص ارکان شوریٰ جامعۃ الفلاح بلریاگنج نیز دیگر مخلصین (حکیم محمد ایوب مرحوم و ڈاکٹر خلیل احمد، حاجی امانت اللہ مرحوم، منشی فوجدار خاں مرحوم، محمد اکرام پردھان مرحوم، ماسٹر محمد ابراہیم مرحوم وغیرہ نے اس جامعہ اسلامیہ کو ایک ایسی عربی درسگاہ بنانے کا عزم کرلیا تھا جو جدید وقدیم کا سنگم ہو۔اس کے لیے ایک ایسے فعال اور مخلص فرد کی ضرورت تھی جو اس خواب کو شرمندۂ تعبیر کرسکے۔اس کام کے لیے ذمہ داروں خصوصاً ڈاکٹر خلیل احمد صاحب مدظلہ العالی کی نظر انتخاب جناب مولانا عبدالحسیب اصلاحی پر پڑی اور کوشش کرکے موصوف کو جامعۃ الرشاد اعظم گڑھ سے بلریاگنج لے آئے۔چونکہ مولانا عبدالحسیب صاحب بھی جماعت اسلامی کے رکن تھے اس لیے اس تحریکی ادارہ کی خدمت کے

لیے تیار ہوگئے، کوئی عذر مانع نہیں رہا۔ اور جامعۃ الرشاد کو الوداع کہتے ہوئے ۱۹۶۴ء میں پھر دو سال کے بعد جامعۃ الفلاح بلریا گنج آ گئے یہاں آتے ہی آپ نے اس جامعہ کی باقاعدہ پلاننگ کی۔ ذمہ داروں کا تعاون اور ان کا حوصلہ پا کر ۱۹۶۴ء میں عربی درجات کے چار کلاسیز (عربی اول تا عربی چہارم) کھول دئے اور ان درجات کے لیے باصلاحیت اساتذہ کی تلاش بھی شروع کردی۔ سب سے پہلے آپ نے جناب مولانا صغیر احسن اصلاحی رسولپوری سے درخواست کی۔ وہ بھی رکن جماعت تھے اس لیے اس درسگاہ کی اہمیت کے پیش نظر اپنے گاؤں کے مکتب مدرسۃ النجاح کو خیرباد کہتے ہوئے اس جامعہ کی خدمت کے لیے نہ صرف بلریا گنج آ گئے بلکہ اپنی آخری عمر میں زمین رسولپور چھوڑ کر یہیں جامعہ کے پیچھے آباد ہوگئے۔ اس کے بعد چند ہی دنوں میں مولانا عبدالحسیب اصلاحی و دیگر ذمہ داروں نے بقیہ اساتذہ کا بھی نظم کرلیا اور طلبہ کی تعلیم و تدریس کا باقاعدہ کام شروع کردیا۔

عربی چہارم کے لیے ابوالمکارم فلاحی، حبیب احمد فلاحی، عبدالوحید فلاحی چتر پور و دیگر مقامات سے آئے۔ عربی سوم کے لیے ڈاکٹر ابرار احمد و رحمت اللہ الاثری و ڈاکٹر نیاز احمد و عرفان احمد و مشہود عالم وغیرہ جامعۃ الرشاد و دوسرے مقامات سے آ گئے اور عربی دوم کے لیے بیرونی طلبہ میں سے مطیع اللہ، ظفر احمد، شفاعت احمد و شفیق احمد وغیرہ جامعۃ الرشاد و دوسرے مدرسوں سے آئے۔ محمد عمران و ڈاکٹر وسیم احمد، انصار احمد، ڈاکٹر علاؤ الدین و عرفان احمد وغیرہ نے بھی عربی دوم میں داخلہ لے لیا۔ چونکہ ہم مقامی طلبہ نے جناب مولانا عبدالحسیب اصلاحی سے ۱۹۶۲ء و مولانا شبیر احمد اصلاحی مرحوم وغیرہ سے ۱۹۶۲ء-۱۹۶۳ء میں اردو ہندی وانگریزی وغیرہ کی اور اسی کے ساتھ عربی کی اتنی تعلیم حاصل کرلی تھی کہ آسانی کے ساتھ ہمیں ۱۹۶۴ء میں عربی دوم میں داخل کردیا گیا۔ داخل خارج ریکارڈ کے مطابق میرا داخلہ نمبر شعبۂ اعلیٰ میں پہلا ہے۔ اس کے بعد نئے طلبہ سے عربی اول بھی قائم ہوگیا اور ہر سال ایک نئے درجہ کا اضافہ ہوتا رہا، اس طرح درجہ عربی ہفتم (فضیلت) کا درجہ پاس کر کے پہلا بیچ ۱۹۶۷ء میں فارغ ہوا اور دوسرا ۱۹۶۸ء میں اور تیسرا ۱۹۶۹ء میں فارغ ہوا۔ اس تیسرے بیچ کے فارغین کے اسماء یہ ہیں ؛ محمد عمران فلاحی، شفیق عالم فلاحی، ظفر احمد فلاحی، انصار احمد فلاحی مرحوم، مطیع اللہ فلاحی، شفاعت احمد فلاحی مرحوم۔

فراغت کے بعد ناچیز کو استاذ محترم مرحوم و مغفور جناب مولانا شہباز صاحب جو اس وقت جامعۃ الفلاح کے صدر مدرس تھے کے حکم پر جامعہ کے شعبہ ثانوی میں خدمت کرنے کا موقع دیا گیا پھر دوسرے سال شعبہ عربی میں منتقل کردیا گیا تا حال اسی جامعہ میں شعبہ عربی میں خدمت کر رہا ہوں

اس وقت شعبہ اعلیٰ کے میرے وہ اساتذہ جو باحیات ہیں اور ان سے میں نے باقاعدہ تعلیم حاصل کی ہے۔ (۱) جناب مولانا عبدالحسیب اصلاحی صاحب (۲) جناب ڈاکٹر مولانا محمد عنایت اللہ سبحانی صاحب (۳) جناب مولانا عبدالعلیم اصلاحی صاحب مدظلہم العالی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو صحت دے اور تادیر ان کا سایہ باقی رکھے اور دیگر اساتذہ جو اللہ تعالیٰ کو پیارے ہوگئے ہیں ان کے حق میں اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہوں کہ وہ انہیں جنت الفردوس میں جگہ دے، ان کی غلطیوں اور کوتاہیوں سے عفو و درگذر سے کام لے۔ آمین

یہ چند سطریں اپنے مشفق استاذ منشی محبوب مرحوم و مغفور کے متعلق تحریر کردیا ہے تاکہ ہم بھی بچوں کو تعلیم دیتے وقت وہ طریقہ اپنائیں جو مرحوم اپنائے ہوئے تھے اور بچوں کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچائیں۔ اسی کے ساتھ اس کا بھی ذکر مختصراً کردیا ہے کہ یہ مکتب اسلامیہ جامعہ اسلامیہ سے گذرتے ہوئے جامعۃ الفلاح کیسے بنا اور کس طرح ایک تناور درخت کی شکل اختیار کر گیا۔ صحت و تندرستی رہی تو جامعۃ الفلاح کی مفصل تاریخ ان شاء اللہ ضرور آئے گی۔

اس موقع پر منشی جی کے لڑکے علی بیگ صاحب اور چھوٹے لڑکے شفیق احمد کا شکرگزار ہوں کہ انھوں نے مختصر مگر مفید معلومات اپنے والد مرحوم کے سلسلہ میں دیں اور ان کے پرپوتے جناب اظفر ریاض خاں فلاحی کا تو بہت ہی شکرگزار ہوں کہ انھوں نے بہت سی تفصیلی معلومات فراہم کی۔ اسی کے ساتھ جناب مولانا محمد سلامت اللہ اصلاحی صاحب کا بھی احسان مند ہوں کہ انھوں نے اس مضمون کی پروف ریڈنگ کی۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ان حضرات کو جزائے خیر سے نوازے اور جامعۃ الفلاح کو نظر بد سے بچائے اور اس کے جملہ متعلقین کو خلوص کے ساتھ کام کرنے کی توفیق دے۔ آمین

☆☆☆

قال رسول اللہ ﷺ: ”کفی بالمرء کذبا ان یحدث بکل ما سمع“

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: آدمی کے جھوٹے ہونے کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ ہر سنی سنائی بات نقل کرتا پھرے۔

ماسٹر محمد ایوب صاحبؒ

امیر فیصل فلاحی☆

جناب ماسٹر محمد ایوب صاحب کی ولادت ۱۹۳۷ء میں ضلع اعظم گڑھ کے بندی کلاں نامی گاؤں میں ہوئی تھی۔ آپ کے والد محترم کا نام جناب محمد یعقوب تھا۔ ۱۹/جنوری ۱۹۶۴ء میں شعبۂ ابتدائی میں ایک مدرس کی حیثیت سے آپ کی تقرری عمل میں آئی تھی اور ۹/مارچ ۱۹۹۳ء میں آپ ریٹائر ہوگئے تھے۔

آپ بہت سادہ مزاج تھے، طبیعت کے بہت اچھے تھے۔ نیک، صالح اور ملنسار تھے۔ ہر ایک سے خندہ پیشانی سے ملتے تھے، کبھی کسی سے تو تو میں میں اور تکرار نہیں کرتے تھے۔ اپنے کام سے کام رکھتے تھے، کسی کے چکر میں نہیں رہتے تھے۔ آپ جسمانی لحاظ سے بہت کمزور تھے لیکن ہمت اور جواں مردی آپ کے اندر بلا کی تھی۔ میں نے آپ کی ہمت کو ہمالہ سے بھی بلند پایا۔ جہاں تک آپ کی تدریس کا معاملہ ہے وہ بہت ہی محنت اور لگن کے ساتھ پڑھاتے تھے، بڑے ذوق وشوق کے ساتھ درس وتدریس کا کام کرتے تھے اور رخصت بہت کم لیتے تھے۔

آپ کو حساب سے خاص شغف تھا، حساب بہت محنت اور دلچسپی کے ساتھ پڑھاتے تھے، ہوم ورک روزانہ دیتے تھے اور چیک کرتے تھے۔ تختہ سیاہ کا استعمال کثرت سے کرتے تھے۔ سوال حل کرنے کے لیے بچوں کو تختہ سیاہ پر بلاتے تھے اور بار بار سمجھاتے تا کہ بچوں کی سمجھ میں آجائے۔ بچوں کو درس میں شامل کرنے کی بھرپور کوشش کرتے تھے۔ آپ کا معاملہ یک طرفہ نہیں رہتا تھا، کنٹرول کا یہ حال تھا کہ آپ کی عدم موجودگی میں بھی درجے میں کسی قسم کا شوروہنگامہ نہیں ہوتا تھا

آپ کو سفید رنگ بہت پسند تھا، آپ ہمیشہ سفید کپڑے زیب تن کرتے، اس کے علاوہ دوسرا رنگ آپ کو پسند نہیں تھا۔ میں نے آپ کو ہمیشہ سفید لباس ہی میں دیکھا آپ کے اندر ایک

☆استاذ نحو وصرف، جامعۃ الفلاح، اعظم گڑھ

خاص بات یہ تھی کہ آپ نیل کا استعمال بہت زیادہ کرتے تھے۔ اتنی زیادہ نیل ڈالتے کہ سفید کرتے پر نیل کا رنگ غالب آجاتا، سادگی کا یہ عالم تھا کہ کپڑے بغیر پریس کا استعمال کرتے اور اپنا کام خود سے کرتے۔

تدریس کے دوران ان کا قیام بلرگنج ہی میں رہا۔ جناب حاجی عبدالقدوس صاحب کے بیٹھک میں مقیم رہے۔ ان کے کھانے کا نظم گاؤں کے لوگوں نے کیا تھا، طلبہ کے ذریعے کھانا ان کے یہاں پہنچ جاتا تھا۔ کھانے کے تعلق سے کبھی ان کو شکایت نہیں رہی، جو مل جاتا خوشی خوشی کھا لیتے اور اللہ کا شکر ادا کرتے۔ آپ کو چائے کی بہت زیادہ چاہت رہتی تھی۔ چائے سے کبھی بھی انکار نہیں رہتا تھا۔ چائے سے ان کی دلچسپی کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ اسکول آتے جاتے ابوسفیان صاحب کے ہوٹل پر چائے ضرور پیتے تھے۔

آپ کی تدریسی خدمات تقریباً انتیس سال رہیں۔ آپ نے اس دوران پوری دلجمعی اور مستعدی کے ساتھ تدریسی کام کو انجام دیا۔ ۷/اگست ۲۰۰۶ء کو اس عالم فانی سے دار جاودانی کی طرف کوچ کر گئے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ تعلیم کے سلسلے میں آپ کی کاوشوں کو قبول فرمائے۔ آپ کی کوتاہیوں سے درگذر فرمائے اور جنت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین

☆☆☆

ایثار کی فضیلت

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ویؤثرون علی انفسهم ولو کان بهم خصاصة

خود پر دوسرے کو ترجیح دینا نیک نیتی سے ہونا چاہیے، اگر از خود بطیبِ خاطر اس کا صدور ہو تو یہ ایثار بہت عمدہ شمار کیا جائے گا اور اگر طبیعت پر جبر کر کے ہو تو وہ بھی ٹھیک ہے۔

ماسٹر حبیب احمد اور ماسٹر نظام الدین
میرے اولین اساتذہ

سعید اختر اعظمی ☆

اگر ایک سال کا منصوبہ بنا رہے ہو تو کاشت کرو، دس سال کا منصوبہ بنا رہے ہو تو شجر کاری کرو اور اگر سو سال کا منصوبہ بنا رہے ہو تو انسان سازی کرو۔'' استاد کے حوالے سے یہ چینی کہاوت ذہن کے پردے پہ کوندی اور دیر تک دل اس پر غور کرتا رہا۔ واقعتاً اس امر سے کسے انکار ہے کہ معلم انسان سازی کرتا ہے، وہ جرعۂ علم سے اپنے شاگردوں کی پیاس بجھاتا ہے۔ اگرچہ سیرابی کا یہ عمل زندگی کی آخری سانسوں تک مکمل نہیں ہوتا پھر بھی حتی المقدور استاد اپنی معلومات کا خزانہ شاگردوں میں منتقل کر دینا چاہتا ہے۔ تدریس بلاشبہ عہد حاضر میں پیشہ بن چکا ہے مگر اس سے بھی کہیں زیادہ فریضہ ہے ناخواندہ اور جہل کے اندھیروں میں گم نئی نسل کو مشعلِ علم دے کر منزل کی نشاندہی کرانا ہر صاحب علم کی ذمہ داری ہے۔ اسے پیشہ سمجھنے والا رسماً نمٹا کر فرصت پا لے گا جس سے شاگردوں کو آدھا ادھورا اور ناقص علم ملے گا۔ اس طرح انسان سازی کی عمارت کی پہلی اینٹ ہی ٹیڑھی ہو جائے گی ؎

خشت اول چوں نہد معمار کج   تا ثریا می رود دیوار کج

(جب معمار پہلی اینٹ ٹیڑھی رکھتا ہے تو دیوار آسمان تک ٹیڑھی ہو جاتی ہے۔)

تین دہائی قبل جب میں نے جامعۃ الفلاح میں درجہ اطفال میں داخلہ لیا تھا تو مجھے ماسٹر حبیب صاحب اور ماسٹر نظام الدین صاحب کی معیت ملی۔ درجہ بہ درجہ آگے بڑھتے ہوئے ابتدائی، ثانوی، حفظ، عالمیت وفضیلت کا مرحلہ بھی طے ہو گیا۔ ہر کلاس میں نئے مضامین، موضوعات کا تنوع، نئے اسباق اور نئی باتیں سیکھنے سکھانے کی ترغیب، مخصوص مضامین کے لیے مقررہ کتابوں کی ورق گردانی، انھیں ذہن نشین کرنا اور پھر امتحان تک کے لیے اسے دماغ میں فیڈ کر دینا۔ اگرچہ ایسا ہونا دشوار تھا

☆ ریاض سعودی عرب

پھر بھی اساتذہ کے تعاون اور ذاتی جدوجہد کی بنا پر یہ آسان ہو گیا۔ جامعۃ الفلاح سے جامعہ ملیہ اسلامیہ اور پھر دہلی یونیورسٹی کی فضاؤں سے ہم رشتگی راس آئی تو معلومات کے نئے دریچے وا ہوتے چلے گئے۔

ابتدائی سے لے کر تعلیم کے اختتام تک درجنوں اساتذہ کا فیضانِ نظر رہا مگر سچی بات تو یہ ہے کہ درجہ اطفال و اول کے اولین اساتذہ کا تدریسی نقش اب بھی تابندہ ہے۔ ذہن کے کورے کاغذ پہ حروف کی تصویر بٹھانے کا عمل اگرچہ مشقت آمیز رہا تاہم معلم و طالب علم دونوں کی مساعی رنگ لائی۔ ابتدا میں الفاظ سے نامانوسیت کی وجہ سے کبھی کبھی اکتاہٹ سی طاری ہو جاتی تھی مگر یہ اساتذہ برابر اس کوشش میں لگے رہے کہ ہر طالب علم جبراً ہی سہی خود کو حروف سے آشنا کروا لے۔ ان اساتذہ کی شفقتیں ہر طالب علم پر دورانِ کلاس یکساں رہتیں مگر جب لگاتار بے توجہی سامنے آتی تو مولانا بخش یعنی چھڑی کا استعمال ناگزیر ہو جاتا۔ یہ مولانا بخش کا خوف ہی تھا کہ ہوم ورک اور مطالعہ میں پابندی ہوئی اور کتابوں سے دلچسپی بڑھی جو آج تک قائم و دائم ہے۔

اس وقت تختی پر لکھنے کی روایت تھی جو غالباً آج تک برقرار ہے۔ سلیٹ نے اس کی جگہ لینے کی کوشش کی لیکن تختی والی بات بن ہی نہیں سکی۔ تختی پہ حروف کو خوش خط بنانے میں اگرچہ والد محترم فرید الدین فلاحی کا رول زیادہ ہے پھر بھی استادِ محترم ماسٹر نظام الدین صاحب کے ہاتھوں بنائے گئے سرکنڈوں کے قلم تزئینِ حروف میں زیادہ معاون ثابت ہوئے۔ ان کی خوش خطی کا سحر ذہن و دل پہ اب بھی طاری ہے۔

کلاسیز کے زینے عبور کرتے ہوئے وقت نے کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ دن، ہفتے، مہینے اور سال تبدیل ہوتے گئے۔ اساتذہ کے خدوخال پہ وقت کا اثر پڑتا رہا۔ ماسٹر حبیب صاحب کی عمر نے وفا نہ کی اور وہ جلد ہی مرحومین کی صف میں آ گئے۔ استاد محترم ماسٹر نظام الدین صاحب بقید حیات ہیں۔ آج بھی طالب علموں پر ان کی فیضانِ نظر ہے۔ ان کے شاگردوں کی تعداد بلا مبالغہ سینکڑوں میں ہے جو ان کا نام روشن کر رہے ہیں۔ میں جب بھی کوئی تحریر سپرد قلم کرتا ہوں ماسٹر نظام الدین صاحب اور ماسٹر حبیب مرحوم بے ساختہ یاد آتے ہیں۔ عین ممکن ہے کہ ان کی جگہ کوئی دوسرا استاد مجھے حروف سے آشنا کرواتا مگر یہ میری سعادت تھی کہ مجھے ان کی رفاقت میسر آئی۔ سچ تو یہ ہے کہ میری تحریروں میں جو رنگ آمیزی اور حسن ہے اس میں کہیں نہ کہیں ان اساتذہ کا ہاتھ ضرور ہے۔ خدائے رب العزت ماسٹر حبیب مرحوم کو جنت میں اعلیٰ مقام دے اور ماسٹر نظام الدین صاحب کو عمر دراز عطا فرمائے۔ ان کے فیض نظر کا سلسلہ جاری رہے۔ آمین ☆

ماسٹر ابراہیم صاحب

عبدالرحمٰن خالد فلاحی ☆

جناب ماسٹر ابراہیم صاحب بلریا گنج میں پیدا ہوئے۔ آپ کے آباء و اجداد خیر الدین پور سے آکر بلریا گنج میں آباد ہوگئے۔ آپ کا تعلق زمیندار گھرانے سے تھا۔ تعلیم و تعلم کے بعد زراعت پر توجہ رہتی۔ آپ کے دولڑکے آفتاب احمد اور عباد احمد ہیں۔ یہ لوگ بھی ابتدائی اور بنیادی تعلیم حاصل کرنے کے بعد تلاش معاش اور زراعت سے وابستہ ہوگئے۔ عباد احمد صاحب جامعۃ الفلاح میں بحیثیت کارکن خدمات انجام دیتے رہے۔ اپنی درازی عمر کے باعث جامعہ سے سبکدوش ہوگئے۔

ماسٹر صاحب نے بلریا گنج میڈل اسکول سے تعلیم حاصل کی تھی۔ آپ کا شمار اچھے اور سنجیدہ طلبہ میں ہوتا تھا۔

آپ کا قد چھوٹا، رنگ گندمی، خاموش طبع، وضع قطع اسلامی، کرتا پاجامہ اور بلیا ٹوپی لیکن ساتھ میں کندھے پر گمچھا ضرور ہوتا تھا۔ کسی کا نہ شکوہ کسی کی نہ شکایت حالات وضروریات کے مطابق اپنے کو سیٹ کرلینا سب کی صفت نہیں، یہ ان کی خاص صفت تھی۔ جامعہ کی ابتداء مکتب سے ہوئی، گاؤں میں انھیں کا خاندان اس کی رہنمائی کررہا تھا جو آگے چل کر جامعہ اسلامیہ کے نام سے مدرسہ میں تبدیل ہوگیا۔ آپ کا نام ۱۹۶۳/۹/۵ء کی مجلس شوریٰ جامعہ اسلامیہ کے رکن کی حیثیت سے ملتا ہے اور ۱۹۶۳ء میں جب جامعہ اسلامیہ جامعۃ الفلاح ہوگیا تو ۱۹۶۴ء میں آپ کو اس کا دائمی ممبر تسلیم کرلیا گیا، اس دوران آپ قائم مقام ناظم بھی رہے۔ ۲۶/اپریل ۱۹۸۰ء کو معتمد مال کی ذمہ داری بھی سونپ دی گئی۔ اس طرح ماسٹر صاحب کا تعلق از ابتداء تا ممات جامعۃ الفلاح کے ساتھ رہا اور آپ حتی المقدور اس کی انتظامی خدمات کرتے رہے۔

بچوں کی تعلیم و تربیت و خفتہ شعور کو بیدار کرنے کے لیے ماہرین تعلیم نے مختلف نظریات پیش کیے ہیں ان کے مکاتب فکر پر کتنے بچوں کے اسکول چل رہے ہیں بلکہ اب یہ ایک تجارت بن چکا ہے جس سے بے بہا آمدنی ہے، لیکن جامعہ نے کچھ ایسے اساتذہ کا انتخاب کیا جو ان کے خفتہ شعور

☆ معاون لائبریرین، جامعۃ الفلاح، اعظم گڑھ

کو جذبات و احساس کا خیال رکھتے ہوئے بیدار کرنے کی کوشش کریں اور ان کے تحت الشعور کا علم بام عروج تک پہنچ جائے۔ وہ بچوں کی نفسیات سے واقف نرم خو اور نرم طبع ہوں۔ انھیں اساتذہ میں ماسٹر مرحوم کا نام بھی لیا جا سکتا ہے۔

خود اپنی آنکھوں دیکھا، جیسے شہد کے چھتے پر شہد کی مکھیاں چمٹی ہوں اسی طرح طلبہ بے خوف و خطر دادا کہتے ان سے چمٹے ہوئے ہیں، آپ ہیں کہ پان کی چگالی کیے جارہے ہیں، تختیاں دیکھے جارہے ہیں، اس میں بھی مسابقت کا جذبہ نظر آرہا تھا۔

میرا ماسٹر صاحب سے تعلق درجہ چہارم سے ہوا۔ ان کے حسن اخلاق سے بچے مرعوب تھے۔ میاں میاں کہہ کر پکارتے، بے تکلف گھر کا کام دکھاتے، اگر گھر نقل نہیں لکھ لائے تو فوراً تین چار سطر لکھ کر پیش کردیتے۔ سبق کو دلچسپ بنا کر پیش کرتے۔ وقت کے پابند تھے، کبھی ناغہ نہ کرتے۔ طلبہ کے غیر حاضری پر اس طرح ٹوکتے کہ دوبارہ غیر حاضری کی کوشش نہ کرے۔ ہمت افزائی کرتے حوصلہ شکنی نہ کرتے۔

کلاس کی صفائی خود اپنے ہاتھوں کرتے اور باری کے لحاظ سے حوصلہ افزائی کرتے، طلبہ کی شرارت تو گوارا تھی پر بدتمیزی پر غصہ قابو سے باہر ہو جاتا۔ ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ ایک طالب علم ترانہ کے دوران، اپنے آگے کے بچے کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اچھلنے لگا۔ ماسٹر صاحب نے دیکھ لیا ان سے نہ رہا گیا، ترانہ سے بلا کر اس کا کان پکڑ کر پٹخ دیا۔ وہ اٹھ کر بھاگ چلا، کلاس میں پہنچ کر پٹائی بھی کی۔

کسی ادارے یا مدرسہ کی مالیات بنیادی کڑی ہے۔ اس میں مختلف قسم کے مسلکی، عقائدی، گروہی حدود و قیود لگے رہتے ہیں۔ جس کی وجہ سے مالیات کی فراہمی بہت مشکل ہو جاتی ہے، لیکن مرحوم نے ۱۹۸۰/۴/۲۶ء کو مالیات کا ذمہ دار بنا دیا گیا، آپ نے مالیات پر اچھا کنٹرول کر رکھا تھا۔ بلریا گنج قصبہ سے چٹکی وصول کی جاتی تھی اور عفان شاہ مرحوم اس کے لیے خاص تھے۔ عشر گندم اور دھان کی وصولی سفراء اور اساتذہ کے تعاون سے قرب و جوار کے تمام گاؤں سے ہو جاتی تھی۔ جبکہ سفراء پورے سال چندہ میں لگے رہتے تھے۔ اس زمانہ میں اسحاق تھوکی کا نام معروف تھا جو خصوصی توجہ رکھتے تھے انھیں کے تعاون سے باہری چندے مل جاتے تھے۔ اس طرح رمضان میں اساتذہ کرام سے بھی تعاون لیتے تھے۔

بحیثیت محاسب حساب پر گہری نظر رکھتے تھے۔ بے جا اسراف پر نظر رکھتے تھے۔

درمیان میں جامعہ پر ایک ایسا بھی وقت آیا کہ تمام ذمہ داران جامعہ کے خوف سے اپنے کو ذمہ داریوں سے الگ کرنا چاہتے تھے تو ماسٹر مرحوم نے ایسے وقت میں قائم مقام ناظم کی بھی خدمات انجام دیں۔

جب آپ کے اندر پڑھانے کی طاقت نہ رہی تو ذمہ داران جامعہ نے اس وقت بھی آپ کو چھوڑنا گوارا نہ کیا۔ ۱۹۸۱/۹/۳۱ء میں آپ کو کلیۃ البنات میں معلمات کا نگراں اور سرپرست کی حیثیت سے متعین کر دیا لیکن جب درازی عمر اس میں بھی مانع ہوئی اور سماعت و بینائی جاتی رہی تو کنارہ کشی اختیار کر لی۔ ۲۷/دسمبر ۲۰۰۵ء کو اس دار فانی سے دار جاوِدانی کی طرف کوچ کر گئے۔

☆☆☆

حضرت عمرؓ کا انصاف

مصر کا ایک باشندہ آپؓ کے پاس عمرو بن العاص کے بیٹے کی شکایت لے کر آیا۔ عمروؓ بن العاص اس وقت مصر کے گورنر تھے۔ اس نے کہا: اے امیر المومنین! میں ظلم سے آپ کی پناہ چاہتا ہوں۔ آپ نے فرمایا: تو نے اچھی پناہ گاہ ڈھونڈھی۔ اس نے کہا میں نے عمروؓ بن العاص کے بیٹے سے دوڑ میں مقابلہ کیا اور میں اس سے آگے نکل گیا، اس پر وہ مجھے کوڑے سے مارنے لگا اور کہا میں معزز شخص کا بیٹا ہوں (یہ سن کر) عمرؓ نے عمروؓ بن العاص کے پاس خط لکھا اور انہیں اپنے بیٹے کے ساتھ حاضر ہونے کا حکم دیا۔ عمرو بن العاصؓ آئے تو عمرؓ نے کہا مصری کہاں ہے؟ کوڑا لو اور مارو، وہ اسے مارنے لگا اور عمرؓ کہتے تھے ''معزز فرد کے بیٹے کو مار، انسؒ کا بیان ہے کہ اس نے مارا۔ اللہ کی قسم اس نے اس کو خوب مارا اور ہم چاہتے تھے کہ وہ مارا جائے۔ اس نے مارنا بند نہیں کیا یہاں تک کہ ہم چاہنے لگے کہ اب نہ مارا جائے۔ پھر عمرؓ نے مصری سے کہا: عمرو بن العاص کے سر پر مارو، اس نے کہا: اے امیر المومنین! ان کے لڑکے نے مجھے مارا تھا اور میں نے اس سے بدلہ لے لیا تو عمرؓ نے عمرو بن العاص سے کہا تم نے کب سے لوگوں کو غلام بنا رکھا ہے، حالانکہ ان کی ماؤں نے انہیں آزاد پیدا کیا تھا؟ عمرو بن العاصؓ نے فرمایا: اے امیر المومنین نہ میں نے اس واقعہ کو جانا اور نہ وہ مصری میرے پاس آیا۔ (عمر بن خطابؓ- شخصیت اور کارنامے)

عبدالباری فلاحی

مولانا محمد اسماعیل فلاحی☆

عبدالباری فلاحی بلریا گنج کے رہنے والے تھے۔ آپ جامعہ سے فراغت کے بعد شعبۂ ابتدائی میں تدریسی فرائض انجام دینے لگے اور چند ہی ماہ بعد اچانک پیٹ میں درد شروع ہوا اور اس نے کافی شدت اختیار کر لی۔ بیہوش ہوئے اور پھر بات نہ کر سکے۔ عجیب تکلیف، کرب اور بے چینی میں کروٹ بدلتے، گھر والوں کے پوچھنے پر کہ تکلیف بتاؤ سوائے اللہ اللہ کے زبان سے کچھ نہیں نکلا اور بالآخر اسی حالت میں ۱۵/اکتوبر ۱۹۹۰ء کو انتقال کر گئے۔

جوانوں میں جو بانکپن، شوخی اور چلبلاپن ہوتا ہے، موصوف اس سے بہت دور رہتے تھے۔ ان کے ساتھیوں، استادوں، رشتہ داروں اور پاس پڑوس والوں کو ان سے کبھی شکایت نہیں ہوئی۔ خود یہ نہ کسی کی شکایت کرتے تھے اور نہ کسی کی شکایت سنتے تھے۔ سادہ طبیعت، صفائی پسند اور ایثار سے کام لینے والے تھے۔ اپنی طاقت سے بڑھ کر کام کرتے اور ساتھیوں کے کام آتے۔

مولانا صغیر احسن اصلاحی مرحوم نے موصوف کے بارے میں فرمایا تھا کہ مجھے اس صالح ذہین فلاحی کے استاذ ہونے کا شرف حاصل ہے۔ اس کی صالحیت و سادگی اور متعدد خوبیوں کی بنا پر میں نے اسے اپنے گھر میں رشتہ کرنے کے لیے منتخب کیا تھا اسے میں اور عزیز بنانا چاہتا تھا، یہ اور بات ہے کہ کچھ وقتی اسباب کی بنا پر میں اس میں کامیاب نہیں ہوا۔

☆☆☆

☆استاذ تفسیر جامعۃ الفلاح، اعظم گڑھ

مولانا نورالدین صاحب

حافظ ریاض احمد فلاحی☆

مولانا نورالدین صاحب اصلاحی مئوضلع کے ڈھلئی گاؤں کے ایک شریف گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔۱۹۶۷ء میں جامعۃ الفلاح کے شعبۂ ابتدائی میں تقرر ہوا۔جسمانی لحاظ سے بڑے تندرست اور وجیہہ تھے۔مزاجاً بہت سخت تھے، بچوں پر بڑا رعب رہتا تھا۔تعلیم کے سلسلے میں بڑے مخلص تھے۔بڑی محنت سے پڑھاتے تھے۔گاؤں کے بچوں کو رات میں بھی بلا کر باقاعدہ اپنی نگرانی میں پڑھاتے تھے۔بعد میں بمبئی طبیہ کالج انجمن خیرالاسلام میں بحیثیت عربی استادان کا تقرر ہوگیا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد اپنا زیادہ وقت مطالعہ میں گذارتے۔اسی سال رمضان سے پہلے مختصر علالت کے بعد اپنے مالک حقیقی سے جاملے۔انا للہ وانا الیہ راجعون

ماسٹر ضیاءاللہ صاحب مرحوم

ادارہ☆

آپ کا تقرر ۱۹۶۴ء میں شعبۂ ثانوی میں بحیثیت استاذ ہوا۔ہندی خاص مضمون تھا۔بڑی محنت سے پڑھاتے، اپنے مضمون میں پوری طرح تیار رہتے تھے۔بڑے خوش پوش تھے، مزاجاً بہت نرم تھے۔کچھ دنوں کے بعد ان کا کہیں سرکاری اسکول میں تقرر ہوگیا اور چلے گئے۔اپنے کو کوثر یزدانی صاحب کا بھائی بتاتے تھے۔

☆☆☆

☆استاذ شعبۂ ثانوی جامعۃ الفلاح، اعظم گڑھ

وہ دل کہاں سے لاؤں تری یاد جو بھلادے

مولوی عبداللطیف مفتاحیؒ

معین الدین فلاحی☆

مولوی عبداللطیف صاحب نومبر ۱۹۴۷ء میں شہر مئو کے ایک محلّہ حدّ ادپور میں پیدا ہوئے آپ کے والد کا نام عبدالعلی تھا۔آپ نے مفتاح العلوم مئو سے تعلیم حاصل کی اور اپنے آبائی پیشہ بنائی سے منسلک ہوگئے۔ بہت دنوں تک یہی ذریعہ معاش رہا اور زندگی خوش گوار انداز میں گذرتی رہی۔ آپ نے اپنے بچوں کو بھی زیور تعلیم سے آراستہ کیا اور اپنے پیشے سے انھیں بھی منسلک کیا۔معاشی اعتبار سے خوش حال رہے۔

جامعۃ الفلاح کے سفراء رمضان کے مہینے میں ہندوستان کے مختلف شہروں میں جاتے ہیں مئو میں محترم مولانا محمد عمران فلاحی صاحب تشریف لے جاتے تھے۔مولانا عبداللطیف صاحب سے ان کے تعلقات ہوگئے۔مولانا مرحوم خود بھی فلاح کی اعانت کرتے اور دوسروں کو بھی اعانت کے لیے ابھارتے رہتے تھے۔ جامعہ میں فارسی کے استاذ کی ضرورت تھی۔ چنانچہ مولانا نے آپ سے فارسی کے لیے بات کی اور ناظم جامعہ ڈاکٹر خلیل احمد صاحب کو بھی اطلاع دی کہ مولانا فارسی کی وافر معلومات رکھتے ہیں۔ثانوی کے لیے بہتر رہیں گے۔ چنانچہ آپ بلوائے گئے۔انٹرویو کے بعد آپ کی تقرری ۱۰/جولائی ۱۹۹۲ء کو جامعۃ الفلاح کے شعبۂ ثانوی میں ہوئی لیکن پھر کسی وجہ سے انھیں شعبۂ ابتدائی میں درس و تدریس کے لیے مستقل طور پر رکھ لیا گیا۔آپ نے تقریباً چودہ پندرہ سال جامعہ میں تدریسی خدمات انجام دیں۔

آپ بہت نیک سیرت اور خداترس آدمی تھے۔ ہر ایک سے خوش طبعی کے ساتھ ملتے۔ اپنے طلبہ شاگردوں کی تحریر کے تعلق سے بہت فکر مند رہتے۔آپ مستقل طلبہ کے لیے سرکنڈے کا قلم

☆استاذ نحو وانشاء، جامعۃ الفلاح، اعظم گڑھ

بناتے اور ایک چاقو رکھتے۔ آپ کو نفاست سے خاص لگاؤ تھا۔ ہمیشہ خوشبو کا استعمال کرتے اور ساتھیوں کو بھی بطور ہدیہ پیش کرتے۔ دوستوں کی خواہشات کا احترام کرتے۔ دعوتیں دیتے۔ مئو کا ایک خاص پکوان انگشتی ہے۔ یہاں کے اساتذہ نے آپ سے ذکر کیا کہ ہم لوگ آپ کے یہاں انگشتی کھانا چاہتے ہیں، چنانچہ آپ فوراً تیار ہو گئے۔ دن معین کیا اور یہاں سے ایک وفد ارمدہ گاڑی میں سوار ہو کر مولانا محبوب عالم صاحب کی قیادت میں ان کے یہاں پہنچا۔ آپ نے بڑی پر تکلف انگشتی کھلائی۔ وہاں کی خاص اور مشہور عمارتوں کی زیارت کرائے۔ جس میں ایک پرانا قلعہ اور مفتاح العلوم وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

مولانا کو مطالعے کا بہت شوق تھا، ہمیشہ کوئی نہ کوئی کتاب مطالعے میں رکھتے۔ مسلکاً حنفی تھے، اس وجہ سے حنفی مسلک کی کتابوں کا مطالعہ زیادہ کرتے۔ آپ آخری عمر میں بیمار ہوئے۔ جامعہ سے رخصت لی۔ دوا علاج کے بعد افاقہ ہوا تو جامعہ آنے کی تیاری کرنے لگے۔ کہہ رہے تھے کہ صحت اب ٹھیک ہے۔ جامعہ جانا چاہتا ہوں مگر گھر کے لوگ تیار نہیں تھے۔ وہ چاہتے تھے کچھ دن اور آرام کرلیں۔ آپ اسی دوران کوئی کتاب اپنے ہاتھ میں لیے لیٹے لیٹے پڑھ رہے تھے کہ اچانک کتاب ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر گئی۔ گھر کے لوگ آپ کے پاس آئے تو دیکھا کہ آپ کی روح پرواز کر چکی ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

☆☆☆

پشیمانی سے بچو

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اگر کوئی فاسق تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو تحقیق کرلیا کرو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تم کسی گروہ کو نادانستہ نقصان پہنچا بیٹھو اور پھر اپنے کئے پر پشیمان ہو۔ (القرآن)

کچھ یادیں کچھ باتیں

محترمہ مشفقہ وقار صاحبہ

ساجدہ فلاحی☆

گولڈن جوبلی کے اس پرمسرت موقع پر وہ ہستیاں بھی ہمارے دل و دماغ کو رنج و اضطراب میں مبتلا کررہی ہیں جن کے سانحۂ وفات کی روح فرسا خبریں ہمارے لیے بڑی ہی اندوہناک ثابت ہوئیں لیکن مشیت ایزدی کے سامنے سرخم کرنے کے سوا انسان کے لیے کوئی سبیل نہیں ہے اور آیت کریمہ ''کل نفس ذائقۃ الموت'' [آل عمران: ۱۸۵] اس حقیقت کو ثابت کررہی ہے کہ کوئی شے بشمول انسان لافانی نہیں ہے، ہر نفس کو موت کی منزل سے گزر کر بالآخر اپنے رب حقیقی سے ملنا ہے اور باقی رہنے والی ذات صرف رب ذوالجلال والاکرام کی ایک ذات ہے جیسا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے ''کل من علیھا فان ویبقی وجہ ربک ذوالجلال والاکرام'' [الرحمٰن: ۲۶-۲۷] تاہم اس کرہ ارض پر کچھ ایسے افراد بھی بستے ہیں جن کی یادیں اور جن کی باتیں نہ صرف ذہن و دماغ، رگ و پے میں بلکہ درودیوار میں بھی سرایت کرجاتی ہیں ان ہی میں سے ایک کلیۃ البنات جامعۃ الفلاح کی عربی معلّمہ ہماری مشفق اور معزز استاد سیدہ مشفقہ وقار صاحبہ کی ذات بھی ہے۔

مقام پیدائش

آپ ۱۵/اکتوبر ۱۹۵۲ء کو ملک تحصیل ضلع رامپور یوپی میں پیدا ہوئیں۔

تعلیم

ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی جس کے بعد جامعۃ الصالحات رامپور میں برائے حصول علم دین داخلہ لیا اور ۱۹۷۶ء میں عالمیت اور ۱۹۷۸ء میں فضیلت کی سند حاصل کی۔ اسی دوران ۱۹۷۶ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے آپ نے پرائیوٹ ہائی اسکول اور ۱۹۷۷ء میں رانی کنیا بالیکا وشو ودیالیہ

☆ معاون مہتمم کلیۃ البنات، جامعۃ الفلاح، اعظم گڑھ

رامپور سے انٹرمیڈیٹ پاس کیا۔اس کے بعد اگرچہ آپ درس وتدریس میں مصروف ہوگئیں تاہم تعلیمی سلسلہ جاری رکھتے ہوئے ۱۹۷۹ء میں روہیل کھنڈ یونیورسٹی بریلی سے اردو فارسی آرٹ سے بی اے اور ۱۹۸۲ء میں شبلی نیشنل کالج پوروانچل یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے کر کے پوسٹ گریجویٹ کی ڈگری حاصل کی۔

تدریسی خدمات

الحمدللہ ۱۹۷۸ء میں جامعۃ الفلاح کے شعبۂ نسواں میں طالبات کی اعلیٰ تعلیم کا آغاز ہوا، لائق مبارکباد ہیں وہ لوگ جنھوں نے لڑکیوں کے لیے دینی تعلیم کی ضرورت محسوس کی اور اس کی داغ بیل ڈالی۔ یہ وہ روشن سال ہے جو جامعۃ الفلاح کی تاریخ میں سنہرے حرفوں میں لکھا جائے گا، خوش قسمتی سے ہم چند طالبات کو بحیثیت متعلمات اس کے سال اول میں داخلے کی سعادت حاصل ہوئی۔ ابتدا میں عربی معلمات نایاب ہونے کی بنا پر معلمین کرام کی خدمات حاصل کی گئیں، تلاش بسیار کے بعد عربی معلّمہ محترمہ مشفقہ وقار صاحبہ مرحومہ کی خدمات جامعہ کو حاصل ہوسکیں۔ اس طرح باجی مرحومہ کو ادارہ کی پہلی عربی معلّمہ ہونے کا بھی شرف حاصل ہوا۔ کلیۃ البنات کے لیے آپ کی تدریسی خدمات بفضل اللہ کم وبیش ۳۲ سالوں پر محیط ہے اور آپ کی شاگردوں کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے۔

دورِ صدارت

اپنے تدریسی فرائض کی ادائیگی کے دوران محترمہ نکہت باجی صاحبہ کے تدریس وصدارت سے مستعفی ہوجانے کے بعد آپ کی انتظامی صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے مجلس عاملہ نے آپ کو کلیہ کے شعبہ جات کی صدر منتخب کیا۔ چنانچہ آپ ۱۹۸۳ء سے ۱۹۹۲ء تک صدارت کے منصب پر فائز رہیں۔ آپ نظم وڈسپلن کی پابند تھیں حتی الامکان کلیہ کی فلاح و بہبود اور تعمیر وترقی کے لیے کوشاں رہیں اور الحمدللہ آپ ہر مقام پر ایک ذمہ دار کامیاب انسان کی طرح اپنے فرائض کی انجام دہی میں مصروف رہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کی ان خدمات کو شرف قبولیت عطا فرمائے۔ آمین

اوصاف حمیدہ

جب ہم آپ کی شخصیت کا جائزہ لیتے ہیں تو آپ وہاں بھی ہمیں گوناگوں صفات سے متصف نظر آتی ہیں۔ آپ اعلیٰ اخلاق وکردار کی حامل تھیں۔ ہمدردی وخیرخواہی، شفقت ومحبت، دلداری وغم گساری کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ صبر وتحمل اور صالحیت میں اپنی مثال آپ تھیں۔ آپ کی ان صفات کا مظاہرہ ومشاہدہ ہمہ وقت ہوتا رہتا جس کے عمدہ اثرات ہم طالبات پر بھی

مرتب ہوئے۔ آپ کا اپنی طالبات سے رشتہ صرف تعلیم وتعلم تک ہی محدود نہیں تھا بلکہ فی الحقیقت آپ ان کی مربیہ اور بہی خواہ بھی تھیں۔ ہم آپ کو مثل ماں جیسی عظیم المرتبت ہستی تصور کرتے اور انتہائی قدر وعظمت کی نگاہ سے دیکھتے اور خود باجی مرحومہ بھی ہمیں مثل بیٹیاں تسلیم کرتیں۔ اب امید ہے ہمارے دل کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی دعائیں ہی ان کے لیے توشۂ آخرت ثابت ہوں گی۔
ان شاء اللہ العزیز

اندرون خانہ

جب ہم مرحومہ کی گھریلو زندگی کا جائزہ لیتے ہیں تو اس میں بھی آپ بے مثال نظر آتی ہیں، گھر انتہائی سادگی کے ساتھ صفائی وسجاوٹ کا اعلیٰ نمونہ، جملہ نظم وانصرام حسن سلیقہ کی عکاسی کرتا ہوا۔ گھر کی ہر شے کفایت شعاری، ہنرمندی کی غمازی کرتی ہوئی نظر آتی۔ دنیا سے بے رغبتی کا یہ عالم کہ ساری عمر کرائے کے مکان میں پورے اطمینان وسکون کے ساتھ گذار دی اور کبھی حرف شکایت زبان پر نہ لائیں۔ آپ کی زندگی حدیث مبارک ''کن فی الدنیا کأنک غریب او عابر سبیل'' کے مصداق نظر آتی۔ ہماری مشفقہ (اسم بامسمیٰ) استاد کا یہ کردار گویا کہ ان کے اس احساس کا مظہر تھا کہ یہ دنیا اور اس کی چمک دمک محض ایک جلوہ سراب ہے اور اس کے پیچھے پڑ کر آخرت کو گنوا بیٹھنا گویا اپنی شامت کو دعوت دینا ہے، اپنے شوہر کی بھی انتہائی وفادار، فرماں بردار اور خدمت گزار ثابت ہوئیں جن کی عمر کے آخری ایام شدید بیماری ومعذوری کی حالت میں گزرے لیکن آپ ہمہ وقت باوجود اپنی علالت کے ان کی خدمت کے لیے کمربستہ رہیں اور حق زوجیت ادا کردیا۔ وہ خود بھی مرحومہ سے بے حد محبت رکھتے اور ان کا احترام کرتے تھے۔ زوجین کی حق رفاقت کی ادئیگی شاید کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں مقبول ومحبوب ہوئی کہ مرحوم کے سفر آخرت کی روانگی کو ایک عشرہ ہی گزرا تھا کہ آپ نے بھی رخت سفر باندھ لیا۔ اللہ نے آپ کو ایک عدد اولاد سے نوازا تھا جس کی تعلیم وتربیت میں اپنے تئیں کوئی کسر نہ چھوڑی اور بہت ہی سادگی کے ساتھ اسے رشتہ ازدواج میں منسلک کر کے الحمدللہ اپنے فریضہ سے سبکدوش ہوئیں۔

اصلاح معاشرہ

اصلاح معاشرہ سے آپ کو خصوصی دلچسپی تھی، اجتماعی وانفرادی دونوں ہی طرح فرد کی اصلاح کی کوشش کرتیں اور اس طرح کے کسی موقع کو ضائع نہیں ہونے دیتیں۔ بلریاگنج کی خواتین کے اجتماع میں پابندی سے شرکت کرتیں، جہاں درس قرآن اور قیمتی کلمات سے خواتین کو مستفید

کرتیں، طالبات کے اہم پروگراموں میں بھی لازماً شریک ہوتیں اور انہیں اپنے پندونصائح سے نوازتیں۔ لوگوں کے مسائل سے دلچسپی رکھنا، ان کا حل تلاش کرنے کی کوشش کرنا اور مخلصانہ اور ہمدردانہ مشورے دینا ان کی فطرت سلیمہ کا اہم عنصر تھا۔ آپ کی جملہ طالبات، پڑوسی و متعلقین آپ کے حسن سلوک، ہمدردی اور نصح وخیرخواہی کی شاہد ہیں۔ توقع ہے ان سب کی گواہی اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں استاذ محترم کے حق میں لکھ لی جائے گی۔

علمی خدمات

پڑھنے لکھنے سے گہرا شغف تھا، ہمہ وقت مصروف مطالعہ رہتیں اور دوسروں کو بھی اسی کی تلقین کرتیں۔ اپنے اوقات ایک لمحہ ضائع کیے بغیر دنیا و مافیھا سے بے نیاز کتابوں سے محوگفتگو رہتیں خالی پیریڈ میں لائبریری آپ کا مسکن ہوتی۔ جہاں تصنیف وتالیف کے کام میں مصروف نظر آتیں۔

پڑھنے لکھنے کا ذوق آپ کو وراثتاً ملا تھا، والد کی تربیت کا بھی کافی دخل تھا، شعروشاعری سے خصوصی دلچسپی تھی۔ صنف غزل میں بھی کچھ طبع آزمائی کی ہے جو غالباً ابھی غیر مطبوعہ ہے۔ البتہ آپ کا مجموعہ کلام ''ندائے سحر'' کے نام سے آپ کی وفات سے ایک سال قبل ۲۰۰۹ء میں شائع ہو چکا ہے۔

آپ ہمیں ادب کے میدان میں بھی نمایاں نظر آتی ہیں آپ کا ایک ناول 'ٹارزن' کے عنوان سے 'اچھا ساتھی' میں قسط وار شائع ہوا تھا نیز 'گمشدہ ساحل' کے عنوان سے ایک ضخیم ناول حجاب کے صفحات کی زینت بن چکا ہے جو آپ کے بیٹے آفتاب عالم نجمی کے نام سے شائع ہوتا رہا ہے۔ کچھ تالیفات غیر مطبوعہ شکل میں آپ کے بیٹے کے پاس محفوظ ہیں۔

وفات

محترمہ مشفقہ باجی مرحومہ جو کہ ہر دلعزیز تھیں رب ذوالجلال والاکرام کو بہت جلد پیاری ہوگئیں یوں تو آپ عرصہ سے مرض کے شکنجہ میں تھیں اور وقتاً فوقتاً مرض میں شدت آجایا کرتی تھی لیکن ۲۵رفروری ۲۰۱۰ء بروز جمعرات آپ کی طبیعت اچانک زیادہ بگڑ گئی جسے دیکھ کر آپ سے متعلق ہر فرد پر مایوسی اور سکتہ کی کیفیت طاری ہوگئی۔ معلمات ومتعلقات آپ کے اردگرد دعا وتسبیح میں مصروف ہوگئیں اور رات اضطراب و بے چینی وغنودگی کے عالم میں تمام ہوئی۔ ۲۶رفروری بروز جمعہ مؤذن کی اذان کے ساتھ ہی داعی اجل کو لبیک کہا اور اپنے رب حقیقی سے جاملیں۔ کل ۵۸ سال کی عمر پائی۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

وما کان لنفس أن تموت الا باذن الله کتابامؤجلا [آل عمران:۱۴۵]

کوئی ذی روح اللہ کے اذن کے بغیر نہیں مرسکتا، موت کا تو وقت مقرر ہے۔

آیت کریمہ میں مذکور بنیادی عقیدہ یہی ہے جو ہر مومن کو آہ وفغاں سے محفوظ اور مشکل سے مشکل ترین لمحات میں ثابت قدمی عطا کرتا ہے۔ اللہ بزرگ و برتر کا شکر واحسان ہے کہ اس نے ایک اعلیٰ کردار کی مالک مومنہ وصالحہ کے فیض سے ہم کو فیضیاب ہونے کا موقع عنایت فرمایا۔ اللہ تعالیٰ مرحومہ کی خطاؤں اور لغزشوں کو معاف فرمائے اور مقام علیین میں جگہ دے اور ہماری دعاؤں کو مرحومہ کے لیے بلندی درجات کا ذریعہ بنائے۔ آمین

☆☆☆

ذکر: معنی و مفہوم

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: واذکر ربک اذا نسیتہ

یعنی ذکر میں محویت کا عالم یہ ہو کہ ذکر کے دوران سب کچھ فراموش کردیا جائے، نہ اپنا کچھ یاد رہے نہ غیر کا حتی کہ ذکر کے دوران ذکر کا بھی دھیان نہ آئے، پھر ہر ذاکر کا اللہ ذکر کرتا ہے تو اللہ کے ذکر کو سننے میں ایسا استغراق ہو کہ اس کے علاوہ ہر ذکر نسیاً منسیاً ہو جائے۔ اس کے تین درجات ہیں: پہلا درجہ ذکر کا حمد وثنا اور دعا ہے، یہ ذکر ظاہری ہے۔ دوسرا درجہ ذکر خفی کا ہے، اس کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے مشاہدہ اور اس سے گفتگو میں محور ہے اور کبھی اس میں تکان اور کمزوری نہ آئے۔ تیسرا درجہ ذکر حقیقی کا ہے، وہ یہ ہے کہ اللہ اپنا ذکر کرنے والوں کا جو ذکر کرتا ہے ذاکر اپنے ذکر کو نسیاً منسیاً کر کے صرف اللہ کے ذکر پر اپنے خیال وفکر کو اس طرح جمادے کہ گویا وہ اپنے کانوں سے اس کو سن رہا ہے اور آنکھوں سے اس کا مشاہدہ کر رہا ہے۔

آرزوئیں آج بھی یوں ڈھونڈتی......

نصرت رضی فلاحی، جیراجپوری☆

مشفقہ باجی پہ ہو اللہ کی رحمت نثار
زندگی ان کی تھی عرفانِ شریعت کی بہار

آپ کے دم سے ملی ہم کو نئی اک روشنی
بے نگاہی کو ملی اک معتبر دیدہ وری

آپ نے بخشا ہمیں دانشوری کا اعتبار
آپ پر سو جان سے صدقے ہو جنت کی بہار

آپ کی تحریر ہے نقشِ وفا کا پیرہن
آپ کی تقریر حسنِ آگہی کا بانکپن

آپ کی تحریر میں ہے رہنمائی آج بھی
دست کاری کے نمونے خوش نما ہیں آج بھی

یاں در و دیوار پر رقصاں تیری پرچھائیاں
ذہن و دل میں گونجتی ہیں یادوں کی شہنائیاں

سادگی سنجیدگی کا ہے مرصّع تیری ذات
کس سلیقہ سے سنواری آپ نے ہم سب کی ذات

آرزوئیں آج بھی یوں ڈھونڈتی ہیں آپ کو
جیسے ہم پھر کلیہ میں دیکھ لیں گی آپ کو

لائبریرین کلیۃ البنات، جامعۃ الفلاح، اعظم گڑھ

کیسے بھولیں آپ کو کہ بھولنا ممکن نہیں
مل نہ پائے آپ سا شاید کوئی محسن نہیں

بحرِ علم و فن کو وسعت اور گہرائی ملی
آپ کی صحبت میں فہم و فکر و دانائی ملی

آپ کی یادوں کا یونہی لہلہائے گا چمن
آپ پر ہو رحمتِ مولیٰ سدا سایہ فگن

الوداع اے مشفقہ باجی دعا نصرتؔ کی ہے
آج بھی ہم کو ضرورت آپ کی شفقت کی ہے

☆☆☆

قاضی ابویوسفؒ کا ایک سنہرا فیصلہ

فضل بن ربیع امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد قاضی ابویوسفؒ کے پاس مشہور عباسی بادشاہ ہارون رشید کی طرف سے بہ حیثیتِ گواہ حاضر ہوا، لیکن قاضی صاحب نے اس کی گواہی رد کر دی اور قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

ہارون رشید نے پوچھا: فضل کی گواہی کو آپ نے کیوں قبول نہیں کیا؟

قاضی ابویوسف: میں نے اسے ایک دن آپ کی مجلس میں یہ کہتے ہوئے سنا تھا کہ وہ آپ کا غلام ہے، چنانچہ اگر وہ اپنے قول میں صادق ہے تو غلام کی شہادت قابلِ قبول نہیں، کیونکہ بقول خود وہ غلام ہے اور اگر وہ اپنے قول میں جھوٹا ہے تو اس کی شہادت ایسی صورت میں بھی نا قابلِ قبول ہے، کیونکہ جب وہ آپ کی مجلس میں جھوٹ بولنے کی پروا نہیں کرتا تو مجلسِ قضا میں تو وہ جھوٹ کی بالکل پروا نہیں کرے گا۔

خلیفہ نے جب یہ کلام سنا تو قاضی ابویوسف رحمۃ اللہ علیہ کو معذور گردانا اور اس فیصلے پر ان کی تائید کی۔ (سنہرے فیصلے: عبدالمالک مجاہد)

آہ! مشفقہ وقار صاحبہ
بے ثبات ہے یہ زندگی......

نصرت رضی فلاحی، جیراجپوری

یہاں فنا ہے، بقا نہیں ہے — تمام ہونے کے ہے یہ مہلت
بقا تو زیبا ہے بس خدا کو ہے — بھگتنا پھر ہے جزا، سزا کو

موت زندگی کی سب سے بڑی سچائی اور سب سے اٹل حقیقت ہے، لذتوں کو فنا کر دینے والی، عیش وعشرت کو چھین لینے والی، عزیز و اقارب سے جدا کر دینے والی حیقت سے جانے کیوں مخلوق کا ہر ذی روح آنکھیں چرائے رہتا ہے اور زندگی؟

زندگی اپنی تمام تر تلخیوں اور کرواہٹوں کے باوجود بڑی شیریں لگتی ہے۔ زندگی میں انسان لاکھ دکھ جھیلے، مصیبتیں اٹھائیں، بھاگ دوڑ کی تھکن برداشت کرے لیکن موت کی آغوش میں پرسکون ہونے کے لیے کوئی بھی تیار نہیں ہوتا۔ کاش...... کاش...... کاش ہر انسان اس سچائی کو قبول کر لیتا، اس حقیقت کو تسلیم کر لیتا۔

آخر ایک دن جب اجل' زندگی کی آزادی، خوشیاں اور مہلت عمل کا پروانہ واپس لینے آجاتی ہے تو اس کے آگے سر جھکانے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں رہتا اور اپنی عزیز از جان ہستیوں کو یکے بعد دیگرے ہر انسان اجل کو سونپتا چلا جاتا ہے۔

ایسے ہی ۲۶ رفروری بروز جمعہ ۲۰۱۰ء کی وہ صبح، ایک خوشگوار صبح تھی۔ ہلکی ہلکی خنکی لیے ہوئے بساط کائنات پر پھیلا ہوا صبح کا منظر بھی بڑا دل فریب تھا۔ سب کچھ ویسا تھا جیسا کہ روز اس کائنات کا نظام چلتا ہے۔

بس میرے دل کے موسم پر کچھ انجانے وسوسوں اور خدشات کا پہرہ تھا، جس اداسیوں اور مایوسیوں کی کیفیت میں گھری میں جلے پاؤں کی بلی کی طرح ادھر ادھر پھر رہی تھی، سیل فون کی ہر بیل

پر دل پتے کی طرح لرز لرز جاتا تھا۔ آخر کار ان اداسیوں، بے چینیوں کے راز کا سرا ہاتھ آ ہی گیا۔

جب کانپتے ہاتھوں اور بے تحاشا پھڑکتے دل کے ساتھ سیل فون تھاما تو وہ روح فرسا خبر سرتاپا لرزا گئی کہ اب میری ماں جیسی ممتا لٹانے والی مشفقہ باجی اس بے ثبات زندگی کو ٹھوکر مار کر اجل سے ہم آغوش ہوگئیں۔ دل تڑپا، تھرایا، رویا حواس معطل ہوئے لیکن نظامِ کائنات جوں کا توں رہا، نہ زمین پھٹی نہ آسمان گرا۔

قدرت کو میری تڑپ پر رحم آیا تو پھر میرے حواس درست ہوئے۔ اپنے بکھرے وجود کو جیسے تیسے سمیٹ کر میں فوراً باجی کے آخری دیدار کے لیے الہ آباد سے بلریا گنج کے لیے روانہ ہوگئی۔

سفر کیسے کٹا یہ صرف اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو اپنے بندوں کا خالق و مالک ہے، تو محافظ بھی ہے اس نے مجھے باحفاظت بلریا گنج پہنچا دیا۔ اس وقت اضطراب و بے چینی کی جو کیفیت تھی میں لفظوں کا پیراہن دینے سے قاصر ہوں۔

میری اپنی ماں کے گزر جانے کے بعد انہوں نے کبھی ماں کی کمی کا احساس نہیں ہونے دیا۔ ہمیشہ ممتا بھری شفقت و محبت مجھ پر لٹاتی رہیں۔ اب ہر کوئی یہ سمجھ سکتا ہے کہ ایک ماں کی جدائی ایک بیٹی کے لیے کتنی سوہانِ روح ہوگی۔

ایک بار پھر میرا سایۂ عاطفت چھن گیا تھا، ایک بار پھر میں یتیم ہوگئی تھی، باجی کا جسدِ خاکی میرے سامنے تھا، ان کے پرنور و پرسکون چہرے پر میری نگاہیں ٹکی تھیں۔ ان کے دیدارِ آخری سے دل سیر ہی نہیں ہو رہا تھا اور دل اس حقیقت سے انکاری تھا۔ اس صورت حال کو قبول نہ کرنے کے لیے بضد تھا کہ وہ ہمارے درمیان اب نہیں رہیں۔

کاش وقت ٹھہر سکتا، کاش زندگی موت سے مستعار لی جاسکتی، کاش...... کاش دل لاحاصل تمناؤں کا گردان کرتا ہی رہا اور دیکھتے ہی دیکھتے عزیز و اقارب کی اشک بار آنکھوں اور دعاؤں کے ہجوم میں جسد خاکی کو سپرد خاک کر دیا گیا...... پھر............ پھر کیا باقی بچا............ صبر...... اور صرف صبر...... یا پھر ماضی کے چلمن سے جھانکتے ہوئے یادوں کے نقوش، فانی دنیا کے فانی ہنگامے، بے ثبات زندگی کے بے ہنگم شب و روز۔ پھر وہی مصروفیات اسکول...... اور گھر......

لیکن اسکول آکر مشفقہ باجی کی یادوں نے ایک بار پھر یلغار کر دی۔ یکے بعد دیگرے ہر ہر محلے پر، اسکول کے ہر چپے چپے سے آپ کا جھانکتا چہرہ...... آپ کی چلتی پھرتی یادیں............ اور ہی زیادہ بے چین کرنے لگی جیسے ان کا الوژن 'عکس' ہر وقت میرے ساتھ رہنے لگا۔

کبھی......لائبریری میں مصروف مطالعہ، کبھی اسٹاف میں ہم نشینوں سے محوگفتگو، کبھی اپنی جونیر پر شفقت لٹاتی ہوئی، تو کبھی طالبات کو پندونصائح کرتی ہوئی لیکن افسوس کہ موت نے ہم سے سب کچھ چھین لیا تھا............کل نفس ذائقۃ الموت کے آگے ہم مجبور و بے بس بنے، صرف یادوں سے دل کو تسلی دیتے ہیں۔

آہ..........مشفقہ باجی..........ہم آپ کی کون کون سی صفات اور کون کون سی خوبیاں دہرائیں، آپ میں کیا نہیں تھا؟

تواضع وسادگی تو آپ کی زندگی کا روشن پہلو تھا۔ گھر سے باہر، مدرسہ، ہر جگہ آپ سادگی و خاکساری کی مرقع تھیں۔ فی زمانہ جیسے سادگی آپ پر تمام ہوتی نظر آتی تھیں۔

نظم وضبط کی بات آتی ہے تو آپ اس میں بھی بے مثال نظر آتی ہیں۔ عرصہ دراز تک آپ نے کلیۃ البنات کی صدارت کی۔ اس دور میں جو بھی رہا ہوگا اس نے آپ کے بے مثال نظم وضبط کا تجربہ کیا ہوگا۔ جذبۂ ایثار آپ میں کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ آپ اپنے ہم عصروں، ماتحتوں اور ملنے جلنے والوں میں مقبول تھیں۔

رہی کفایت وشعاری تو ہر وقت آپ کے ساتھ رہنے کے باوجود بھی کوئی آپ جیسی کفایت شعاری نہ سیکھ سکا۔ جبکہ آپ کا یہ قول سنہری حرفوں میں لکھنے جانے کے قابل ہے کہ ’’اگر انسان کفایت شعاری سیکھ لے تو کبھی پریشان نہ رہے۔‘‘

تخلیقی صلاحیت بھی آپ میں بدرجۂ اتم موجود تھی..........آپ کا بچوں کے لیے ایک شعری مجموعہ ’’ندائے سحر‘‘ ہے، ندائے سحر ۲۰۰۹ء میں منظر عام پر آچکا ہے۔ بچوں ہی کے لیے آپ کا قسط وار ناول ’’ٹارزن‘‘ اچھا ساتھی کی زینت بن چکا ہے اور آپ کے اکثر مضامین حجاب کی بھی زینت بنتے رہے ہیں۔

لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ اکثر ناسازی طبع کے باعث آپ کم لکھ پاتی تھیں۔

ان کا یہ احسان میرے ساتھ عمر بھر رہے گا کہ انہوں نے میرے اندر بھی تخلیقی صلاحیتوں کو ڈھونڈا اور اسے ابھارا۔ مجھ میں لکھنے کی اسپرٹ پیدا کی۔ شاید انہیں کی دین ہے کہ میں آج کچھ کر سکنے کی قابل ہوں۔ ’’ضوفگن‘‘ میں ایک مستقل کالم ’طب نبویؐ‘ کے نام سے میں لکھتی ہوں۔ یہ انہیں کا تعاون ہے۔

اب ان کے لیے میں یا ان کا ہر خیر خواہ بس دعا ہی کر سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں کروٹ کروٹ جوار رحمت میں جگہ دے۔ ان کی مغفرت کرتے ہوئے انہیں جنت عالی مرحمت فرمائے۔ آمین☆

اپنی مشفق معلّمہ مشفقہ وقار صاحبہ کے انتقال پر ملال پر

آسیہ فلاحی☆

جو بھی اس بزم میں آیا ہے اسے فوت بھی ہے
کل نفس سے ملا ذائقۃ الموت بھی ہے

اس حقیقت پہ حقیقت کا گماں ہو کیسے
غم جو سینے میں ہے وہ درد نہاں ہو کیسے

تیرے اوصاف حمیدہ کا بیاں ہو کیسے
تیرے اخلاق پہ باطل کا گماں ہو کیسے

مرأۃ صالحہ واللہ تیرا پیکر تھا
یوں تو ہر لمحہ گہر بار تیرا جوہر تھا

تیرے دم سے ملی قرأت کی حلاوت ہم کو
تیری تحریروں نے بخشی ہے ذکاوت ہم کو

ہم نے پائی تھی کیا شفقت تیری تذکیروں سے
آبلہ پائی کی لذت تیری تدبیروں سے

بزم انجم میں تیری ذات مہر تاباں تھی
تیرے انداز تعاطف پہ میں بھی نازاں تھی

ہائے یہ گردش ایام نے ڈھایا کیا ستم
سب تو زخمی ہیں رکھے کون کسی پر مرہم

ہم دعا گو ہیں کہ تیرا مقام ہو اعلیٰ
ام رفعت کی قدر تیری طرح ہو بالا

☆ ہیڈ معلّمہ شعبۂ اعلیٰ نسواں، جامعۃ الفلاح، اعظم گڑھ

کس کی کھلے گی پھر زباں......محترمہ شبنم خانم صاحبہ

آسیہ فلاحی

نام

محترم شبنم خانم صاحبہ معلّمہ کلیۃ البنات۔ ضلع مئو کے ایک قصبہ حمید پور کی رہنے والی تھیں، آپ کے والد ماجد کا نام محمد سمیع خاں تھا۔

ولادت

۱۹۵۴ء میں آپ کی ولادت ہوئی، آپ کے والد محترم ریلوے آفیسر تھے۔ آپ اپنی والدہ اور بھائی بہنوں کے ہمراہ والد محترم کے ساتھ ہی رہتی تھیں۔ جہاں بھی والد محترم کی پوسٹنگ ہوتی آپ ان کے ہمراہ رہتیں۔ اس طرح سے آپ کے اپنے گاؤں میں قیام کی مدت بہت مختصر رہی۔ آپ کی شادی سگڑی کے قریب واقع ضلع اعظم گڑھ کے ایک گاؤں علی پور میں ہوئی۔ آپ ذکی الفہم، حساس اور وفا شعار خاتون تھیں۔

پسماندگان میں شوہر اور چار بیٹے ہیں۔ محمد آصف فلاحی، محمد عاطف فلاحی، محمد عامر اور محمد عاصم ہیں جن میں محمد آصف فلاحی زیادہ معروف ہیں۔

علمی قابلیت و صلاحیت

آپ نے ندوہ سرائے انٹر کالج سے ہائی اسکول اور انٹر پاس کیا جو آپ کے گاؤں سے دو کلومیٹر کے فاصلہ پر واقع تھا جس کی وجہ سے آپ کو روزانہ چار یا پانچ کلومیٹر چلنا پڑتا تھا چونکہ قریب میں کوئی ڈگری کالج نہیں تھا اس لیے گریجویشن شبلی کالج سے کیا۔ آپ نے شبلی کالج سے بی اے اور بی ایڈ کیا۔

ٹیچنگ آپ کا جذبہ تھا اس کے لیے بہت سے کالجز سے پیشکش بھی ہوئی لیکن آپ نے مدرسہ کلیۃ البنات کو ترجیح دی۔ صرف اس وجہ سے کہ آپ یہاں حجاب کے ساتھ تعلیم دے سکتی تھیں

اور آپ کے اندر خدمت خلق کا جذبہ تھا۔

تاریخ تقرری

۲۸ رجنوری ۱۹۷۸ء کو کلیۃ البنات میں بحیثیت انگلش و ہندی کی معلّمہ آپ کا تقرر ہوا۔

تدریس

آپ صف اول کی معلمات میں سے ہیں جنھوں نے گاؤں کے ماحول میں طالبات کو علم کی روشنی سے آراستہ کیا چونکہ یہ زمانہ مدرسہ کلیۃ البنات کے آغاز کا زمانہ تھا اور گاؤں کے ماحول میں نظم وضبط اور صفائی وستھرائی کی عمدہ کیفیت سے ناواقفیت تھی ایسی صورت حال میں آپ نے طالبات کو صفائی ستھرائی، عمدہ ذوق تعلیم سے آراستہ کیا۔

ہیڈ معلّمہ کے ساتھ ساتھ خود بھی انتہائی محنت کر کے طالبات کو نظم وضبط کا پابند بنایا۔ آپ خود بھی نظم وضبط کی انتہائی پابند معلّمہ تھیں مجھے کبھی یاد نہیں آپ نے کبھی تذکیر و ترانہ میں تاخیر کی ہو۔

آپ ہندی پڑھاتیں تو ایسا محسوس ہوتا کہ شاید آپ سے بڑھ کر ہندی جاننے والا کوئی نہیں ہے۔ اسی طرح انگلش پڑھانے میں بھی انتہائی محنت و لگن کے ساتھ طالبات کو مطمئن کر دیتیں۔

آپ نے انگلش کا ایک Lesson 'انڈین ویورس' پڑھانے کے ذریعہ انسانی زندگی کے تمام ادوار کو اپنے دلنشیں انداز سے طالبات کے ذہن نشین کرا دیا۔ سبق کا زندگی سے تطابق آپ کا سلیقہ تدریس تھا۔ خود مطالعہ کرتیں اور طالبات کو مطالعہ کا عادی بناتیں، اس طرح طالبات کے اندر علمی ذوق پروان چڑھتا رہا۔ ہندی و انگلش کے علاوہ آپ امور خانہ داری میں مہارت رکھتی تھیں اور طالبات کو بھی ماہر بناتیں۔

آپ نے ہوم سائنس کے پیریڈ کے ذریعہ اپنی طالبات کو لڑکیوں کے لباس کے علاوہ قمیص، شلوار، پینٹ، شرٹ بھی سلنے کا ڈھنگ سکھایا تمام مروجہ ہنر امور خانہ میں مہارت رکھتیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی طالبات اپنی خانگی زندگی میں کامیاب نظر آتی ہیں کیونکہ روحانی ماؤں کی بھی خدمات بہت اثر رکھتی ہیں۔

اصلاح معاشرہ

گرچہ آپ کسی دینی مدرسہ سے فارغ التحصیل نہیں تھیں لیکن اپنی طالبات کو درس کے اختتام پر عمدہ اور کارآمد نصیحتیں کرتیں۔ ایک دفعہ کلاس میں آپ نے اپنی طالبات سے بطور نصیحت ذکر کیا کہ:

''بھلائیاں اور اچھائیاں کرتی رہو مقابل سے اس کے بدلے کے انتظار میں مت رہو۔اللہ تعالیٰ اس کا بدلہ عطا فرمائے گا۔ گاؤں کے اندر ہونے والے ہفتہ واری پروگرام میں شریک ہوتیں۔

صفائی ستھرائی و سلیقہ

آپ کی ذات صفائی وستھرائی اور سلیقہ کا مرقع تھی، کبھی کسی بوسیدہ اور پرانی اشیاء کو بھی مسترد نہیں کرتیں اور ایک چیز سے دوسری کارآمد شے کو بنانے کا ہنر رکھتی تھیں اور اس کو نعمت سمجھتی تھیں فضول خرچی سے پرہیز کرتیں اور انتہائی سادہ زندگی بسر کرتیں اور سادگی کی تلقین کرتی تھیں۔

عادات و اخلاق

عادات ومعمولات میں شریعت کی پابندی کا لحاظ تھا۔آپ زیادہ دنوں تک میرے محلے ہی میں قیام پذیر تھیں۔ محلے اور گاؤں کے لوگ آپ کے اخلاق کو پسند فرماتے اور آپ کی تعریف کرتے تھے، سلائی اور بنائی سیکھنے کے لیے طالبات کے علاوہ دیگر خواتین بھی آپ کے پاس تشریف لے جاتیں اور آپ ان کی مشکلوں کو حل فرماتی تھیں۔

آپ کا اخلاق ہی تھا کہ قصبہ بلریا گنج کے تقریباً تمام ہی لوگ آپ کا احترام کرتے اور آپ سے میل جول رکھتے تھے۔اور یہی وجہ تھی کہ جب آپ کے انتقال کی خبر ملی تو جاننے والی تمام طالبات اور معلمات اور گاؤں کی خواتین آپ کے گاؤں علی پور میں امنڈ پڑیں اور آپ کے لیے دعائے مغفرت کی۔

آپ کی وفات ۱۵/اکتوبر ۲۰۰۲ء کو گورکھپور میں ہوئی اور ۱۶/اکتوبر ۲۰۰۲ء علی پور میں آپ کی تدفین ہوئی۔ اللہ تعالیٰ آپ کی بشری کمزوریوں سے درگزر فرمائے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔آمین

☆☆☆

فوزیہ خانم فلاحی

شائستہ خانم فلاحی☆

فوزیہ خانم سرائے میر ضلع اعظم گڑھ میں پیدا ہوئیں۔ یہ مولانا ابوالولیس اصلاحی بن جناب مولانا ابوبکر اصلاحی صاحب کی صاحبزادی تھیں۔

آپ کی ابتدائی تعلیم نہال موضع پرسہا قیام الدین پٹی مکتب پنجم مع قرآن ختم ہوئی اور اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے اعظم گڑھ کے مشہور قصبہ بلریا گنج جامعۃ الفلاح میں قیام پذیر ہوئیں اور یہیں سے عالمیت وفضیلت کی تعلیم حاصل کی۔ تعلیم سے فطری لگاؤ نے تدریسی خدمت انجام دینے پر مجبور کر دیا۔ چنانچہ فراغت کے بعد کچھ عرصہ تک جامعۃ الفلاح میں تعلیمی فریضہ انجام دیتی رہیں۔

لیکن پھر طبیعت کی ناسازی کے بنا پر سرائے میر میں ان کا قیام رہا اور پھر علاج کے لیے ان کو دہلی جانا پڑا۔

اپنی علالت کے دوران انہوں نے چند مضامین بھی لکھے جو سرائے میر کے ہفتہ وار نکلنے والے ایک اخبار الجہاد فی الاسلام میں شائع بھی ہوا۔

باوجود تلاشِ بسیار اخبار کی فائل نہ ملنے کی وجہ سے ان مضامین کے عنوانات وموضوعات نہ مل سکے۔

طبیعتاً ملنسار، نرم گو، سلیقہ شعار اور صوم وصلاۃ کی پابند تھیں۔

☆☆☆

☆سرائے میر، اعظم گڑھ

الجامعۃ الاسلامیہ تلکھنا

شیوپتی نگر، سدھارتھ نگر، یوپی۔ پن کوڈ: ۲۷۲۲۰۶

الجامعۃ الاسلامیہ تلکھنا شمال مشرقی یوپی کا ایک معروف تحریکی واقامتی ادارہ ہے۔ جس کا قیام ۱۹۳۲ء میں عمل میں آیا۔ یہ ادارہ یوپی میں نیپال کی سرحد سے متصل ایک پرسکون مقام پر واقع ہے، اس علاقے کے باشندے تعلیمی ومعاشی اعتبار سے پسماندہ ہیں اور ان کے معاش کا تمام تر دارومدار کھیتی باڑی اور محنت ومزدوری پر ہے۔

تعلیم وتربیت کے میدان میں طویل مدت سے اس ادارے کی خدمات جاری ہیں۔ اس وقت اس کے چشمۂ صافی سے ایک ہزار سے زائد طلبہ سیراب ہورہے ہیں اور اس کے فارغین کی بڑی تعداد مختلف شعبہائے حیات خصوصاً دعوت وتبلیغ اور اقامت دین کے میدان میں سرگرم عمل ہے۔

بہترین تدریس، پرسکون ماحول اور روشن مستقبل اس ادارے کا طرۂ امتیاز ہے۔

شعبہ جات:

☆ پرائمری (اطفال تا پنجم) ☆ جونیر (ششم تا ہشتم)

☆ عالمیت (عربی اول تا عربی پنجم) ☆ حفظ وتجوید (اردو ہندی وانگریزی کے ساتھ)

☆ اسٹڈی سنٹر این آئی او ایس (ہائی اسکول وانٹر) ☆ جامعہ اردو علی گڑھ (ادیب تا معلم)

☆ منی آئی ٹی آئی (کمپیوٹر، الکٹریشین وبلڈنگ) ☆ یوٹی سی لکھنؤ

صبغۃ اللہ عمر فلاحی
منیجر
09320888500

اظہر الدین فلاحی
پرنسپل
09565221704

مراسلت کا پتہ

AL-JAMIATUL ISLAMIA

Tilkahna, Shivpat Nagar, Siddharth Nagar

Mob: 9452833231, 9919388788

A/c 60109803838 / IFSC MAHB0001405

اللہ سے کرے دور تو تعلیم بھی فتنہ
اولاد بھی، املاک بھی، جاگیر بھی فتنہ ؟
ناحق کے لیے اٹھے تو شمشیر بھی فتنہ
شمشیر ہی کیا، نعرۂ تکبیر بھی فتنہ
(اقبالؒ)

اسلامی مدارس، دینی مکاتب، سرکاری اسکولس،
CBSE کورس کی جملہ کتب اور اسٹیشنری کے علاوہ
اسلامی لٹریچر کا ایک بڑا مرکز

کرن بک ڈپو

جی۔ بی۔ روڈ، گیا- 823001، بہار

☆ چلڈرن بکس شائع کرنے والے معیاری پبلشرز کی ایجنسی
☆ ریٹیل، ہول سیل کے ساتھ سپلائی کا معقول نظم

KIRAN BOOK DEPOT

G.B. ROAD, GAYA - 823001 (BIHAR)

Mob: 9431476442, TEL: (R) 0631-2423916 (O) 0631-2430863

پروپرائٹر: **آفاق منظر ندوی**